

**PAGES MISSING  
WITHIN THE  
BOOK ONLY**

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_222946**

UNIVERSAL  
LIBRARY







# ہندوستانی کھیل

مصنفہ الطاف علی صاحب، نگران تربیت جسمانی، جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھالیں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو ان بچوں میں ملتی ہو جنہیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ۴ سے ۷ کر ۶ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کر سکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک و ملت کے لئے سرمایہ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس پر اعتماد کیا جائے گا۔ مصنف نے انہیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں درج کئے ہیں جن مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ملکت جامعہ  
دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بیٹن

# جامعہ

زیرِ ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۴ نمبر (۱) بابۃ ماہ جنوری ۱۹۴۱ء | چند نہ ضرر فی پرتہ

## فہرست مضامین

- ۱۔ اسلامی ہندی تمدن ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب تعلیمی ایم۔ اے پی ایچ ڈی ۱
- ۲۔ مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری اخلاق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) ۱۴
- ۳۔ تعلیم میں سیر کی اہمیت سید احمد علی صاحب نگرال تعلیمی مرکز ۳۲
- ۴۔ کسان (غنائی ڈرامہ) محمد عبدالقیوم صاحب باقی ایم۔ اے ۳۵
- ۵۔ امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر محمد ابواللیث صاحب صابقی ایم۔ اے (علیگ) ۶۰
- ۶۔ نفوس (افسانہ) سید علی عباس صاحب حسینی ایم۔ اے ۶۲
- ۷۔ غنزل فراق صاحب گورکھپوری ۷۵
- ۸۔ انجی اصلاح (مسلمان اور تجارت) محمد منصور صاحب بی کام (فائل) ۷۷
- ۹۔ تنقید و تبصرہ آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے ۸۳
- ۱۰۔ شریطے بول (م۔ س) ۱
- ۱۱۔ آفتاب الاندلس (ع۔ ح) ۲
- ۱۲۔ طلسم علی ۳
- ۱۳۔ سیرت شہید کربلا جلد دوم ۴
- ۱۰۔ رفتار عالم (م۔ م) ۹۵

پرنٹر و پبلشر: پروفیسر محمد مجیب بی اے (اکن)، محبوب المطابع دہلی

## اُردو کی لائبریری

آپ بھی اپنی تیار کر سکتے ہیں طریقہ بہت آسان ہے  
صرف اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال میں  
آپ کی بہترین اُردو کی کتابوں کی لائبریری تیار ہو جائے گی  
اکادمی کے قواعد و ضوابط ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

# جامعہ

زیر ادا رت :- نور الحسن ہاشمی ایم :- اے

جلد ۳ نمبر ۲ || بابتہ ماہ فروری ۱۹۴۱ء || چند لاصحہ فی چرچہ آئینہ

## فہرست مضامین

- ۱- سائنس اور مذہب مقبول الرحمن صاحب بی۔ اے (آنزر) ۱۱۱
- ۲- مولانا عبدالحی کی تنقید نگاری اخلاق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ) ۱۱۸
- ۳- جان ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر ضیاء الدین احمد صاحب الدہ آبادی ۱۲۴
- ۴- آقبال کا ذہنی ارتقار اسلوب احمد صاحب انصاری ۱۳۴
- ۵- انقلاب روس کا تاریخی پس منظر مرزا اشفاق بیگ صاحب بی۔ اے ۱۶۴
- ۶- امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر ابواللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ) ۱۷۴
- ۷- جام صہبائی اثر صہبائی
- ۸- انتخاب غزلیات فراق گورکھپوری - عظیم حیدر آبادی
- ۹- تنقید و تبصرہ۔

— براہ کرم —

اس صفحہ کی پشت پر رسالہ سے متعلق ایک ضروری نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔ ”منیجر“

پرنٹر و پبلشر بریڈفیسر محمد مجیب بی۔ اے (اکس) محبوب المطالع دہلی

## ضروری اطلاع

رسالہ جامعہ کی روحانی کے متعلق چند اہم گذارشیں درج ذیل ہیں :-

۱۔ رسالہ جامعہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے جو تمام خریداروں کو تاریخ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ براہ کرم ۵۰ تک خط لکھ کر دفتر سے دوبارہ منگالیں۔ ۵۰ تاریخ کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اس ماہ سے تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری ہر رسالہ پر پتے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ براہ کرم اسے کسی یادداشت میں نوٹ فرمالیجئے۔

۳۔ آئندہ ماہ تمام خریداروں کے پتے مع نمبر خریداری چھپ جائیں گے جو صاحب پتوں میں کچھ تبدیلی کرنا چاہیں زحمت فرما کر ۵۰ فرودی تک دفتر کو اطلاع دے دیں خط میں نئے نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیا جائے ورنہ پتے میں رد و بدل کرنے میں ہمیں غیر معمولی دشواری ہوگی۔

۴۔ خطوط اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ہمیشہ تحریر فرمائیے جو خط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے ان کی تکمیل سے دفتر قطعاً معذور ہوگا جس سے غالباً آپ کو بھی شکایت ہوگی اور ہمیں بھی رنج ہوگا۔

منہجر رسالہ جامعہ، دہلی

## مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی۔ مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگاکر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

# جامعہ

زیرِ ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۴ نمبر ۴ | بابۃ ماہ اپریل ۱۹۴۱ء | چند سالانہ صفحہ فی پرچہ

## فہرست مضامین

- |                            |   |
|----------------------------|---|
| ۱۔ ہماری تعلیم کے دورِ رخ  | ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ۲۶۷ |
| ۲۔ تاریخ کا ادبی نظریہ     | علی امام صاحب ایم۔ اے ۲۶۸                   |
| ۳۔ فنی پریم چند            | محمد اسماعیل خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ۲۸۶    |
| ۴۔ بامقصد تعلیم کا نظریہ   | ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی ۳۰۷          |
| ۵۔ حکومتوں کا پردہ پگینڈہ  | محب الحسن خاں صاحب بی۔ اے آئرز (لندن) ۳۱۴   |
| ۶۔ نثر اردو کی تدریجی ترقی | محمد عرفان خاں صاحب ندوی بی۔ اے (جامعہ) ۳۲۲ |
| ۷۔ آج کی دنیا (نظم)        | فراق صاحب گورکھپوری ۳۴۱                     |
| ۸۔ تنقید و تبصرہ           | ۳۴۲   |

پرنٹر ڈیل بشپر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)، محبوب المطابع دہلی

## ضروری اطلاع

(۱) رسالہ جامعہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے جو تمام خریداروں کے پاس بے تاریخ تک ضرور پہنچ جاتا ہے جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ براہ کرم ۵ ازمک خط لکھ کر دوبارہ دفتر سے منگالیں۔ ۵ ازمک تاریخ کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جائے گا۔

(۲) تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری ہر سالے پر پتے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ براہ کرم اسے کسی یادداشت میں نوٹ فرمائیے۔

(۳) خطوط و منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر مع نام و پتہ ہمیشہ تحریر فرمایا کیجئے جو خطوط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے ان کی تعمیل سے دفتر قطعاً معذور ہوگا جس سے غالباً آپ کو بھی شکایت ہوگی اور ہمیں بھی رنج ہوگا۔

نیمبر رسالہ جامعہ ، دہلی

# جامعہ

زیر ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۴ - نمبر ۵ | بابۃ ماہی ۱۴۱۹ھ | چند کلام فی ترجمہ

## فہرست مضامین

- ۱۔ طلبہ کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب سید احمد علی صاحب نگران تعلیمی مرکز ۳۴۵
- ۲۔ منشی پریم چند محمد اسماعیل خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ۳۵۵
- ۳۔ لکھنویت کیا ہے؟ ابواللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ) ۳۶۷
- ۴۔ نثر اردو کی تدریجی ترقی محمد عرفان خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) ۳۷۷
- ۵۔ اُستانی (افسانہ) مترجمہ ملک حامد حسین صاحب ۳۹۹
- ۶۔ جامِ صباغی اثر صاحب صباغی ۴۱۶
- ۷۔ بکھری ہوئی پتیاں سلام صاحب پھلی شہری ۴۱۷
- ۸۔ آخری نصیحت فضل حسین صاحب کیف ۴۱۸
- ۹۔ تنقید و تبصرہ ۴۱۹
- ۱۔ بیک انگلش
- ۲۔ حسین اور انقلاب
- ۳۔ چمنستان



## مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں  
آپ کو اپنی پسند کی بہت سی کتابیں نظر آئیں گی۔  
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی  
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں  
ارباب ذوق نیز نئی فہرست منظر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ ہنسی دہلی

# جامعہ

زیرِ ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۴ :- نمبر ۶ | بابۃ ماہ جون ۱۹۴۱ء | سالانہ فی چار حصے

## فہرست مضامین

- ۱۔ استاد اور اس کے مسائل عبد الغفور صاحب ایم۔ اے ۴۲۳
- ۲۔ کیا علامہقبال کارل آکس کے خیال تھے؟ م۔ م جوہر صاحب میرٹھی ۴۴۰
- ۳۔ تعلیم اور تعلقات باہمی محمد علی صاحب مدرسی ۴۴۹
- ۴۔ عرب کی معاشی حالت اور پیغمبر صلعم محمد یونس الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) ۴۵۲
- ۵۔ والتیر ریاض الاسلام صاحب بی اے ۴۶۰
- ۶۔ جان ڈیوی کا نظریہ جمہوریت ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی ۴۷۵
- ۷۔ بھیسہ (ڈرامہ) مترجمہ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے ۴۷۹
- ۸۔ بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس وقار عظیم صاحب ایم۔ اے ۴۹۰

(پرنٹر و پبلشر: رفیع محمد مجیب بی اے (اکسن)، محبوب المطالع دہلی)

## مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے، اس فہرست میں آپ کو  
اپنے پسند کی بہت سی کتابیں نظر آئیں گی مطبوعات جامعہ  
کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتابیں بھی مختلف عنوانات  
کے ماتحت درج کی گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہی فہرست  
منگاکر ملاحظہ فرمائیں:-

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

# اسلامی ہندی تمدن

(گزشتہ سے پیوستہ)

اسلامی ہندی تمدن کے خط و خال واضح کرنے کے لئے آخر میں ہم اس کا مقابلہ صرف ایک اور تمدنی تحریک سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہمارے اہل وطن ہندوؤں کی قومی تمدنی تحریک ہے۔ اس وقت ہم ہندوؤں کی تمام تحریکات کی طرف اشارہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف ایک دو ان تحریکات کی طرف اشارہ کریں گے۔ جنہوں نے ہندو قوم کے ذہن کو واقعتاً بہت متاثر کیا ہے۔ ایک تو وہ تحریک ہے جو آج سے ہزار ہا برس کے ہندو مذہب اور تمدن کا بھینہ اسیا کرنا چاہتی ہے۔ اس کی حامل ہندو مہاسما آریہ سماج جیسی جماعتیں ہیں ہندو جماعت کی تشکیل ذات پات پر مبنی ہے جو جمہوریت کے سخت خلاف ہے۔ نظر ہر ہے کہ ہندوؤں کی یہ تحریکیں ہندوؤں کو ایک ایسے زمانہ کی طرف لپکا چاہتی ہیں جن کا بڑھتے ہوئے جمہوریت کے زمانہ میں کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا۔ اگر ان تحریکات کا ہندوؤں پر واقعتاً اثر ہو جائے تو ہندو بحیثیت قوم و ملک اور انسانیت کی راہ میں صرف ایک سنگ رافنا بنت ہوں گے۔ اس قسم کی تحریکات سے اسلامی ہندی تمدن کا میل تو کجا کسی قسم کا تعاون بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان تحریکات میں باہم تصادم ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ان دو قیامی تحریکات کے بالکل خلاف ہندوؤں میں اشتراکیت کی تحریک ہے جس کے سب سے مشہور رہنما پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ اشتراکیت ہندوؤں کی نہ صرف ذات پات کو ختم کر دینا ہے بلکہ ان کے رسم و رواج اور ان کی قبرس کی تاریخی روایات کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت کا فروغ ہندو تمدن کی فطری موت کے مترادف ہے۔ ہندو قوم کا مذہبی محدود تصور نہ ان کا سماجی ڈھانچہ اور نہ ان کی تاریخی روایا اس بات کی کفیل ہو سکتی ہیں کہ وہ ایک اجتماعی، معاشی انقلاب کی حامل ہو سکیں۔ اشتراکیت کی ترقی کے ساتھ ہندو تمدن چاہے نام میں باقی رہے لیکن وہ عملاً ختم ہو جائے گا۔ اسلامی تمدن کی ماہیت نہ سمجھنے کے باعث اشتراکیت اسلام کی بھی اسی طرح مخالفت شروع کر دیتے ہیں جس طرح ان کی تعلیمات کے بڑھانے کیلئے

انہیں ہندو مت کی مخالفت کرنا پڑتی ہے جس کا تمام نظام سرمایہ داری اور ذات و پات کے بندھنوں پر استوار ہے۔ اس قسم کی سلطنت سے وہ مسلم عوام کو بھڑکا دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنے معاشی انقلاب کے کام میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اشتراکین کے ساتھ معاشی انقلاب پیدا کرنے کے لئے تعاون کی راہ میں اسلامی تمدن حامل نہیں ہوتا لیکن ہمیں ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے کہ معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں وہ الحاد و دہریت کا زہریلا مسلمانوں میں سرایت کرنے کی کوشش نہ کریں مسلمانوں کو یہاں اپنے تمدن کی بقا کی پوری کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اشتراکیت صرف ایک معاشی حل ہی نہیں ہے بلکہ ایک مکمل تصور زندگی ہے جو مادیت و الحاد پر مبنی ہے اور جس کو جبر سے رائج کرنا اشتراکین کے نزدیک بالکل جائز ہے

عمد جدید میں ہندوؤں کی سب سے زبردست قومی و تمدنی تحریک وہ ہے جس کی رہنمائی مہاتما گاندھی کر رہے ہیں یہ ہندو مت کی ایک زبردست اصلاحی تحریک ہے۔ روحانیت اور اخلاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلامی ہندی تمدن سے یہ تحریک جہاں تک اس پہلو کا تعلق ہے بہت قریب ہے۔ مسلمانوں کی بھی کوئی تحریک جب تک کہ وہ روحانی اور اخلاقی نہ ہو تحریک اسلام نہیں کہی جاسکتی ملک کی آزادی بغیر فرقہ قوم و ملت ایک مشترکہ حکومت کا قیام اس کا مقصد ہے جس میں تمام اہل ہند کے ساتھ انصاف و درواداری برقی جائے مسلمان ان امور میں بھی اس تحریک کے حاملین کے ساتھ پورا پورا اتحاد کر سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ اس تحریک میں مہاتما گاندھی دیہاتوں کے سدھار پر بہت زور دے رہے ہیں مسلمانوں کو اس سے بھی مکمل اتفاق کرنا چاہئے۔ اور چونکہ یہ عوام الناس کی خدمت ہے اس لئے ان کی عین روایات کے مطابق ہے۔ ساوگی ضبط نفس اور ایثار پر اس تحریک کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اور خلفاء راشدین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کون مسلمان ان اخلاقی خوبیوں کے پیدا کرنے پر زور نہ دے گا۔

بہت سے امور میں اتفاق کرتے ہوئے بھی اس تحریک کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جو اسلامی ہندی تمدن کے منافی ہیں۔ مثلاً یہ تحریک ہندوؤں کی قدیم ہزاروں برس کی پرانی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتی ہے۔

گو کہ اس میں بعض اصلاحات بھی کرنا چاہتی ہے اس قسم کی رجعت پسندی نہ مفید ہے نہ ممکن۔ تہذیب و تمدن اپنی بہترین بنیادوں پر آگے بڑھنے کا نام ہے پیچھے ہٹنے کا نہیں۔ باوجود ادائیگی کے یہ تحریک اس قدر جمہوری نہیں ہے جس قدر کہ حالات کا تقاضا ہے کیونکہ یہ ہندو سماج کی بنیادوں کو بدستور باقی رکھنا چاہتی ہے جو ذات پات کے تصور پر مبنی ہے۔ علمائے ہر مکتبوں کو ہندوؤں میں ملانے کی کوشش کر رہی ہے اور انھیں حقوق بھی دے رہی ہے لیکن یہ کوشش کس حد تک بار آورہوں گی یا ہوں گی بھی یا نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ کروڑوں انسانوں کو ذلت و کجکبت سے صرف ایک زبردست انقلاب کے ذریعہ آزاد کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی اصلاحات سے شاید ہی کوئی دیر پا نتیجہ مرتب ہو۔ اسلام اس کے مقابلے میں اس مسئلہ... کے لئے ایک زبردست انقلابی پروگرام پیش کرتا ہے جو جمہوریت اور مساوات کی روح کا حامل ہے۔ گاندھی جی کو ہندوستان کی غربت کا بڑا احساس ہے اور انھوں نے اپنی زندگی اور جذبہ جد سے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ کسی بھی ہندوستانی نے سینکڑوں برس میں نہیں کیا ہے لیکن وہ اس مسئلہ کا حل صرف ایک نفسی انقلاب کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔ بے شک ہر انقلاب کے لئے نفس انسانی میں تبدیلی کی ضرورت ہے لیکن خارجی طور پر انقلاب اس وقت تک موثر اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایک قانونی اجتماعی شکل اختیار نہ کر لے۔ گاندھی جی کے پاس اس قسم کا کوئی منظم معاشی پروگرام نہیں ہے جس کی بنیادیں ایک اجتماعی قانونی نظام کے ذریعہ استوار کی جاسکیں۔ اسلامی تمدنی روح کا تقاضا ہے نہ صرف نفوس انسانی میں غیروں کے لئے احساس پیدا کر دیا جائے بلکہ ایک اس قسم کا اجتماعی قانونی نظام بھی بنا دیا جائے کہ اس میں سرمایہ داری کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ دو صاف صاف دولت کے سرچشموں کو عوام الناس کے قبضہ میں حکومت کے ذریعہ دیدینا چاہتا ہے۔ اگر یہ انقلاب پورے اعلیٰ سے ہو سکتا ہے تو بہت اچھا ورنہ کم از کم طاقت کے استعمال کو اس کے حصول کے لئے گناہ نہیں سمجھتا بلکہ اخلاقی طور پر جب کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے اسے سختن قرار دیتا ہے۔

انہا گاندھی جی کی تعلیمات کی جان ہے وہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کام کیلئے طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتے ان کے نزدیک طاقت کا استعمال ہر حالت میں جبر ہے اور

جبر لازم کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح جبر کا کبھی خاتمہ ہی نہیں ہونے پاتا۔ اسلامی تصور اس میں ان سے کلیتاً متفق نہیں ہے۔ تشدد اور طاقت کو اسلام بھی برا سمجھتا ہے ایک ایسا نظام جماعت جس میں ظلم و جبر بدل نہ ہو اسلام کا نصب العین ہے لیکن وہ فطرت انسانی سے جو ملکوتی انسانی ہونے کے علاوہ حیوانی بھی ہے چشم پوشی نہیں کرنا چاہتا اور اجتماعی برائی کو دور کرنے کے لئے کم از کم طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کلیتاً طاقت کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیا جائے گا تو پھر انسان کی فطرت حیوانی اس قدر عود کر آئے گی کہ جماعت کو یہ موقع ہی نہ مل سکے گا کہ وہ اپنے انسانی اور ملکوتی عناصر کی نشوونما کر سکے۔ بہر صورت اس نصب العین کی طرف اسلام ضرور رہنمائی کرتا ہے اور وہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینے کو اچھا سمجھتا ہے اور اسے احسان سے تعبیر کرتا ہے۔ انفرادی اعمال میں تو وہ یقیناً صفو و احسان کو انتظام اور سزا پر ترجیح دیتا ہے لیکن وہ ایک قانونی حکومت کا قیام طاقت ہی کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے تاکہ بہتیت و جہالت کسی قسم کے خطرہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

اسلامی ہندی تمدن کے عناصر کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم نے اس کا دنیا کے چند مشہور ترین تمدنی تصور سے اس لئے مقابلہ کیا ہے کہ اس کے خط وخال اس تقابل کے باعث کلیتاً واضح ہو جائیں۔ ہم اب اس تصور کا ایک صحیح تصور اپنے پیش نظر رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی صرف اس کی ماہیت کا ہی جاننا کافی نہیں ہے بلکہ اُن عظیم انشان تاریخی اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو اس تمدن نے ہندوستان کی زندگی پر مرتب کئے ہیں۔ اس کی بنیادی توحید کی تعلیم نے ہندوؤں میں توحید کی ایک زبردست تحریک شروع کر دی جس نے کہیں تو مبلغی تحریک کا رنگ اختیار کیا، کہیں وہ آریہ سماج، سکھ پنت اور بہو سماج کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ پھر جہاں علیحدہ تحریکیں شروع نہ ہوئیں وہاں خود ہندو ذہن توحید کے قریب آنے لگا۔ توحید کی تعلیمات شکرا چاریہ کے فلسفہ میں شروع ہی سے موجود تھی مگر وہ بہت کچھ ایک ذہنی چیز تھی عملی زندگی کو اس سے زیادہ تعلق نہ تھا۔ اب وہ علما ہی ایک زبردست قوت بننے لگی اور اس نے اجتماعی عدل کی روح ہندو سماج میں پھونکنا شروع کی جس کے باعث ذات پات کے بندھنوں کے خلاف ہندو ذہن نے بناوٹ شروع کر دی جس کا اظہار شروع شروع میں شاعری کے ذریعہ ہونے لگا لیکن بعد میں اس نے ایک عملی شکل بھی اختیار کر لی

غذیبی شعبہ میں اسلامی تمدن نے بالواسطہ اثرات مرتب کئے لیکن تمدن کے بعض دیگر شعبوں میں تو اہل ملک کے ساتھ مسلمانوں نے اشتراک عمل کیا اور ایک مشترکہ ہندی تمدن کی بنیاد ڈالی گئی سیاست اور معیشت میں دونوں اقوام نے ساتھ کام کیا ازمنہ متوسطہ کے فنون لطیفہ شرافت تعمیر موسیقی، شاعری، نقاشی وغیرہ میں تو اسلامی ہندی تمدن میں ہندوؤں کا بھی مادی حصہ تھا اس مہم کی ایک زریں یادگار زبان اردو ہے۔ جس کی طرف ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔

اس تمدن کا مستقبل اب کیا ہے یہ ایک ایسا مشکل سوال ہے جس کے جواب کا انحصار چند عناصر کی موجودگی پر ہے۔ جان تک اس تمدن کی امادیت کا تعلق ہے اس پر اب شک نہیں کیا جاسکتا یہ انشیت کے بہترین اخلاقی اور روحانی نصب العین کا حامل ہے۔ اس میں مختلف سرچشموں سے جالی، سیاسی اور تنظیمی عناصر گڑھ ہو گئے ہیں۔ اپنے اجتماعی حس، اخلاقی مقصد اور مساوات اور جمہوریت کی تاریخی روایات کی بنا پر یہ آج کل کے سیاسی اور معاشی مسائل کا ایک بہترین حل پیش کر سکتا ہے۔ یہ ایک جامع چیز نہیں ہے جس میں کسی قسم کا تغیر ہی نہ ہو سکے بلکہ ایک نامی اور حرکی چیز ہے جو اپنی بنیادی روح کو قائم رکھتے ہوئے <sup>کے</sup> بھی روح عصری کا حامل ہو سکتا ہے۔ عہد جدید کے سیاسی معاشی اور زمین الاوامی مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کلیا اور ہندو مت کی طرح اس کا بھی خاتمہ کر دیا جائے بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ تمدن اسلامیہ کی از سر نو تشکیل قرآن، اسوۂ رسول، خلفائے راشدین کے عمل اور اسلامی تاریخ کی بہترین روایات کی روشنی میں کی جائے۔ اس طرح نہ صرف انسانیت کی گزشتہ تاریخ کا بہترین روحانی اور اخلاقی سرمایہ محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ عہد جدید کے مشکل ترین مسائل کا بھی حل مل جاتا ہے۔ ماضی کی شاندار بنیادوں پر حال کے ذریعہ مستقبل کا ایک فلک بوس تمدنی تصور تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ ہم خواہ مخواہ ماضی کی ہر چیز کو قائم رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ اگر انسانی ترقی کے لئے ضرورت ہو تو خس و خاشاک کو لے کر اسے بہرہ جانا چاہئے لیکن ہم اس کے بھی قابل نہیں ہیں کہ ماضی کا وہ سرمایہ جو انسانیت کی ترقی کے لئے مفید ہے۔ اسے خواہ مخواہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔ بہر مستقبل کے لئے ہر صورت ایک حال کی ضرورت ہے اور ہر حال کے لئے ایک ماضی کی، جب ماضی کی ضرورت بھی ہے تو ہم اس ماضی کو کیونکر نہ باقی رکھیں۔



جو انسانیت کی ترقی کے لئے بے انتہا مفید ہونے کے علاوہ ہماری قومی نفسی زندگی کے رگ و پشیرہ میں گذشتہ چودہ سو برس سے سرایت کیا ہوا ہے۔ مارکس، لینن، ہٹلر، مولینی، گاندھی اور جواہر لال کے ناموں پر سردھننے کے بجائے ہم کیوں نہ محمد معلم عربی کے سامنے نذر عقیدت پیش کریں جن سے بہتر نوحۂ انسانیت کا سبق تاجِ ملک کوئی دوسرا نہ دے سکا اور نہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا اجتماعی قانونی نظام بنا سکا

عہد جدید میں انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرنے کی ذمہ داری امت اسلامیہ کے سر پر ہے اور ہندوستان میں مسلمانان ہند پر، کیونکہ یہی امت امتِ وسطیٰ ہے اور ایسی امت کی تعلیمات میں روح اور مادہ اخلاق و سیاست، قومیت اور دین الاقوامیت، سرمایہ اور محنت کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔ کاش کہ مسلمان اس اہم فریضہ کو سمجھیں اور اس عظیم الشان ذمہ داری کو اٹھانے کیلئے تیار ہو جائیں۔ و ما توفیق اللہ

اس اہم انسانی اسلامی فریضہ کی ادائیگی کے لئے مندرجہ ذیل امور لازمی ہیں۔

- ۱۔ اولاً اسلامی تعلیمات، اسلامی تمدنی روح، اور عہد جدید کے تمدنی مسائل کا علم۔
- ۲۔ دوم ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک جمعیۃ اسلامی کا قیام جو ان تعلیمات کی حامل، اور اسلامی تمدنی روح سے لبریز ہو۔

ہندوستان کی بیشتر مسلم بادی کو اسلامی تعلیمات کا بہت ہی ناکافی علم ہے۔ جدید اگر تعلیم یافتہ طبقہ تو تقریباً محض لاعلم ہے، عربی مدارس کے فارغ التحصیل اسلامی تعلیمات سے واقف تو ہوتے ہیں لیکن وہ اسے چند مسائل میں ہی محدود سمجھتے ہیں اور ان کی نظر اس قدر کواہ ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی ہمہ گیر روح کا مکمل احساس نہیں کر سکتے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اسلام کا مقصد عبادت کے علاوہ عدل، سپر مانی ایک اجتماعی نظام کی تشکیل بھی ہے اور یہ فریضہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ بعض حضرات جو روح اسلامی کی ہمہ گیریت سے واقف ہوتے ہیں وہ موجودہ تمدنی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کی لاعلمی کے باعث ان تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا خاطر خواہ حل نہیں پیش کر سکتے۔ اسلام کا تصور ان کے ذہن میں بہت کچھ ایک جامد نظام کا ہے حالانکہ اسلام ایک حرکی اور نامی تصور زندگی ہے۔ برسوں کے بعد اسلام کے

نامی اور حرکی پہلو کو نظر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* اسلام میں مذہبی تصور کی نئی تشکیل میں پیش کیا ہے۔ ہر ماں اسلامی ہندی تمدن کے احیا کے لئے اذہن ضروری ہے کہ ہمارے عوام تعلیم اسلامی سے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ اور علماء اسلامی روح کی ہمدردیت اور جدید تمدنی مسائل سے واقف ہوں۔ بغیر وحدت فکری کے وحدت حل ایک نامکن چیز ہے۔ اس وقت اسلامی فکر میں جو انتشار پایا جاتا ہے۔ اس نے ایک جمعیت اسلامیہ کا قیام محال کر دیا ہے۔

ذہنی اعتبار سے لیکن اسلامی تعلیمات کا احساس اسلامی تمدن کی زندگی اور نشو و نما کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں کی زندگی کا جزو ہو جانا چاہئے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں تھالے جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لکھا ہے ان تعلیمات کے ساتھ مسلمانوں کے عین ترین جذبات کو وابستہ ہونا چاہئے۔ جذبات کے ساتھ لیکن علی میدان میں قدم اٹھانے اور کامیاب ہونے کے لئے ایک مستقل ارادہ کی بھی ضرورت ہے۔ مستقل ارادہ مسلمانوں میں استقلال اور بحالیافت برداشت کرنے کی طاقت پیدا کر دے گا جس کے بغیر کسی مقصد میں بھی کامیابی محال ہے۔

والعصر ان الانسان لئن خسر الا الذين آمنوا وعلوا الصالحات ؕ وتواصوا بالمعروف وتواصوا بالعبرۃ مندفعۃ بالافعال کی حامل جو جماعت ہوگی وہ دراصل جمعیت اسلامیہ ہوگی جو موجودہ اسلامی ہندی تمدن میں ایک نئی روح پھونک سکے گی اور اسے اس قابل بناسکے گی کہ نہ صرف وہ مسلمانوں کے لئے بلکہ ہندوستان اور تمام عالم کے ایک رحمت ثابت ہو۔ ایسی اسلامی جمعیتیں جنہوں نے نام تو اسلامی رکھ چھوڑا ہے لیکن جو نہ اسلامی تعلیمات سے واقف ہیں نہ ہی اسلامی روح کی حامل، نہ اسلام کا مفاد ان کے پیش نظر ہے، دراصل اسلامی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ منافقانہ جماعتیں ہیں جو اسلام کو نقصان پہنچا رہی ہیں کیا ہیں اسلامی مقاصد کے لئے ایک نئی جمعیت کی تشکیل کرنی چاہئے یا موجودہ جمعیتوں ہی کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں موجودہ اسلامی ہندی سیاست کے قریب لے آتا ہے۔ اس سوال کا جواب جو کچھ بھی ہو لیکن جو بھی جمعیت اسلامیہ ہونے کا دعویٰ کرے اسے

مندرجہ ذیل شرائط ضروری پوری کرنی چاہئے ورنہ وہ قطعی اسلامیہ نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کی تبادلت کا دعویٰ تو قطعی نہیں کر سکتی جمعیتہ اسلامیہ کے اراکین کے لئے ضروری ہے کہ

- ۱۔ وہ صحیح عقائد اسلامی رکھتے ہوں۔

- ۲۔ وہ شعار اسلامی یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کو ادا کرتے ہوں۔

- ۳۔ وہ ملکی آزادی کے لئے جو ایک فریضہ اسلامی ہے پیش از پیش قربانیاں دیں۔

- ۴۔ وہ ایک ایسے نظام معاشی کی تشکیل کی کوشش کریں جو عدل و مساوات پر مبنی ہو اور جس کے ذریعہ غربت و فلاکت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

- ۵۔ وہ اپنے دیگر تمام اعمال میں روح اسلامی سے سرشار ہوں اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اس روح کو عملی جامہ پہنانے کی عملی جدوجہد کریں۔

اس جماعت کا امیر کین جو یوں کا انسان ہو گا اس کے متعلق ہمیں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات ہمارے ان خیالات کو جہت پسندی پر محمول کریں گے لیکن بڑا تعجب ہے کہ اشتراکین کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اشتراکی تعلیمات پر یقین رکھے کسی مکمل قومی تحریک میں شرکت کے لئے اُن عقائد پر یقین رکھنا ضروری ہے جو اس جماعت کے ہیں لیکن اسلامی جمعیتہ کی رکنیت کے لئے اسلامی عقائد پر یقین رکھنے اور اسلامی اعمال کے مطابق زندگی بنانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے روشن خیالی کی انتہا جس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ جو لوگ جمعیتہ اسلامیہ کے قیام پر یقین نہیں رکھتے وہ نہ تو دراصل اسلامی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اسلامی تمدن کے قائل ہیں۔ ان حضرات کو حق ہے کہ ان خیالات کو رکھیں لیکن انہیں کم از کم یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ وہ خود کو مسلمان کہیں۔ انہیں زیادہ اخلاقی جرأت کا ثبوت دینا چاہئے اور صاف صاف جمعیتہ اسلامیہ سے علیحدہ ہو جانا چاہئے کیونکہ اس طرح ان کے اخلاق کو سخت ضرب لگتی ہے اور ہماری صفوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی ہندی تمدن کے مستقبل کا تعلق آج کل ایک نئی تحریک سے وابستہ کر دیا گیا ہے جسے پاکستان کہتے ہیں کیا وہ اقتضائے ہندوستان کی تقسیم اسلامی ہندی تمدن کی بقا اور نشوونما کے لئے از بس

ضروری ہے؟ تحریک پاکستان کا مکمل خاکہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے اس لئے ابھی تک اس کا تصور بہت  
 دھندلا سا ہے۔ لیکن ایک چیز اس میں صاف ہے وہ یہ کہ وہ ہندوستان کے ان حصوں کو جہاں مسلمانوں کی  
 اکثریت ہے مثلاً پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو شمال مغرب میں اور بنگال و آسام کو شمال و  
 مشرق میں ہندوستان سے آزاد کر دینا چاہتی ہے اس راہ میں جو سیاسی اور معاشی مشکلات حال ہیں  
 وہ تو واضح ہیں مثلاً یہ کہ اس ملک میں جب تک انگریزی تسلط ہے یہ ایک کبھی بھی ایک نئی جامعہ نہیں بن سکتی۔ دوم  
 یہ کہ ہندوستان کی دفاع کی تمام ذمہ داری شمال مغربی صوبوں پر عائد ہوتی ہے اس کے لئے پچاس کروڑ  
 روپے سے بھی زیادہ سالانہ اخراجات ہوتے ہیں اور ان تمام صوبوں کی مشترکہ آمدنی پچیس کروڑ روپے  
 سے ناگزیر نہیں ہے پچیس کروڑ روپیوں میں ان صوبوں کی حکومتوں کو چلانا اور قومی تعمیری کاموں کو انجام  
 دینا ہی مشکل ہے کجا کہ دفاع کے لئے ایک کثیر رقم خرچ کی جائے۔ شمالی صوبوں کی ممانعت پھر ان صوبوں  
 کی ممانعت نہیں ہے بلکہ تمام ملک کی ممانعت ہے پھر اس کا تمام بار کیوں صرف ان صوبوں پر ڈال دیا جائے  
 بنگال کی حالت تو اس بھی بدتر ہے کیونکہ وہاں تو ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو قومی ذمہ داریاں اٹھا سکیں  
 جو شخص بھی واقف اسلامی ہندی تمدن کا احیا چاہتا ہے اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ برطانیہ کی آغوش  
 شفقت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہندوستان کی مکمل آزادی شرط اولین ہے اور یہ تحریک ہندوستان  
 میں افتراق پیدا کر کے ملک کی فضا کو کس قدر مکرر کر دیتی ہے کہ ملکی آزادی کے لئے ایک متحدہ مجاہد قیام  
 جس کے بغیر آزادی ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں کہتی محال ہو جاتا ہے۔ یہ تحریک دراصل مسلمانوں کو  
 ایک خوشگوار طلسم میں مبتلا کر کے انہیں برطانوی شمنٹا ہیئت کا آلہ کار بنا دیتی ہے۔ وہ ان کی سیاست کو حقائق  
 کی دنیائے علیحدہ کر کے تخیلات کے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس سے قوم کے قومی عملی کوشش کو دینے کے علاوہ  
 اور کوئی دوسرا فائدہ مرتب نہیں ہوتا ہیں اس چیز کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک وحدت  
 ہیں، ان کا مذہب، ان کی تاریخ اور ان کی موجودہ مشترکہ ضروریات انہیں باہم مربوط کئے ہوئے ہیں اور کوئی  
 طاقت ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتی اور جو بھی اس کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل ایک جسم کو  
 ٹکڑوں ٹکڑوں میں کاٹ ڈالنا چاہتا ہے جس کو دھوکہ میں مسلمان چاہیں قبول کر لیں لیکن علاوہ اس کیسے

کبھی بھی رخصت نہیں ہو سکتے۔

پھر بغرض محال یہ صوبے انگریز اور ان صوبوں کی ہندو اقلیت کی مخالفت کے باوجود ہندوستان سے علیحدہ بھی ہو جائیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ واقعتاً اسلامی ریاستیں قائم ہو جائیں گی۔ ان صوبوں میں ہندو بھی کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کا حکومت پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی تقریباً ایک مشترکہ ہی حکومت ہوگی کیونکہ تمام انسانوں کے ساتھ انصاف اور رواداری نہ برتنا یقیناً اسلامی تعلیم کے خلاف ہے جب ہندوستان سے علیحدگی کے بعد بھی صرف صوبوں میں مشترکہ ہی حکومتیں قائم ہو سکیں گی تو ہم کیوں ملک کی وحدت کو ختم کر کے اسے اس قدر کمزور کر دیں کہ وہ شہنشاہیت کا ہمیشہ غلام بنا رہے۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی میں تقریباً ایسی ہی کیفیت تھی جیسے ہمارے پاکستانی حضرات چاہتے ہیں یعنی ہندوستان کے مختلف صوبے پنجاب، اودھ، بنگال، دکن وغیرہ آزاد ہو گئے تھے۔ اور ان میں مرہٹوں نظام، سکھوں اور مسلم صوبہ داروں کی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ملک کے اس انتشار کا جو انجام ہوا وہ ظاہر ہے۔ جلد ہی ملک مغربی اقوام کا شکار گاہ بن گیا اور ایک قوم تو اس قدر مفلح ہو گئی کہ اب تک نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوستان کے مغرب اور مشرق میں جو ہولناک جنگ اس وقت جاری ہے اس کے باعث تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ کیا یہ حضرات ملک کے موجودہ شہنشاہی اقتدار کے بقا کی کوشش فرما رہے ہیں یا ہندوستان کو دوسری خارجی طاقتوں کی شکار گاہ بنا چاہتے ہیں؟

ہمیں دراصل مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت کے تصور کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ بعض مسلمانوں کی حکومت جابر و ظالم بھی ہو سکتی ہے جس طرح بعض مرتبہ تاریخ میں ہوا ہے۔ وہ حکومت ممکن ہے مطلق بھی اسلامی نہ ہو بلکہ اس کا تمام دار مدار ذاتی اغراض پر ہو اور ملک کو آزادی کی بجائے غلامی میں مبتلا کر دے اور عوام انسان کی خدمت کے بجائے خوب تباہ مال کرے۔ اس قسم کی حکومت چاہے اس کے حکمرانوں کے نام اسلامی کیوں نہ ہوں اسلامی نہیں کہی جا سکتی۔ اسلامی حکومت تو صرف وہی ہو سکتی ہے جو قومی آزادی پر قرار رکھے، عوام انسان کی عزت و حرکت کرے، اور ان کی اخلاقی و روحانی نشوونما کے لئے ایک ناقابل تردید اصول رکھے۔ اس کے لئے ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کی اور ان صوبوں

میں جاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کو خطرہ میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس تصور کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں اور ملکی تحریکات پر اپنی حوصلہ شکنی، قومی شخصیت کا اثر ڈالیں بیشک جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس تحریک کو زیادہ اثر انداز ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہاں کے صوبوں کی حکومتیں بھی مسلمانوں ہی کے زیر اثر ہوں گی۔ لیکن ان صوبوں میں بھی جان مسلمان اقلیت میں ہیں وہ کم اثر انداز نہیں ہو سکتے بشرطیکہ ان میں ضروری روح اور طاقت عمل موجود ہو۔ انقلابات میں اکثریت اور اقلیت کا سوال نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار اس معنوی طاقت پر ہوتا ہے جو کسی قوم میں موجود ہوتی ہے۔ مسلمان ہندوستان کی سیاسی اور معاشی تحریکات کو ترقی پر دربنالے میں بے انتہا مفید ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے اہل فریضہ سے واقف ہو جائیں۔

یہ خطرہ بے شک ہے کہ مرکزی حکومت میں ہندو اکثریت کیں ان صوبوں کی آزادی بھی ختم نہ کر دے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس کا تدارک اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ویدانی حکومت نہ قائم کی جائے۔ بلکہ ایک وفاقی حکومت ہو۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے۔ صوبے اپنی خاص تمدنی روایت کے مطابق جس طرح چاہیں نشوونما کریں۔ اس طرح ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلامی تمدن کے خط و خال زیادہ واضح ہو سکیں گے اور ان صوبوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہ اپنی معنوی طاقت کے باعث ملک کی حکومت اور اس کے ذریعہ ملکی تمدن میں اسلامی رنگ غالب کر سکیں گے۔ مرکزی حکومت کو آپس کے معاہدہ کے ذریعہ کم سے کم اختیارات دئے جائیں۔ صرف وہ اختیارات جو ہندوستان کے تحفظ اور بقا کے لئے ضروری ہیں مثلاً دفاع کے لئے فوجی انتظام، امور خارجہ وغیرہ یا وہ جو ملک کی عام مرفہ و معاشی کے لئے ضروری ہیں مثلاً ریلوے، جنگل، پوسٹ ایک عام معاشی پروگرام کی تشکیل وغیرہ۔

اسلامی تہذیب و تمدن کی بقا اور نشوونما کے لئے جو بھی امور ضروری ہوں وہ ہمیں میں بنیادی حقوق کی حیثیت سے شامل کر لئے جائیں اور یہ ہمیں اس وقت تک تبدیل نہ کیا جائے جب تک خود مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت اس کی تائید میں نہ ہو یہ ڈر کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندوستان کی آزادی

کے بعد ہندو اس آئین کو ختم کر دیں گے اور اس طرح مسلمان دوبارہ خطرہ میں آجائیں گے اس قدر نلو  
 ہے کہ اس کا ذکر بھی بیکار معلوم ہوتا ہے۔ آٹھ کروڑ مسلمان اگر کسی چیز کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو دنیا کی  
 کوئی طاقت اسے نفا نہیں کر سکتی۔ جو رہنمایان قوم یہ احساس کمزوری مسلمانوں میں پیدا کر رہے ہیں وہ  
 دراصل مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ وہ مسلمانوں کو مغلوب کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے  
 ان کی تاریخی روایات کو فراموش کروا دینا چاہتے ہیں۔ اقلیت اور اکثریت کے ذریعہ قومی مسائل طے  
 نہیں ہو کر تے بلکہ اس میں اصل معیار معنوی طاقت ہے وہ معنوی طاقت جو قوموں کو اپنے مقاصد کے لئے  
 اپنے سروں کو تھیلیوں پر لینا سکھادیتی ہے، خون کو بانی کی طرح ارزاں کر دیتی ہے

اسلامی ہندی تمدن کی بقا اور نشوونما غرضکہ اس معنوی طاقت پر منحصر ہے جو مسلمانان ہند اپنے  
 آپ میں پیدا کریں گے۔ دوسری اسلامی اقوام مثلاً ترک، ایرانی وغیرہ شاہراہ آزادی پر گامزن ہو چکی  
 ہیں۔ ان میں ایک نئی زندگی کا خون دوڑ چکا ہے لیکن قیمتی سے یہ اقوام مغرب سے بہت زیادہ متاثر  
 ہیں۔ ان مالک میں جدید تعلیم یافتہ اکثر مذہب سے ناواقف تھے اور علماء حد سے زیادہ رجعت پسند اور جدید  
 تمدنی مسائل سے لاعلم۔ ان دونوں طبقوں میں کش مکش لازمی امر تھی۔ اس کش مکش میں علماء کی شکست ہوئی  
 جس کے باعث مذہبی سررشتہ سے وہاں کی تمدنی زندگی آزاد ہو گئی۔ اس طرح یہاں مادی اور تمدنی  
 ترقی میں دو صحیح امتزاج نہ پیدا ہو سکا جو تمدن اسلامیہ کے لئے ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے اب ان اقوام میں  
 دوبارہ رد عمل شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ جلد ہی ایک صالح اسلامی تمدن پیدا ہو سکے گا لیکن اس  
 سلسلہ میں رہنمائی ہندی مسلمانوں کی قسمت میں لگمی گئی ہے۔

میر غریب کو آئی ٹھنڈی ہوا یہاں سے

ہندوستان کے علماء جدید تمدنی مسائل سے بالکل ناغل نہیں ہیں۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد  
 میں انہوں نے رہنمائی کی ہے۔ ایثار و قربانی اور استقامت راہ کی انہوں نے وہ شاندار روایات قائم کی  
 ہیں جو ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی یہاں مذہب سے وہ سرکشی دکھائی  
 نہیں دیتی جو دوسرے مالک میں ہے۔ اگر یہ دونوں طبقے متحد و یکسو ہوں تو ایک ایسے تمدن کی تشکیل

کر سکتے ہیں جس کی بنیاد انسانیت کی حقیقت اصلی یعنی روح کلی پر استوار ہوگی۔ جو ماضی کی تمام شاندار اور  
منید روایات کا حامل ہوگا۔ جو حال کے تمام تمدنی یعنی مذہبی، اخلاقی، قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور معاشی  
مسائل کا حل پیش کرے گا۔ اور اس طرح انسانیت کی ایک شاندار مستقبل کی طرف رہنمائی کر سکے گا۔ یہ اسلامی  
ہندی تمدن ایک طرف تو ہندوستان کی تمدنی تحریکات پر اثر انداز ہوگا اور اسے رجعت پسندی سے محال کر  
ترقی کی راہ پر چلائے گا، دوسری طرف وہ مالک اسلامیہ پر اثر ڈالے گا اور انہیں مغرب کے بڑھتے ہوئے  
سیلاب الحاد و دہریت، سرمایہ داری اور سنشامیت سے بچائے گا۔ یہ مشرق کی بیدار روح کا ایک مظہر  
ہوگا جو مغرب پر پھر اپنی روحانی معنوی طاقت کے ذریعہ اسی طرح اثر انداز ہوگا جس طرح مشرق متعدد بار  
تاریخ میں ہو چکا ہے۔ یہ جارحانہ قومیت کے بجائے انسانیت، جنگ و جدل کی بجائے محبت و احترام  
دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کرے گا۔ اس طرح دنیا کی آزادی، عدل، امن اور نشوونما کے لئے  
ایک نئے باب کا افتتاح کر سکے گا۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب بی۔ اے (جامعہ)

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن)



# مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

گلدستہ سے پیوستہ

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کے محاسن اور معائب | مولانا کی تنقید میں اپنے محاسن کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں اور خوبیوں کے اعتبار سے دنیا کی بہتر سے بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں ان میں خامیاں بہت ہی شاذ و نادر اور خوبیاں بکثرت ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کا ذکر مثالوں کی روشنی میں حسب ذیل ہے۔

(۱) زبان اور علم و ادب پر عبور :- مولانا عبدالحق زبان اور ادب کے معاطات میں اس دور کے قابل اور مستند اہل رائے میں سے ہیں۔ الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کے معانی و مطالب اور ان کے موقع و محل استعمال کے متعلق آپ کی رائے قبیح ہوتی ہے ان مسائل پر آپ کی توضیح و تشریح اکثر آخری فیصلہ ہوتی ہے آپ نے اگر ایک طرف ہمیشہ وہابی کی لکسائی زبان کے ماحول میں پرورش پائی ہے تو دوسری طرف اپنی عمر کا کافی حصہ زبان و ادب کے مسائل کی تحقیق و جستجو میں صرف کیا ہے۔ فارسی، عربی، ہندی اور کوئی الفاظ جن سے کہ اردو کے زیادہ تر الفاظ اخذ ہیں ان پر آپ کو کافی عبور حاصل ہے۔ الفاظ کے مادوں اور ان کے معانی کا آپ نے جو مطالعہ کیا ہے جس کا کچھ اندازہ آپ کی اس تنقید سے کیا جاسکتا ہے جو سرگزشت الفاظ پر کی ہے۔ چنانچہ جلاب اور رضانے کے متعلق مصنف کتاب کا خیال پیش کرنے کے بعد اس پر تنقید کی ہے۔

”جلاب انگریزی میں جلیب، لکھنؤ کے ایک شہر جلابا کے نام سے ہے“ قابل ملاحظہ

یہ بات لکھی ہے جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ باری تحقیق میں یہ لفظ گلاب کا معرب ہے گڑا

سے بچنے کے لئے مصل کے استعمال ہونے لگا ہے۔ ”رضائی محمد رضا موجود کے نام پر ہے“

جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ دراصل ”رضائی“ ہے چونکہ عموماً یہ رنگے ہوئے کپڑے کی بنا

جاتی ہے اس لئے یہ نام پڑ گیا“ (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳)

اسی طرح ”متوالا“ کی تشریح کرتے ہیں۔

”وہ (یعنی مصنف کتاب) اسے مت (سمجھ متل) اور والا سے مرکب سمجھ میں حالانکہ یہ لفظ ”وہ“ اور والا سے مرکب ہے۔ مد کے معنی ہندی اور سنسکرت میں شراب اورستی کے ہیں۔ کثرت استعمال سے دت سے بدل گئی ہے۔ ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے۔ (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۳۱)۔  
بھانا اور پسند آنا، کا فرق اس طرح بیان کیا ہے۔

”بھانا بھی مترک ہے حالانکہ اس کی بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ پسند آنا، اور پسند کرنا، میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور بھانا، وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے دل کو خود بخود جلی معلوم ہوتی ہے۔

پرسے، اور ادھر کا فرق بھی خوب بیان کیا ہے۔

”کہتے ہیں کہ پرسے، کا لفظ بھی مترک ہے لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ ادھر، مگر پرسے اور ادھر میں بہت فرق ہے، ادھر سمت کو بتاتا ہے اور پرسے، بعد کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا کی زبان وانی کی ایک اور مثال فیضان شوق کے تفرز کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جس میں آپ نے حضرت شوق قدوائی جیسے مستند زبان والوں اور استاد محاورہ کی غلطی نکالی ہے۔ شوق نے ایک شعر میں ”ہیں کھینچ دینا“ استعمال کیا ہے اس پر آپ کہتے ہیں۔

”آہیں کھینچ دینا یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں آہیں کھینچیں ہی نصیح معلوم ہوتا ہے۔“

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۳۲)

قواعد زبان پر بھی مولانا جلد ہی مستند سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ

”قواعد اردو، اور صرف و نحو اردو، آپ کی مستند اور معرکہ آرا تصانیف ہیں۔“

زبان کے مسائل پر مجبور رکھنے کے ساتھ ساتھ مولانا اردو ادب کے ہر شعبے پر مادی ہیں خصوصاً تاریخ ادب اور دو پر آپ کی رائے بلا چون و چرا تسلیم کی جاتی ہے اور آپ کا ہر قول سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ دکنی زبان کے متعلق آپ نے جو تحقیقیں کی ہیں وہ اپنی ذمیت اور اہمیت کے اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

اس مادی میں سلطان محمد علی قطب شاہ، نصر قی سب رس، قدیم اردو یعنی دکن کا ایک شاعر خاندان اور ان کے دوسرے فاضلانہ مقدمے معرکہ را اور تاریخی اہمیت کے مالک تحقیق کا راسخ ہیں۔ علاوہ ازیں مہوشی زبان پر فارسی کا ازاد اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام مرحوم دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج کے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں وہ ہماری تاریخ ادب میں بیش بہا اضافے ہیں۔ یہ مہتمم بالشان محققین نہایت ہی صبر اور محنت کو انجام دی ہیں۔ ان کے لئے انصاف نے جہاں سینکڑوں قدیم کتابیں چھل گئیں ان کا اور اس دور کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا وہاں خود علی کو ششیں بھی کہیں۔ چنانچہ بیجا پور میں نصر قی کی قبر تلاش کرنے کے لئے نہ معلوم کتنی زمیں برداشت کیں غرض کہ مولانا نے تاریخ ادب کے متعلق بہت ہی محنت اور کاوش سے تحقیق کی ہیں جو کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی ادبی تحقیقاتوں سے کسی حیثیت سے کم درجہ کی نہیں۔

مولانا کے تحقیق کار ناموں کو گنانے کے بعد اردو ادب کے متعلق ان کی معلومات کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن پھر بھی بعض تنقیدوں میں وہ جس طرح اپنی ادبی معلومات کا اظہار کرتے ہیں وہ ان کے کمال کی بہترین دلیل ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر کریم علی کی کتاب "اردو لہجہ، پر تبصرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”قصہ ابوشمہ کا مصنف محمد امین نہیں ہے میرے پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں آہن

یا محمد امین نہیں آیا بلکہ ہر نسخہ کے آخر میں اس کا نام آویا، لکھا ہوا ہے۔“

”شودا کے متعلق لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا حالانکہ دہلی میں

علاء اللہ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب مل چکا تھا میر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔“

”ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ امیر خسرو کی یوسف

زلیخا کی پیروی میں لکھی گئی ہے خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی اور نہ امیر خسرو کی تصنیف

سے کوئی شعوی یوسف زلیخا ہے۔“ (چند تنقیدات عبد الحق)

الفاظ، محاوروں اور تاریخ ادب کے علاوہ مولانا سخن فہمی میں بھی ملکہ رکھتے ہیں نصر قی کے کلام کی جو خوبیاں بیان کی اور مقدمہ انتخاب کلام امیر میں جن اشارات کا انتخاب کیا ہے اور انہیں جس خوبی سے سمجھایا

جن باریکیوں اور نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ مخفی نفسی اور ذوق سلیم کی دلیل ہے لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ شاعری پر آپ کی نگاہ اس قدر گہری نہیں پڑتی۔ اسی لئے آپ کی وہ تنقیدیں جو شاعری پر ہیں تشہیمیں ہیں۔

مولانا جہاں شاعری کی خوبیاں اور نکات سمجھا سکتے ہیں وہ شاعری کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ شوق جیسے مستند شاعر کے کلام پر خوب تنقید کی ہے۔ کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اسپرتم اک ذرا ساحن کیا پایا کہ تو اتر اگیسا اس میں زبان کا جو لطف ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں کچھ، کچھ یونی سا ہے اور دوسرے میں ذرا ساحن، مستوق کے لئے کنا صحیح ذوق محبت کے معانی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی کا زامو کا درہ بندی ہے۔ (چند تنقیدات جلد اولیٰ صفحہ ۴۱)

(۲) وسعت علم۔ مولانا عبدالحق نے اردو ادب میں نئی جان ڈالی ہے۔ آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ ادب کی روح علم اور تحقیق ہے۔ محض الفاظ کے داؤں بیچ اور ترکیبوں کے ہیر پھیر سے اثر نہیں پیدا ہوتا بلکہ وہ ادیب کا علم اور اس کے خیالات ہیں جو اس کے الفاظ میں جان ڈالتے ہیں اس لحاظ سے آپ کی تنقیدیں وسعت تحقیق کی سرمایہ دار ہوتی ہیں۔ جن کا ہر جملہ مطالب اور معانی سے پُر، اچھوتے خیالات اور نئی تحقیقات کا حامل ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحق کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان اور ادب پر کافی غور رکھتے ہیں۔ اسی لئے جدید خیالات اور یورپین زبانوں کے ادب سے بھی انہیں واقفیت ہے۔ اگر سرسید، حالی اور شبلی نے مغربی زبانوں کو جانے بغیر صرف ان کے اثر سے ہمارے ادب میں اس قدر اہم تبدیلیاں کیں، ادب کی نئی اصناف کو افادہ نویسی اور تنقید نگاہی کو جاری کیا، عبارت آرائی اور لفاظی کو چھوڑ کر زبان میں سادگی اور معانی آفرینی پیدا کی تو مولانا عبدالحق جنہوں نے اس زبان کے مختلف طرز تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے جنہوں نے انگریزی کی مرد سے فرانسیسی ادب کی اکثر بلند پایہ تصانیف اور اصناف سخن کو سمجھا ہے، جو جدید خیالات اور زنگی کے

مقاصد سے بہتر طور پر واقف ہیں انہوں نے اپنے پیشروؤں کی ابتدائی کوششوں کو تکمیل تک پہنچایا ہے۔ خصوصاً تنقید نگاری کو جس کی بنیاد و حاکمی اور شبلی نے رکھی تھی جہاں ان کی تحریروں میں انگریزی کی سادگی پائی جاتی ہے وہاں ان کے مقدمے اور تنقیدات میں رینان (M. Renan) اور سینٹ بے (M. Sainte Beuve) کی جھلک بھی ہے۔ اور ان کے خیالات مغربی ادب اور علوم سے متاثر نظر آتے ہیں جس کی مثالیں ان کی تنقیدات میں اکثر ملتی ہیں۔ اور کبھی کبھی مغربی خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں جس سے کہ ہماری زبان کی استعداد میں اضافہ اور خیالات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

بی۔ اے میں مولانا کے مضامین تاریخ اور فلسفہ تھے۔ چنانچہ تاریخ کا نمایاں اثر آپ کی تحقیقات اور معلومات ادب کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں اسی طرح فلسفہ کا اثر بھی آپ کی تنقیدوں میں بہت نمایاں ہے۔ آپ کے ہاں اعلیٰ ملی مباحث اور اُن پر منطقی غور و فکر اور مدلل طرز تنقید نہایت ہی قابل قدر چیزیں ہیں۔ اگر مولانا کی قابلیت اور فلسفیانہ طرز تنقید کا مشاہدہ کرنا ہو تو مقدمہ معرکہ مذہب و سائنس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ اسی میں ایک جگہ جذبات کے متعلق لکھتے ہیں:-

”جذبات و حقیقت عقلی اور داغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشوونما انسان کی یہودی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقل کی نشوونما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا لگتا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف ہے مگر عقل کہتی ہے کہ یہ ٹھیک نہیں اور یہ بھی بنائے غاصت ہوتی ہے۔“ (مقدمات جلد ہی حصہ اول صفحہ ۱۶۲)

اسی مقدمے میں ایک جگہ سائنس دانوں کے ایک اعتراف کا جواب خوب دیا ہے۔

”یہ کہنا کہ انسانوں کو خود سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال بھوت، پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا۔ لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے، صحیح نہیں۔ کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال، فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول، تمام ایجادات اور

تمام اختراعات کو اگر بے نظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہیں  
دشمنوں تک پہنچے گی جہاں سے کہ ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں وارثاً  
ٹی ٹی ایم اور ای طرح ایک دوسرے تک پہنچتی رہیں گی۔ (مقامات جلد تہم حصہ اول ص ۱۰۹)

اس قسم کے علمی اور فلسفیانہ مسائل مولانا کی تنقیدوں میں اکثر پائے جاتے ہیں جس سے ان کی علمیت اور وسعت  
معلومات کا اندازہ ہوتا ہے یہی مولانا کی امتیازی چیز جو انہیں ان کے پیشروؤں اور اکثر معاصرین سے ممتاز  
کرتی ہے۔ ان کے جیسی عالمانہ تنقید کی حقیقت نگاری، مدلل طرز تنقید، جدید خیالات اور علوم کے متعلق  
معلومات کسی دوسرے اردو نقاد کے ہاں کمتر پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریریں خود ادبی نکات اور معلومات  
کا غزن ہوتی ہیں اور یہی نقاد کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ تخلیق ادب کے لئے صحیح اور سچے خیالات  
کی فضا پیدا کرے اور ادیبوں کے لئے نئی نئی جولاں گاہیں تلاش کرے تاکہ لوگ ایک ہی میدان کو اپنی  
تخلیقی قوت سے پاال نہ کریں۔

(۳) قوت فیصلہ - مولانا علیہ السلام نقاد کی حیثیت سے غیر معمولی طور پر بہت اچھی قوت فیصلہ رکھتے  
ہیں۔ خیالات کی گہرائی اور وسعت تحقیق کی وجہ سے آپ ادبی معاملات میں خود اپنا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ایک  
مختار محقق اور عالم کی حیثیت سے مولانا دوسروں کے خیالات کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر  
سے مقابلہ کر کے دلائل و براہین کے ساتھ کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ اسی کا نام قوت فیصلہ ہے اور اس  
کی مثالیں بوجہ اتم مولوی صاحب کی تنقیدوں میں ملتی ہیں۔ مولانا کے جس قدر بھی مقامات اور برعبرے  
ہیں ان میں صحیح منہوں میں ریسرچ تحقیق کی شان پائی جاتی ہے جس میں وہ اپنے نقطہ نظر کو دوسروں کی  
راہوں کے مقابلے میں صحیح طور پر رکھتے اور جانچتے ہیں۔ وہ خیالات کی بلند پروازی سے بچتے ہیں اور منطقی طور  
پر بال کی کمال نکالتے ہیں اور جب تک روایت کو دلائل کی کوئی پراچی طرح پرکھ نہیں لیتے اس قوت  
تک فیصلہ نہیں کرتے اسی لئے ان کی رائیں بہت ہی صائب اور مدلل ہوتی ہیں۔

(۴) انصاف - تنقید کی جان انصاف اور بے لوثی ہے کوئی شخص کتنا ہی بڑا ادیب اور کتنا ہی بڑا عالم کیوں  
ہو۔ اس کے فیصلے اور تنقیدیں اس وقت تک تسلیم نہیں کی جاسکتیں اور نہ مقبول ہو سکتی ہیں جب تک کہ

وہ علوم، صداقت اور اصلیت پر مبنی نہ ہوں۔ مولانا عبدالحق کے مقدمے اور تنقیدیں ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوتی ہیں۔ وہ صوبہ دارانہ اور شخصی فرقہ بندیوں سے کمین بلند ہیں۔ ان کے ہاں علم سے بحث علم کی خاطر ہوتی ہے۔ مخصوص نقطہ نظر اور خیالات پیش کرنے کے لئے نہیں۔ وہ تنقید چیزوں کو ان کی ذاتی اور اصلی روشنی میں دیکھ کر کرتے ہیں۔ ذاتی مقائد اور مقتدات کے دھندلکے میں نہیں۔ چنانچہ حیات النذیر کے مقدمے میں جہاں امۃ الامہ کے جلائے جانے کا ذکر کرتے ہیں وہاں مولویوں کے طرز عمل پر بلا کم و کاست کتنی اچھی اور صحیح رائے دی ہے

”اس رات کو گویا مولویوں نے شب بارات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات اخروی کا باعث ہوگی۔ یہ ان بزرگوں کا کام ہے جنہوں نے چشم بد و در مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کا بیڑا ٹھایا تھا۔“ (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۱۲۴)

مولانا تنقید لکھتے وقت سوائے حق اور ادب کے مطالبات کے اور تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور خوبیوں اور نقائص پر غیر جانبداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں حتیٰ کہ ایک حساس دل اور قوم و ملک کی آزادی اور ترقی کا صحیح جذبہ رکھنے کے باوجود قومیت کو بھی تنگ نظری سمجھتے ہوئے اسے اپنی تنقید میں کبھی داخل نہیں ہونے دیتے۔ جس کی بے نظیر مثال یہ ہے کہ آپ نے فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر گلکھر کی ادبی خدمات کی داد دینے میں جس قدر غیر جانبداری سے کام لیا ہے وہ ایک سچا نقاد ہی کر سکتا ہے اسی طرح آپ دہلی کالج کے متعلق اردو لٹریچر کے تبصرے میں لکھتے ہیں۔

”ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو تفصیل سے کیا ہے لیکن دہلی کی یونیورسٹی ٹرائلشس سوسائٹی، اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ اور قابل قدر اور اہم تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا کام زیادہ تر صرف افسانوں اور قصہ کہانیوں تک رہا مگر دہلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا۔ اس کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں نہایت ضروری تھا۔ (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۲۴)

مولانا عبدالحق اپنے لب و لہجہ میں اعتدال کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بڑی بڑی خامیوں کی طرف اشارہ نہایت ہی پر لطف انداز میں کر جاتے ہیں چنانچہ تذکرہ اعجاز سخن، جسے شاعران کی ایک ڈاکٹر می بھننا زیادہ بہتر ہو گا اور جس میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ پنجاب کی پیداوار گیہوں ہے اور گیہوں مقوی دماغ ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا نہ ہوئی ہو۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

”وغرض کہاں تک لکھوں کتاب کیا ہے ایک سمند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قابل مولف کی نظر بہت وسیع ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ذوق سلیم ہزار ہا دفتر پڑھنے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں اعلیٰ سے اعلیٰ راویوں کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ مضحکہ خیز خیالات اس طرح ملا کر رکھ دئے گئے ہیں کہ ذوق صحیح پر گراں گذرتا ہے۔“

مولانا کی تنقیدوں کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے لب و لہجہ میں سختی اور ان کی تنقید نگاری میں محاسب کی شان پائی جاتی ہے اور اس کی مثال میں وہ اصلاح سخن، اور اردو لٹریچر کے تبصروں کو پیش کرتے ہیں لیکن ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ مولانا کی تنقید کا نہ یہ عام رنگ ہے اور نہ انھوں نے ان تنقیدوں میں سختی سے کام لیا ہے۔ ان کی تنقیدوں میں علیت، تحقیق اور صاحب رائے کے ساتھ ساتھ بزرگی کا اثر ضرور پایا جاتا ہے مگر یہ ان کی عمر، وسعت تجربہ، اگر مطالعہ اور ذوق سلیم کے شایان شان ہے۔ اس قدر مسلم الثبوت اور مستند نقاد ہونے کی حیثیت سے ان کی تنقیدوں کو ایسا ہونا بھی چاہیے اور نہ ان لوگوں کو جو بے راہروی کی طرف مائل ہوں اور کنا خشک ہو گا۔

مولانا اکثر مضامین کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کا بہت اچھا انداز رکھتے ہیں لیکن بعض تنقیدوں میں کبھی کبھی ایسے طرز بھی نظر آتے ہیں جس سے کہ مصنف کی خامیاں بہت ہی نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اردو لٹریچر کے تبصرے میں غلطیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جس سے تصنیف کے متعلق بڑی پیدا ہوتی ہے۔ مگر مولانا کیا کر سکتے تھے جب غلطیاں ہی اس قدر کثرت سے ہوں۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدوں میں بہت شکن چلے بھی شاذ و نادر مل جاتے ہیں جن سے آپ کی انصاف



پندی پر تو کوئی حرف نہیں آتا مگر مصنف کے لئے بہت ہی ہمت شکن ہوتے ہیں مثلاً  
 ”اس کتاب میں بھی وہی خامی پائی جاتی ہے جو مصنف کی ہر کتاب میں نظر آتی ہے“  
 (چند تنقیدات جلد ہی صفحہ ۲۴)  
 ایک جگہ اور ہے۔

”ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشور ہے کہ نقل میں عقل کو بہت کم دخل  
 ہونا چاہیے۔ اس لئے ان سے جگہ جگہ لغزشیں سرزد ہوتی ہیں“ (چند تنقیدات جلد ہی صفحہ ۵۹)  
 مولانا کے انصاف کا کمال یہ ہے کہ ان کی ادبی عدالت میں مسئلہ شہرت کے مالک اور نوآموز  
 اور غیر معروف مصنف کا ایک ہی درجہ ہے۔ وہ نہ اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ اس سے بدظن  
 چنانچہ مکاتیب امیر نیانی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”ہیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کر بہت ایسا ہی ہوئی۔ تقریباً تمام خطوط بے لطف بے مزہ  
 اور روکھے چھپکے ہیں۔ نہ کہیں ادبی نکات فرماتے ہیں اور نہ کہیں شعرو سخن پر ایسا خیال ظاہر فرمایا  
 ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو“ (چند تنقیدات جلد ہی صفحہ ۱۱۴)

اسی طرح پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی کتاب د زبان اردو پر سرسری نظر، تو تنقید کرتے ہوئے  
 ان کے اس قول پر کہ ”غالب کی شاعری ایک حد تک مرثیہ ہوائے دہو اور ناول و نوح کی ترجمان ہے“ اس  
 طرح تنقید کرتے ہیں۔ یہ ان کے طرز تنقید کا صحیح نمونہ ہے۔

”دیہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جس نے اردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے  
 خود بھی ادیب ہے اور یونیورسٹی میں اردو کا لکچرار بھی اور اس لئے نہایت حیرت انگیز ہے۔  
 ناہنیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں کوئی پیغام نہیں ملتا کیا  
 شیکسپیر کی شاعری میں جو سرتاج شرائے عالم ہے کوئی پیغام ملتا ہے۔ ایک نہیں کئی کئی  
 یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے۔ کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اردو شاعری کو اپنی  
 سے بکمال کر لیں کا کہیں پہونچا دیا۔ غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ

پیدا کیا لیکن شاید صدیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں، خیالات کی جدت، تخیل کی بلندی اور بیان کا جو لطیف مرزا کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا۔ میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنہیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے پیغام میں کیا مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ہیں اور ان پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو مالتی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ مرزا غالب کا اثر اردو شاعری پر عجیب و غریب ہوا ہے اور ہے۔ کیا بغیر کسی پیغام کے یہ ممکن ہے؟

(چند تنقیدات عہدِ حق صفحہ ۷)

مولانا کی تنقید نگاری کا بڑا کمال یہ ہے کہ تنقید کا اعلیٰ اور پاکیزہ معیار بھی قائم رکھتے ہیں اور مبتدیان اور نو مشقوں کی ہمت افزائی میں بھی دریغ نہیں کرتے چنانچہ پروفیسر محمود شیرانی کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

”اس وقت بھی ہم میں ایسے قابل نقاد موجود ہیں جیسے پروفیسر شیرانی یا اردو لوگ جنہیں ابھی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ واجونی الحال اپنے کام میں مشغول ہیں جو حال کے ادب میں اپنی قابل قدر یادگار چھوڑ جائیں گے“

(خطاب عبدالحق صفحہ ۱۱)

”اکبر الہ آبادی“، مؤلفہ طالب الہ آبادی پر تنقید کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

”طالب صاحب نے جس تحقیق و محنت و تلاش سے اکبر کے حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام کی خوبیوں کو دکھایا ہے وہ اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اکبر کے جمالات محنت و تحقیق سے جمع کئے ہیں ان کی محنت میں کلام نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ امید نہیں کہ کوئی دوسرا جمع کر سکے“

(چند تنقیدات عہدِ حق صفحہ ۱۳)

مکاتیب امیر دینانی پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کتاب مولوی حسن اللہ خان ناقد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”اسی دیا چو میں انہوں نے امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ جو بلاشبہ معصنہ اور ایک حد تک بے لاگ ہے جس کی توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ہو سکتی“ (چند تنقیدات عہدِ حق صفحہ ۱۴)

مولانا کی تنقیدیں اردو ادب میں غیر جانبداری، انصاف اور سچائی کا بہترین نمونہ ہیں۔ جس میں خلوص اور بے نفسی کی بوا آتی ہے۔ اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تنقید نگاری ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر صرف زبان و ادب کی ترقی کی خاطر کر رہے ہیں اور یہی صحیح تنقید ہے جو کہ آپ کی تنقیدوں اور تحریروں کے ہر پرچے سے نمایاں ہے لیکن انسان حالی از خطا نہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحی انہی تمام خوبیوں کے باوجود مولانا شبلی کے معاملہ میں اپنی غیر جانبداری کے اعلیٰ معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔ حالی اور شبلی کی معاہدہ جنگ کی وجہ سے آپ کی تنقیدوں میں ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت کی جھلک آہی گئی ہے چنانچہ مقدمہ حیات النذیریہ میں، ”ہماری قوم کے ایک علامہ کے قول“ کو پیش نظر رکھ کر تاریخی شخصیتوں کے حالات زندگی اور اپنے زمانے کی شخصیتوں کے حالات زندگی لکھنے کی مشکلات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

علامہ موصوف کو کسی ہم عصر نامور شخص کی (بشرطیکہ وہ کسی ہم عصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری

لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ انھیں اس سے زیادہ دشواری پیش آئی جو ہماری زبان

میں بہتر سے بہتر ”سوانح عمری“ لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انھوں نے اب تک انھیں

قدما کے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جن میں لوگ ایک زمانہ سے پوجتے آئے ہیں اور

جن کی تنقید دکنہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے۔ تاہم ابے ادبی صاف کیا علامہ

موصوف کی تالیفات اس ”پرفریب طریقہ سے پاک و صاف ہیں“ (مقدمات عبدالحی ص ۱۹۴)

مولانا نے عطیہ حکیم کے نام کے مولانا شبلی کے خطوط شائع کر کے بڑی زیادتی کی۔ آپ کو یہ معلوم تھا کہ۔

جیسا کہ خطوط اور مقدمے میں خود واضح ہے کہ مولانا شبلی اپنے ان تعلقات کو بالکل پرائیویٹ سمجھتے تھے اور

انھیں پردہ عام پر لانا نہیں چاہتے تھے لیکن پھر بھی مولانا عبدالحی صاحب نے ان خطوط کو شائع کر دیا اور اپنے

اوپر ان الفاظ کا اطلاق کر لیا جن کو شوق سندیلمی کے متعلق ”اصلاح سخن“ پر تبصرے کے دوران میں خود لکھا

”ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ عامی خطوط بغیر اجازت کے شائع کرتے“

(تنقیدات عبدالحی صفحہ ۹۷)

ملاوہ ازیں مقدمہ خطوط عطیہ حکیم میں جہاں مولانا شبلی کی بعض کمزوریوں کو نمایاں کرنے میں غلطی کی گئی ہے

وہاں مندرجہ ذیل ریاکارک بھی مولانا کی تنقید نگاری کے شایان شان نہیں۔

”مولانا شبلی جیسے اکل کمرے تنگ مزاج یہ لکھیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے اخلاص و محبت کی نسبت کہاں تک پہنچ گئی تھی“  
(مقدمات جلد چہم حصہ دوم صفحہ ۱۱۳)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے نوئی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ ان کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتب خانوں میں نظر آئیں گی۔“  
(مقدمات جلد چہم حصہ دوم صفحہ ۱۱۵)

مولانا عبدالحق کی شبلی کے ساتھ زیادتی کا احساس مولانا حالی کو بھی تھا جس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل خط سے ہوگا جو کہ انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا تھا۔

”جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان پر کھرکھل اسے (Critical Essay) لکھے جائیں ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک شخص کا نہ ہونے سے تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد میرے نہایت دوست ہیں..... مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں ان کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا نام چھوڑنے پر ہے۔ اس فروگزاشت کو سوائے اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا“  
(مکتوبات حالی صفحہ ۳۴)

مولانا شبلی کے معاملہ کو چھوڑ کر مولانا عبدالحق کی تنقیدات کے متعلق نہایت ہی وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی جانبداری اور تنگ نظری سے بالکل مبرا ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں عقل سلیم اور ذوق صحیح بہت ہی نمایاں ہوتا ہے جس پر بے جا طوفان فدااری اور تعصب کبھی فتح نہیں پاسکے۔ وہ غریبوں اور نقائص پر غیر جانبداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ لب و لہجہ میں بھی اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے مگر یہ کہ کسی کو کسی خاص معاملہ میں ان کی رائے سے اصولی اختلاف ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے لیکن وہ آپ کی تنقیدوں

کو اس یقین کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں کہ آپ اظہار رائے میں پوری احتیاط اور انصاف سے کام لیتے ہیں اور اصول تنقید کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔

۱۵) قوت تحریر۔ نقاد کے لئے جو صفات لازمی ہیں، ان میں سے ایک قدرت بیان اور تحریر کی دل نشینی ہے۔ کیونکہ اس قوت کے بغیر خیالات کی پوری قوت کا رفا ہو سکتی ہے اور نہ تحریر کو قبولِ مام کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحق کو زبان اور قلم پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کا ہر قول اور ہر تحریر جو ان کی زبان اور ان کے قلم سے نکلتی ہے سننے والے اور پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ یہ بھی ان کی تنقیدوں کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

مولانا عبدالحق صحیح معنوں میں مالی کے پیر و اور ان کے جانشین ہیں۔ انھوں نے جہاں تنقید لکھی کہ جس کی بنیاد مولانا حالی نے رکھی تھی پایہ تکمیل تک پہنچایا وہاں ان کی سادگی زبان کو کمالِ عروج تک پہنچانے اور اسے مقبولِ عام بنانے کا پورا پورا حتمی آپ ہی نے ادا کیا۔ آپ کی عبارت نہایت ہی صاف ستھری اور سلیجی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ انتہائی پیچیدہ مسائل کو بھی عام فہم اور پاکیزہ انداز میں صحت و صفائی کے ساتھ کھٹے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ضبط اور اعتدال غضب کا ہے جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ واقعات کی تفصیل اور خیالات کا جوہم ان کے قلم پر کبھی غالب نہیں آتا بلکہ وہ اس پر قابو پا کر ضبط تحریر میں لاتے ہیں ان کے خیالات بہت ہی سلیجے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے انھیں نہ نثری شاعری کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ فقرود کے روئے پر روئے چڑھاتے ہیں۔ ان کی تحریر کے الفاظ نہایت ہی سادہ و آسان ہوتے ہیں۔ اس لئے پڑھنے والا کبھی الفاظ کے پسندوں میں نہیں الجھتا بلکہ جو لفظ ان کے قلم سے نکلتا ہے وہ دماغ میں جگہ کرتا ہے اور معانی و مطالب فوراً دل میں اتر جاتے ہیں۔ اکثر اچھے اچھے انشاء پرداز جذبات سے مغلوب ہو کر بھٹک جاتے ہیں لیکن مولانا اس وقت تک کچھ نہیں کہتے جب تک کہ انھیں کسی بات کے کہنے یا خیال کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

مولانا عبدالحق کا اسلوب بیان علمی تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔ جو کہ خیالات سے کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ واقعات اور حقائق کو نہایت ہی سادہ زبان میں شگفتگی اور روانی

کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں اس لئے انہیں تشبیہ و استعاروں، تلمیح اور تمثیلوں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ دلفریب تحریروں میں پھنس کر مبالغہ آمیزی، شاعرانہ صنایع اور لفظ طرازیوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر علمی اور تنقیدی ہے۔ ان کی نثر میں گنگلی، تنانت اور حقیقت نگاری کی قوت ہے۔ جوہر ادیب کو میسر نہیں ہوتی اور یہی ان کا خاص جوہر ہے جس کی مثال مولانا کی علمیت کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہے۔ یہاں ان کی انشا پر دازی، زور بیان اور ادبیت کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو سادگی، زور بیان، طرز تحریر اور ادائے مطالب کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔

”عقل اور عشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے۔ مہابھارت اور جنگ جرم سے کہیں زیادہ ہولناک، یہ ایک مالگیر جنگ ہے جو ہر آن اور ہر ساعت اور ہر مقام پر پورے ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے اور نہ جذبات ہی جذبات۔ اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا۔ اور اگر صرف جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنون ہوتا۔ کاش وہ کچھ ہوتا ایک ہوتا لیکن عقل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں فتنے موجود ہیں عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف اور دونوں کے رستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں عقل اسے بے راہ روی سے روکتی ہے اور اعتدال کے حدود میں رکھنا چاہتی ہے۔ عشق جو ہر حد سے آزاد ہے اور جس کے ہاں اعتدال ایک بے معنی لفظ ہے اسے اس تنگنائے سے نکال کر محبت و خیر کے وسیع اقلیم میں لے جانا چاہتا ہے عقل اسے دنیا داری سکھاتی ہے اور دنیا میں سلیقے اور ہوشمندی سے رہنا چاہتی ہے عشق دنیا اور دنیا داری کو ٹھکراتا ہے اور اسے ایک ایسے عالم میں پہنچانا چاہتا ہے جہاں نترن بدن کی خبر ہے نہ ہوش و اس کا خیال، نہ اپنے کی فکر ہے نہ پرانے کی۔ انسان اس دور ہے میں اگر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور ایک عجیب کش مکش میں پڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا

کہے ان دونوں کی ضد میں یہ بے چارہ مفت میں پھنس جاتا ہے اور جب توفیق یاوری کرتی ہے تو ایسے نازک وقت میں بہت سارے آتی ہے اور اتنا تو اے جنگ کا ڈول ڈاکر لڑاکوؤں کو سمجھانا شروع کرتی ہے عشق پر معمولی پابندی و نصائح کا اثر کیا ہو سکتا ہے اس لئے وہ اسے اپنی مٹی مٹی باتوں سے ایسا لہجاتی ہے کہ وہ صلح پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صلح میں راہ متیم ہے۔ اس رستے کے چلنے والوں میں کبھی کبھی انسان کا مل نظر آ جاتے ہیں۔  
(مقدمہ، سب رس، صفحہ ۳۴)

اس ٹکڑے میں آپ نے عقل و عشق کا خوب محاکمہ کیا ہے، الفاظ کی سادگی چھوٹے چھوٹے جملے اور صفائی بیان قابلِ داد ہے۔ ہر خیال نہایت واضح ہے۔ الجھاؤ کا پتہ بھی نہیں۔ خیالات کا ایک دریا ہے جو اڑا چلا آ رہا ہے۔ سادگی اور سلاست۔ جملوں کا ربط اور خیالات کا تسلسل قابلِ غور چیزیں ہیں۔ تصنع اور آورو کا نام نہیں۔ پوری عبارت میں آمد کا رنگ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بلا تکلف جو لفظ زبان سے نکلا اسے حوالہ قلم کر دیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحق کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ موقع کے اعتبار سے پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں اگر سادگی اور زور بیان کا لطف اٹھانا ہو تو اس عبارت کو پڑھیے کس دردناک طریقہ پر دلی کے دور انحطاط کا نقشہ کھینچا ہے۔

”اُس وقت کی دلی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی۔ ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دیکھاری ہے۔ اور عزم تہیور اور بابر کی اولاد ان کے مشورہ فاق تحت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا۔ اداوار و انحطاط کے سامان جو چکے تھے۔ اور سیاہ روز وال گرد و پیش منڈلا رہا تھا۔ بادشاہ دستِ نگر اور امیرِ امراضِ مضمحل و پریشان تھے سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا۔ نادر کی بے پناہ تلواریں اور اس کے سپاہیوں کی ہولناک غارتگری نے دلی کو

نوج کھوٹ کر برباد کر دیا تھا ا بھی کچھ یہ سنبھلے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی۔ پھر مرہٹوں، جاٹوں، اردو سیلوں نے وہ اُچھ مچائی کہ رہی ہسی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی طوائف الملوک اور اتہری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ حالات تیرمبسا نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دیکھے ہی نہیں ان کے چہرے کے سہ اور ان انقلابات کی بدلت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ یہ دلی کے اقبال کی شام تھی جس کی سر اب تک طلوع نہیں ہوئی۔

مولانا عبدلحق بہاں سادگی زبان اور املوب بیان میں حالی کے پیرو ہیں وہاں ان کی انشا پر دازی میں شبلی کی رنگینی اور خلعتگی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے مولانا عبدلحق کی تحریروں میں مولانا حالی اور شبلی کے طرزوں کی ہم آہنگی عجب لطف دیتی ہے۔ جہاں کہیں موضوع سخن اجازت دیتا ہے ان کے بیان میں نہایت دلآویز جوش اور روانی پیدا ہو جاتی ہے اور زور قلم کا لطف آتا ہے جس کی مثالیں آپا کے ہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ٹیکور اور اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مدآج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور  
غزہ ہندوستان شاعر ٹیکور کے کلام سے کرتے ہیں۔ ٹیکور کے کلام میں بیشک پریم کا رس گھلا ہوا ہے  
اس کی محبت، مالگیری ہے۔ وہ تمام کائنات کو آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی نظیں پڑھ کر دل  
کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے ٹیکور  
کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن، ٹیکور کا جذبہ محبت گو  
بہت گہرا اور بے پناہ ہے لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف  
و جذبہ کے آپس سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا طمع نظر اگرچہ محدود ہے مگر زیادہ قوی۔  
زیادہ پر زور اور زیادہ شور انگیز ہے ٹیکور کے ہاں نازک سے نازک موقع پر بھی عقل کی پرچیاں  
اُس پاس ضرور نظر آتی ہو گئیاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بیجاری عقل  
اپنی آبرو بچانے کے لئے اچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں جذب اور کیفیت



کے ساتھ خود رائی اور یہاں وارنٹل ونگسنگی (تتمیدات جلد ترقی صفحہ ۷۹) مولوی صاحب کے زور بیان اور فصاحت و بلاغت کے مولانا مائی بھی قائل تھے چنانچہ ایک خط میں مولانا مائی جلد ترقی صاحب کو لکھتے ہیں۔

”آپ کا آرکھل جو علی گڑھ کالج کی شورش کے روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔

(مکتوبات مائی حصول صفحہ ۷۱)

عموماً مولانا کا طرز تحریر سنجیدہ اور سنجیدہ ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں مولانا نے اپنی شائستہ طرافت کے جوہر بھی دکھائے ہیں جس سے کہ آپ کی تحریریں دلوں کی دلپذیری بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ شوق سندیلوی مصنف اصلاح سخن کی ادبی شوخی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے استادوں کے خانگی خطوط شائع کئے اور ساتھ ہی اس فعل کی معافی بھی مانگی۔

طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور بھی ستم ہے۔ ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ

خانگی خطوط بلا اجازت کے شائع کرتے مگر شاگرد بھی تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے اس لئے اس

سے اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ (چند تتمیدات جلد ترقی صفحہ ۲۳)

اس تبصرے کے سلسلے میں شوق کے استادوں کی ان فرمائشوں کا ذکر کرتے ہوئے جو انھوں نے اپنے خطوط میں شاگرد سے کی تھیں۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

”ان سچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا شاگرد رشید یہ بھٹانڈا چوراہے پر پھوڑے گا؟

مصنف سرگزشت الفاظ نے اپنی یہ تحقیق پیش کی تھی کہ ”بادرچی اردو میں آکر بادرچی خانے میں

بقن صاف کرنے کی صنعت کے لئے مخصوص ہو گیا“ اس پر مولانا عرض کرتے ہیں۔

”ابھی تک تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے آئندہ ہی ہو جائے۔“

مولانا صحیح الفاظ کے باوجود بر محل استعمال کے گرسے خوب واقف ہیں۔ اس جگہ سے اس لفظ

کو ہٹا کر دوسرا لفظ رکھنا ممکن نہیں۔ بعض وقت وہ ہندی کا کوئی پرانا یا غریب لفظ اس طرح استعمال کر جاتے

ہیں اور وہ ایسا بر محل ہوتا ہے کہ کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں باجہا ملتی ہیں۔

”ان دونوں کی ضد میں یہ پہلے چارہ مفت میں پس جاتا ہے“ (سب رس صفحہ ۳۵)

”مفت“ جیسے غریب لفظ نے اس جملے میں جان ڈال دی ہے۔

مندرجہ ذیل جملے میں ”ڈول ڈالنے“ کا استعمال کس قدر بر محل ہے۔

”ہمت سلنے آتی ہے اور التوا کے جنگ کا ڈول ڈال کر لڑاکوؤں کو سہانا بھانا شروع کرتی

ہے“ (سب رس صفحہ ۳۵)

دیکھئے اس جملے میں ”جمل“ کے بر محل استعمال سے کتنی خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

”اتادی کا شوق بھی بڑا ہوتا ہے جمل میں آگئے اور برابر اصلا میں دیتے رہے“

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۱)

ذرا اس ٹکڑے کو پڑھئے اور دیکھئے کہ سادہ اور غریب الفاظ کس طرح اس عبارت کی جان بن گئے۔

”اوردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے لگانے نہیں

کھاتی۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے اس وقت اور اس وقت کی زبان میں بہت

بڑا مل ہے تاہم باغ و بہار ویسی ہی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی“

(مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۱۳)

غرضکہ مولانا عبدالحق کی تمام تنقیدیں بہت ہی موثر ہوتی ہیں۔ آسان، سلیس اور شستہ زبان، نہایت ہی

صاف و واضح اور بجا ہوا طرز تحریر ان کی تنقید نگاری کی جان ہے۔ ان کی شرکیہ بینگی، متانت اور حقیقت نگاری

علیت تحقیق اور تنقید کے لئے بہت موزوں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی تحریروں میں سادگی، زور بیان، سنجیدگی

اور کبھی کبھی ظرافت اس قدر دلآویز و نیشی ہے کہ ان کی تنقیدیں اکثر کتاب سے زیادہ پر لطف جاتی ہیں اور

دلچسپ افانوں کی طرح مزہ لے کر پڑھی جاتی ہیں

(باقی آئندہ)

اخلاق الرحمن صبا قدوائی بی۔ اے جامعہ

# تعلیم میں سیر کی اہمیت

سیر بھی تعلیم کا ایک جز ہے۔ بچوں کو چیزوں کے دیکھنے اور اس کے سمجھنے میں ایک گونہ آزادی ہوتی ہے۔ ہر چیز پر ان کی نظر آزادی سے پڑتی ہے۔ اس وقت وہ اپنی معلومات میں اس طرح اضافہ کرتے ہیں کہ جماعتی ڈسپلن کا دباؤ ان کی طبیعتوں پر نہیں ہوتا۔ اور صحیح طریقے پر بیٹھو، ٹیک نہ لگاؤ کیوں باتیں کر رہے ہو سنو اور قلم سے کیوں نہیں لکھتے وغیرہ احکامات کی بندش سے وہ اس وقت بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اور آپس کے سوالات اور جوابات سے ایک دوسرے کی تشفی کرنا چاہتے ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ پوچھتے ہی چلے جاتے ہیں اور اگر جوابات تشفی بخش نہیں ہوتے تو اساتذہ سے سوالات کرنے لگتے ہیں اور چیزوں کے متعلق سمجھتے ہیں سیر میں تعلیم کا مقصد ہو جاتی ہے۔

بچے مشاہدے اور سیروں کے درمیان جن قدر باتیں جذب کرتے ہیں اتنی کتابی تعلیم سے جذب نہیں کرتے سیر میں بچے زیادہ سے زیادہ سیکتے ہیں۔ اور کسی بات کے سمجھنے میں ان کی توجہ زیادہ عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ سیر کا نام ہی سن کر وہ دل ہی دل میں سینکڑوں منصوبے باندھ لیتے ہیں۔ اور اگر استاد انھیں ترتیب دینا چاہے تو ہر طالب علم اپنی سوچی ہوئی تجویزیں اور منصوبے دہرانے اور لکھوانے کے لئے بڑے جوش سے تیار نظر آتا ہے اور یہی تیاری اور آمادگی تعلیم دینے کے لئے نقطہ آمازن سکتی ہے۔ اور بن جاتی ہے۔

تھوڑی سی تحریک سے بورڈ پر ایک لمبی فہرست تیار ہو جاتی ہے بچے جو کچھ دیکھنا معلوم کرنا، اور سمجھنا چاہتے ہیں اسے بورڈ پر لکھوا دیتے ہیں۔ اب یہ استاد پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ان باتوں میں ان کی تشفی کر سکتا ہے کہاں تک اپنی معلومات کو ان کی تسلی کے کافی سمجھتا ہے وہ غلط کہاں تک تیار ہے اپنے ہنر اور ذہن کیوں سے ان کی اس تیاری کو کہاں تک برقرار رکھتا ہے اور جستہ جستہ مجوزہ باتیں انھیں بتلا دیتا ہے۔ اگر استاد بھی طرح تیاری کرے تو وہ بچوں کی آمادگی اور تیاری سے بہت زیادہ فائدہ

اٹھا سکتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں بچوں کو نہ صرف وہ باتیں سمجھا سکتا ہے جو وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں بلکہ سیر اور شاہدے کے بعد ان کے لئے مضمون نگاری کا اچھا موقع بھی فراہم کر سکتا ہے۔ مدرسوں میں عموماً بچوں سے خشک عنوانات پر مضامین لکھوائے جاتے ہیں جنہیں بچے شوق سے نہیں لکھتے ہیں وہ صرف استاد کا حکم بجالانے کے لئے لکھتے ہیں۔ لیکن سیر کی دلچسپیاں قلمبند کرانے سے بچے بغیر کسی بار اور کسی بیرونی مجبوری کے مضامین لکھتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں ایسی بات کی روئیدار لکھنی ہے جس میں وہ خود شریک ہیں۔ جس میں وہ ان کے ساتھی اور ان کا استاد مل کر دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ انہیں ایک با مقصد کام کی رپورٹ لکھنی ہے۔ گویا جان آپ سیر کے ذریعہ بچوں کو ان کی مجوزہ باتوں کے متعلق بتلاتے اور سکھاتے ہیں وہاں آپ ان میں مضامین لکھنے کا شوق بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

سیر اور شاہدوں کی تحریک اکثر بچوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اکثر موسم کی مناسبت سے تحریک پیدا ہوتی ہے کبھی کبھی سبقوں کے پڑھانے کے دوران میں خود بخود ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بچے سبقوں میں بیان کی ہوئی چیزوں کے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں۔ ویسے بھی سبقوں کو جاندار اور دلچسپ بنانے کے لئے مشاہدے اور سیروں کا موقع نکالتے رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ سیر اور شاہدے کے ذریعہ نہ صرف آپ اپنے سبقوں کو باہمی اور جاندار بنا دیتے ہیں بلکہ بچوں کی فطرت کو تسلی حاصل کرنے کا موقع دیتے ہیں ان میں جو نئی باتوں کے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اس کیلئے موقع فراہم کر دیتے ہیں گویا آپ بچوں کی نفیات اور تعلیم میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کر دیتے ہیں۔ سیر اور شاہدے کے ذریعہ آپ بچوں میں وسعت نظر پیدا کر دیتے ہیں چیزوں کو خاص ترتیب اور خاص دھجنگ سے دیکھنے کی عادت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف وقتی طور پر فائدہ ہوتا ہے بلکہ یہ یعنی نہ صرف مجوزہ سبق میں جان پیدا ہو جاتی ہے بلکہ دوسرے سبقوں کے لئے میدان تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے سمجھنے میں بچوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔ اور گذشتہ سیروں کی کڑیاں جبا آنے والے سبقوں میں کہیں کہیں ملتی ہیں تو بڑی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے بیدار سی اور غور سے تمام باتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سبقوں کی تکمیل اور ان کو دلچسپی سے شروع کرنے کے علاوہ عملی کاموں کے کرانے کے دوران میں بھی سیر اور شاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ امیری بنانا، کاغذ بنانا، کارڈ بورڈ سے چیزیں بنانا، سوت کا تاننا یا باغیچہ کا کام کرنا

جو کام بھی کیے کرتے ہوں ان کے سمجھنے اور سیر طریقے پر انجام دینے کے لئے ایسی جگہوں پر کچوں کو لیجا نا چاہئے جہاں یہ کام ہو رہے ہوں ایسا کرنے سے کبھی کبھی بچوں میں اپنے کام کے متعلق نئی قسم کی تحریک اور سوچ بوجھ پیدا ہونے لگتی ہے بچے نئے نئے ڈھنگ اور دوسرے کے تجربے کی روشنی میں اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کا رجحان نئی چیزیں بنانے کی طرف ہونے لگتا ہے۔ ان کی طبیعتیں ایجاد کی طرف مائل ہونے لگتی ہیں۔

ترہیت اور عادات کے سنوارنے کے اعتبار سے بھی سیر میں بہت مفید ہوتی ہیں۔ ایسے مدرسوں میں جہاں بچے بورڈنگ میں نہیں رہتے بلکہ آس پاس سے آتے ہیں ترہیت اور عادات کے منور نے کاہلور سجا ماہے اس لئے کہ پڑھائی لکھائی کے کاموں سے آخری ذمہ داری نہیں ملتی کہ اس کی طرف بھی توجہ کی جائے گوہر شیا راتا داس کا خیال رکھتے ہیں لیکن اس خیال سے کسی بڑے تجربہ کی امید نہیں کیجا سکتی لیکن اگر ایسے مدرسوں میں دستکاری اور حرفوں کی تعلیم کے انتظام کے ساتھ ساتھ بچوں کو وقتاً فوقتاً شاہرے اور سیر میں بھی لرائی جائیں تو عادات کے بننے اور سنورنے پر بھی خاطر خواہ اثر پڑتا ہے بچے علی کاموں سے دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کے بعد بھی اسکول آتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور اس طرح مدرس اور بچوں کا ساتھ مدرسہ کے اوقات کے بعد قائم رہتا ہے اور سیروں میں تو راتوں کو بھی مل بیٹھنے کا موقع مل آتا ہے۔ استاد اور شاگردوں کے ان تعلقات کے بعد مدرسے میں بچوں کی عادات و اطوار پر استاد کی نظر پڑتی رہتی ہے اور اتاد کے بہرہ دانہ و دیدہ امتیاز کرنے سے ان میں اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ بچوں کی کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر جماعت کی روزمرہ پڑھائی میں نظر نہیں پڑتی لیکن سیروں اور شاہروں کے دوران میں جب بچوں کو آزادی ملتی ہے تو وہ بیگانہ طور پر کھیلنے میں پھر استاد کو بھی معلوم ہونے لگتا ہے کہ بچے کی کونسی عادتیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سیر میں بچوں کو بہت سے ذمہ دار کام سپرد کئے جاتے ہیں وہ نہ صرف اپنی چیزوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں بلکہ دوسرے شکر و چیزوں کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ ذمہ داری کے کام کرانے سے ان میں ذمہ داری پیدا ہوتی ہے جب بچوں کو کوئی کام سپرد کیا جاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ انہیں اس کام کے لائق سمجھا گیا۔ ذمہ دار طور پر بچوں سے ذمہ داری کے کام نہ لیکر ہم ان میں یہ خیال پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے یا یہ کہ دوسرے کام کرنے کیلئے ہیں اور وہ صرف دیکھنے اور بڑھنے کے لئے ہیں کسی ایسی سیر میں آپ دیکھیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح مریض کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور دوسروں کے بستر قرعے سے رکھنے اور بازار سے چیزیں لا کر کانا پکانے کے کاموں میں کتنی مستعدی اور انہماک کا اظہار کرتے ہیں اگر آپ انہیں کسی کام کی ذمہ داری سپرد نہیں کرتے تو وہ بہت رنجیدہ ہوتے ہیں۔ بچے جہاں سیر کی دلچسپیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں وہاں وہ ذمہ داری کے کاموں میں بھی آتے ہی مستعد نظر آتے ہیں۔

سید احمد علی آزاد

# کسان

اُکسان اور مزدور ان دو الفاظ کے پیچھے موجود زمانے کی چند اہم تحریکات بھلکتی ہیں۔ کسان ایک غلام انسان ہے جس کی محنت اور جہاں فٹانی پر دنیا والوں کی زندگی کا دارِ مدار ہے۔ لیکن زمانہ اس محنت کی قدر نہیں کرتا۔ اس کی ذمہ داری حکومت اور رعایا دونوں کے کندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ میں نے ڈرامے میں انسانیت کے اس سچے لیکن مجبور خدمت گزار کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش قصہ کمافی نہیں۔ دکن میں مرہٹاؤں کی علاقے کے کسان کی زندگی کا چرہ بہ چہ۔ اصلی اور سیدھا سا روایت نام ہیں۔ پتہ نام و نشان فرضی [ (آجی)

## پہلا منظر

”سو دا“

ایک چوٹا سا گاؤں اپیل کے درختوں کی چھاؤں میں فتح چند مہاجن کا مکان، اینٹوں اور چونے سے بنا ہوا جس پر استر کا ری نہیں ہوئی ہے۔ گاؤں والیاں سانے پنگھٹ پر پانی بھر رہی ہیں مکان کے سانے والے کمرے میں گدے پر مہاجن بیٹھا ہوا ہے قریب ہی اس کا نشی شیش راؤ کھاتا لکھ رہا ہے فتح چند سکھارام کسان سے

فتح چند	ہوگئی ختم اب بٹی پترک	دیکھا وقت پر ادا ہوا ناز
سکھارام ہاتھ جوڑے	مجھ کو سب کچھ دیا ہے آپ ہی	سر پہ قائم رہے حضور کا راج
فتح چند	اس کی کرپٹ سب ادا ہوگا	ہاتھ ہے ایڈر کے میری لاج
	ایڈر تو ہے لیکن اسے مورکھ	ہم بھر دے پے رو نہیں سکتے
	ہم کو دیکھ بھو وقت پر پیس	ہم مصیبت کو سہ نہیں سکتے

(نشی شیش راؤ کو شواش پڑا میری آگے بڑھاتے ہوئے)

لے بٹی پترک۔ رہن رکھوانے کا دستاویز۔ لے شواش پڑا میری۔

شیش راؤ۔ اک اور نشان اپنے انگوٹھے کا لگا دے  
یہ نقش جو پترک پہ ہے کچھ ٹھیک نہیں ہے  
سکھا رام۔ کیوں اور انگوٹھا لیتے ہو جی سسر کار  
کیوں لوٹتے ہو ایک پریشان کو بیکار  
شیش راؤ۔ گھبرا نہیں یہ ایک ہی کا لڈ تو ہے تیسرا  
ہم تجھ کو کسی حال میں دھوکا نہیں دیں گے  
(سکھا رام شک کرتے ہوئے ایک اور نشان لگا دیتا ہے پھر سلام کر کے کپاس کے بیجوں کی پوٹلی جو ایک پردے  
پل پر لا ڈا اور واپس ہوتا ہے۔ راستہ میں اس کا ایک کان دوست را کا ملتا ہے وہ پوچھتا ہے)

راما۔ بھاؤ کنا، تو فتح چند سے کتنی ٹھیری؟

سکھا رام۔ دوسلے ادائی۔

راما۔ میں کیوں اتنی ادائی تری سنگی ٹھیری

سکھا رام۔ سچ کہتے ہو بھائی

راما۔ اب کے بارش کا بھی اندازہ کیا ہے تو نے؟

سکھا رام۔ ہے یہ بھگوان کے ہاتھ۔

راما۔ اور تحصیل کا باقی بھی دیا ہے تو نے؟

سکھا رام۔ یہ تو جیون کے ہے ساتھ

راما۔ آج اک بیل کی جوڑی مرے گھر آئی ہے

دونوں پیٹھے ہوئے ہر طرح نظر آتے ہیں

آٹھ گھنٹے محبت آرام سے جوتیں گے زمیں

اب کتنی مری کھیتوں میں ہوئی ہے پیدا

کھلا چھ پلے مرے کھیت سے بھرائے گی

سکھا رام۔ قیمت بھی ٹھیک بیل بھی اچھے، مگر بت

بات دوسو پہ بہت سوچ کے ٹھرائی ہے

کھلی دو دقت کی وہ چین سے کھا جاتے ہیں

دونوں کے سینک گھنٹوں میں کوئی عیب نہیں

جانے کیا بات ہے بھر بھی بہت سخت چلا

میں سمجھتا ہوں یہ جوڑی مرے کام آئے گی

دوسو چکانے کا بھی کوئی بندوبست ہے؟

لہ کاغذ دستا دیزلہ بھاؤ۔ بھائی، ماہن کان کو کھیت میں رکھ کر آیا تو انسا کے ذریعے اناج، بیج اور دوسرے قرض دیتا ہے

اس کی ادائی میں وہی اناج بیج وغیرہ کھا لیتا ہے۔ تھ پیٹے ہوئے۔ سدھائے ہوئے۔ تھ کافول کا مادہ۔

تھ بھرا ایک آلہ کپاس کے کھیت میں بارش ہونے کے بعد موڑے چلا کر ڈھیلے پھوڑتے جاتے ہیں پھر بھرا کر بیج

بکھیرے جاتے ہیں۔ تھ کھلا، یعنی اناج، فصل۔

راما۔ دو نمبر رکھانے کا وعدہ کیا ہے کل ہی راج ہنس جی سے سودا کیا ہے  
 سکھارام۔ بہت خال م ہے وہ بے رحم سلو ارے ناداں کبھی ایسا نہ کرنا  
 اسی سے ملے غنیمت ہو فتح چند مگر اس بات کا چرچا نہ کرنا  
 پیچھے سے ایک تلمیہ لافہ لگا جس نے دیہات سدا کا کام اپنے ذمے لیا ہے اور گاؤں والے اسے  
 ”جاٹھکا بابو“ کہہ کر بکارتے ہیں۔ جواب دیتا ہے۔

لڑکا۔ کرتا ہے اس شے سے دو ظالموں میں فرق بدخو، ترازو بھبی کتنا عجیب ہے!  
 پہلوں میں زندگی کے چھپاتا ہے موت کو بیشک بستر جہاں میں بڑا خوش نصیب ہے!  
 افلاس میں تمیز کی شکست بھی منٹ گئی کیوں اس کو یہ سزا نہ ملے یہ غریب ہے!  
 سکھارام۔ اسے دیکھو! ہمارے سامنے بھی پڑے لکھوں کی باتیں کر رہا ہے!  
 لڑکا۔ سچ کتا ہوں اور سچ میں دلوں کا سکھارام جو زور میں آجائے تو ہر چیز بھاڑے  
 یاں دل کے سندرے اُبلتا ہوا سیلا جو عقل کی تعمیر کو اک بل میں مٹا دے  
 اک بلبلا پانی کا نظرا تا ہے یاں مسلم اور سچ کی روانی اسے چٹکی میں اڑا دے  
 میں کتا ہوں سچ سچیں دنیا میں تباہی طوفان کو تو اور مچھلنے کی دعا دے

اچھ لوگ سکھارام کی کنیہ کے قریب پہنچتے ہیں جو گاؤں کے کنارے ایک نالے پر واقع ہے۔ چاروں طرف مٹی  
 کے مکان اور جھونپیاں زمین اونچی مٹی ایک طرف کھیتوں کا سلسلہ سکھارام کی بومی بھاگی اپنے روتے ہوئے  
 بچے کو جس کی عمر چھ ماہ کی ہے لے آتی ہے سکھارام اسے گویں لیکر مٹاتا ہے بھاگی بیلوں کے ساتھ چلی جاتی ہے

سکھارام۔ ہے یہ بھی مرے گھر کا طوفان راما اسے گود میں اپنی بھلا رہا ہوں  
 راما۔ شکر کر جس گوان کا اپنے ادا پہلا رکھوالی ہے تیرے کھیت کا  
 سکھارام۔ رام ہی پہچانتے ہیں ان کشمن اوقات کو میرا رکھوالی ہے یا اس کا رکھوالی ہوں میں  
 راما۔ کیا فکر ہے ماں دودھ پلاتی تو ہے اس کو  
 سکھارام۔ ہسکی ماں چھاتی سے اسکو دودھ دیتی ہو تو میں  
 حون اپنا سینچتا ہوں بال بچوں کے لئے  
 کنیہ کے اندر چلا جاتا ہے۔



## دوسرا منظر

”پریم“

(گھاؤں میں آدھی رات الگی الگی جانہنی چراغ ٹٹلاتے ہوئے۔ لوگوں کے کھانسنے بچوں کے رونے اور مال کی ووریوں کی آوازیں۔ جنگل میں کوہوں کا شور، کھیتوں میں کتوں کا بھونکنا سکھارام کی کٹیا ہیں ایک جہان لوکا صاف سترے لباس ہیں ایک ٹوٹی پھوٹی چوکی پر بیٹھا ہوا ہے سکھارام کی بیوی بھاگی اس کے قریب بیٹھی اس کے پاؤں دھو رہی ہے بھاگی کی عمر ہیں بائیس سال کی ہوگی۔ چہرے پر ملاحمت، سانولا رنگ، سیلی پکیلی سا ڈھی۔ لڑکا بھی اسی عمر کا ہے چندر نام۔ چندر لگنا تا ہے)

چندر۔ ساقول رانی تیرے کچھ پر چندر ماں بہار

سیلے بادل اُجلا چاند	جس کے آگے تارے ماند
آنکھیں سر کا ہوا اُجلا	جھکی مونگے کی اک مالا
بلیاں ہمیں سند رکھان	دل میں بیٹھا بانکا جوان
سوئی منزل بھری جوانی	چھوٹی کٹیا میں اک رانی

ساقول رانی تیرے کچھ پر چندر ماں بہار

بھاگی۔ ہم غریبوں پر کوئی رحم دکھانے آیا	یا بھرے گاؤں میں اک آگ لگانے آیا
یاں خوشی ہے نہ جوانی نہ ہے زور نہ لگنا	کون اُجڑے ہوئے کڑھوں کو بنانے آیا
ہاتھ ہر وقت جوشی میں بھرے بستے ہیں	ایک بلوان انہیں سینے سے لگانے آیا
ان لبوں پر جہیں سوکھے ہوئے تپوں کی طرح	مسکراہٹ کا نیا رنگ جس نے آیا
ایسے کانوں کو جو رونما ہی سنا کرتے ہیں	آس امید کا اک گیت سنانے آیا
چکیاں ہیں کے ہو جاتے ہیں شائے بیکا	ایسی ڈکھیا دی کو محنت سے بچانے کیا
بھاگی مری خواہش ہو کہ جنت میں آؤں	اس طرح مرے سامنے آہیں دھما کر
بھاگی یہ آہیں نہیں شوق کے ہیں ترانے	یہ جیون ہنسی ہے یہ دل کے ہیں گانے

ان آہوں کے اندری اندر ساکر کوئی آ رہا ہے محبت جتانے  
 چل آ رہی ہے گنا ٹوپ آندھی ہے اک گمان کی جھونپڑی سچا  
 اڑے جیسے گل میں کھلے کا بیوسا لگیں دل کی خاموشیاں تملانے  
 چلے جیسے تھاروٹے سے تیز بانی لگی آنکھ ہر وقت آنسو بہانے  
 خدا یا تجھے واسطہ کمیٹیوں کا نہ آئیں بھل عشق میں شاخسانے

(اتنے میں بچہ روتا ہے۔ بھاگی اسے تھپک کر ملا دیتی ہے)

چندر۔ جاں سخت کشاکش میں گنوا تی ہے شب درنو بھاگی تجھے اس گاؤں میں تکلیف نہیں ہے  
 بھاگی۔ ملتا ہے مجھے آپ کی الفت کا ہمارا کر پا کر دھجیر تو ہے مرنابھی گوارا  
 چندر۔ کیوں سا کرتی ہے رنج زندگی تو اس قدر اس سے بچ جانے کی شاید ایک بھی صورت نہیں؟  
 بھاگی۔ مرد، اولاد، زمیں، گاؤں، مولیشی، محنت اس سے چٹکارا کسی طرح بھی قسمت میں نہیں  
 (ایسے میں دوسری لکنا سے بھیکا جو سکھارام کا نوکر ہے بھاگی کے بیٹے کا زنج و چٹا ہے۔ بچے کو بخار  
 آ رہا ہے پھر پل پینے کے لئے آگ مانگتا ہے۔ بھاگی ایلوں کی آگ میں سے ایک چنگاری دیدیتی ہے چندر  
 پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے)

## تیسرا منظر

### صبح کی کاشت

بھاؤں کی سانی صبح شفق پھولی ہوئی پرندے چماتے ہوئے ٹھنڈی اور سات ہوائیں پل رہی ہیں۔  
 اور پہاڑوں پر کڑھل کے پھول کھلے ہوئے کمان ہیلوں کی جڑی لئے کندھے پر ٹھہر رکھے افق کی طرف  
 ادبچے ٹیلے سے نیچے آ رہا ہے)

شفق۔ قدم اٹھا کر زمیں کو ہے انتظار ترا بشر کی زلیت پر چھاپا ہے اختیار ترا  
 خوشامگاہ۔ تجلی ہے تیری سالم پر زہے نصیب ہے فطرت کو اعتبار ترا  
 کلی ملی میں جاں کی بھی ہر دوح تری ہے ذرہ ذرہ زمانے کا غم گسار ترا

ملے تھارو لاگائوں کی باؤں پر وہ حوض جس میں موت کا پانی جمع ہوتا اور کمیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔

تجھے خبر نہیں کیا چیز ہے تری ہستی  
آیا مالی بیو لاگشمن  
سنا زہ ہوا۔

جہاں کا سارا تماشا ہے رازدارِ ترا  
دیکھو پھیلا میرا دامن  
اب کے آیا کیا سا دن  
سن سن سن سن سن  
ہم تپوں کا منہ دھوئے ہیں  
نقدِ مٹی سب کھوئے ہیں  
سن سن سن سن سن  
ذرہ ذرہ جاگ رہا ہے  
رحمت کا طوفان اٹھا ہے  
سن سن سن سن سن  
زمینوں کا پروردگار آ رہا ہے  
زمین اس کے قدموں تلے ہنس رہی ہے  
امیروں کی ٹھکانائی دولت کو لیکر  
اٹھو تبرِ تعظیم اے خاکِ دالہ  
اوگے قدرت سے  
مگتی ہوئی کونپلیں۔

دہ اک رحمت کر دگار آ رہا ہے  
وہ آشفتمہ مرغزار آ رہا ہے  
غریبوں کے دل کی چار آ رہا ہے  
زانے کا اک دیندار آ رہا ہے  
جاگے قسمت سے  
اٹھے الفت سے

دہقان اپنا ہے دہقان اپنا ہے  
دل میں پہنائی رخ پر رعنائی  
سن اے سودائی ہم نے بھر پائی

دہقان اپنا ہے دہقان اپنا ہے

۱۵۔ یہ مجرد موقع کی ایک غمخوار اہم مثال، تر تالہ کے وزن پر قائم مگنی ہے جس کے ٹیلے کے بول ہیں  
ناصن و صنا ناصن و صنا ناقن تن نا ناصن و صنا اور عرض میں تقطیع ہوگی فعلن فعلن فعلن

۱۶۔ یہ مجرد دوسری مثال، حبیب تالہ کے وزن پر ہے جس کے بول ہیں۔ و صن نا۔ و صن و صنا نقن نا و صن و صنا  
اور تقطیع ہوگی۔ فعلن معقولن فعلن مغفولن۔

ہم ہیں بچپن میں      رنگیں دامن میں  
جاں ہے گلشن میں      گھر ہے آئین میں

دہقان اپنا ہے دہقان اپنا ہے  
ٹھنڈی خاموشی      رنگیں مدھوشی  
شیریں سے نوشی      دہی سرگوشی  
دہقان اپنا ہے دہقان اپنا ہے

بتا ہوا دریا۔ میں جینے کے سرا سجھا رہا ہوں      بھا جا رہا ہوں بھا جا رہا ہوں  
کنارے کھڑا ہے مرے ایک ہمتا      محبت کی تصویر دکھا رہا ہوں  
مبارک ہے یہ منظر غم گساری      نگاہوں پر امید برسا رہا ہوں  
ذرا غور سے دیکھ اسے زندگانی      میں قدرت کے دامن کو پھیلا رہا ہوں  
مرا منتظر ہے دل انگار کوئی      زمیں بوس ہوتا ہوا جا رہا ہوں  
جنگل کے اے یہی ہم ترے قدوں پر فدا کرتے ہیں      کامیابی تری فطرت کو عطا کرتے ہیں  
ہستے ہوئے بے طلب ہستی رنگیں سے گلے مل کر      ہم تری زلیست کی خاموش دعا کرتے ہیں  
پھول      دل میں گورکتے ہیں فطرت کے سریلے نغمے  
دیکھتے رہتے ہیں ہر وقت لگا کئے ہوئے اک

نغمہ زمین

عطا کرنا سکھایا ہے کسی کی میسر بانی نے      مجھے سینہ ٹشکانی پھر گوارا ہوتی جاتی ہے  
مرے پہلو میں سینچا جا رہا ہے خون آنا دی      تڑپتی زندگانی آشکارا ہوتی جاتی ہے  
لٹا ہے خزانہ کوئی اپنے دست و بازو کا      مری دولت زمانہ کا سا رہوتی جاتی ہے  
بہت شاداب ہیں زیرِ فلک بتیاں میری      مری ہستی محبت کا اشارا ہوتی جاتی ہے  
مجھے بھنسا ہے دردِ زندگی خود زندگانی نے      مری فطرت ہی فطرت کا نظارہ ہوتی جاتی ہے  
خوشا اے آبیائے غم، ہر اک گرہ دل کی      تری جھٹ کی گرمی زد و دلا ہوتی جاتی ہے

سکھارام ایک دخت کے نیچے کھڑے ہو کر آسمان پر نظر ڈالتا ہے بادلوں کو غور سے دیکھتا (ایک دھمکیکرا اپنے آپ کا گستاخ ہے)

کیا یہ بادل آج بھی پانی نہیں برساتے  
 بیج کیا گودھے کے میرے سوکھے ہی جائیں گے؟  
 کب تلک جگوان بجھو اس طرح ترسائیں گے؟  
 آج دن بھر کام کر کے رات گھوٹ لائیں گے  
 ہاں کیوں نہ ہو جہاں بخش میں فطرت کی عطیہ  
 ہر روز نئی شان سے جلتی ہیں ہوا میں  
 رنگیں ہیں مگر چرخ منور کی فضا میں  
 ہر رات کو افلاک پر تبسم نظر آتیں  
 مرتب و زحل آہنی تقسیم دکھائیں  
 احکام کی تعمیل ہو جس وقت وہ آئیں  
 آدم کو مبارک ہوں زمانے کی ادائیں

دنیا میں فقط کام کا دیوانہ ہے وہقان  
 ہمدردی انسان کا پیمانہ ہے وہقان  
 ہم جہاں ہیں ہیں فقط زور آزمائے کیلئے  
 یہ بھی ہیں حاکم کا بار غم اٹھانے کیلئے  
 جس جگہ انساں ہوا پناہ جھکانے کیلئے  
 (سکھارام انھیں ایک کوڑا لگا تا ہے۔ دونوں گردن ہلا کر تیز پلٹے گئے ہیں)

سکھارام رات بھر کیا کر رہا تھا موٹ گھسری ہو گئی  
 موٹا چلتا نہیں ہے اور کچھ بھی ہے سخت  
 بچے سب بھوکے ہیں میرے سیر ہے سارا جہاں  
 (بیلوں سی پل مرے روالیا، کستور یا پیل کھیت کو  
 دقت مرتے ہیں شب و روز کساں فاقہ کشی سے  
 مسکرا کر دنیا میں کبھی دقت پہ بادل نہیں آتے  
 کتا بھو چھائی ہے سیاہی غم ہستی کی زمیں پر  
 اک دقت معین پر ہو غور شدید روانہ  
 ہو چاند کی گردش میں نہ اک لمحہ کی تاخیر  
 آدم کے لئے ہو نہ مگر وقت مقرر  
 بیتابی ارمان کو تسکین ہے ان سے  
 (بیل موگرا کھینچتے ہوئے ایک دوسرے سے)

رومالیہ احساس ہے پستی کا نہ محنت پہ نظر ہے  
 کستور یہ کیا جانے کس حال میں رہتا ہے بہر حال  
 رومالیہ چارچہ پلے ہیں اس خدمت گذاری کا صلہ  
 کستور یہ آج سارے گاؤں والوں کی بھی ایسی ہی چال  
 ایسی بستی میں بھلا ہم کو ہوا زادی نصیب  
 (سکھارام انھیں ایک کوڑا لگا تا ہے۔ دونوں گردن ہلا کر تیز پلٹے گئے ہیں)

## چوتھا منظر نائش اور پولہ

گاؤں کے ایک کٹادہ حصے میں درختوں کے نیچے چند نئی جھڑیاں کان اور زمیندار بیلوں کی جوڑیاں  
 لہ یعنی باولی میں پانی نیچے اڑ گیا تھ موگرا تھ بھجھ یہ دونوں آئے ہیں تھ گودا یا تینن ایک سر کوئی کڑائی کا آہوتا ہے جس کے  
 اوپر کے حصہ میں بیج بھر کے زمین پر اسے چلایا جاتا ہے اور بیج زمین پر بکرتے جاتے ہیں تھ کان بیل کے اسی طرح نام رکھتے ہیں۔

طرح طرح سے سجا کر لارہے ہیں۔ ایک طرف پانچ چھ بنڈیاں کھلی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف ترکازیاں، پان  
 اناج، انبیاری سامان اور سستے میوؤں کا بازار لگا ہے۔ خرید و فروخت میں لوگ مصروف ہیں۔ سیر کرنے  
 والے آرہے ہیں، جارہے ہیں، ایک طرف دھگل میں کشتی کے کرتب دکھائے جارہے ہیں، اور صحرانورد  
 پیٹنے پالے میں مصروف ہیں اور گلاب جارہے ہیں سکھارام کا دوست راما اپنے بیلوں کی جوڑی نمائش میں  
 لے آیا ہے چلتے چلتے سکھارام پر اس کی نظر پڑتی ہے جو ایک درخت کے نیچے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا ہے

راما۔ اے سکھارام ترے بیلوں کی جوڑی ہے کہاں؟  
 سکھارام سر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر زانو پر رکھ لیتا ہے،

راما۔ خیر ہے آج کا دن، اور تراچہ رہے اس!  
 (سکھارام ہاتھ سے راما کو جانے کا اشارہ کرتا ہے)

راما۔ چل اٹھ میرے بیلوں کی جوڑی سنبھال۔

سکھارام۔ نہیں راما میں اس سے بنیزا رہوں۔

راما۔ (بیلوں کے گچھے دیتے ہوئے) یہ لے اور غم اپنے دل سے نکال

سکھارام۔ (منانے ہوئے اٹھ کر) چلو خیر اس پر بھی تیار ہوں۔

(اٹھتا ہے اور بیلوں کو ہانکتا ہے)

راما۔ کیا بات ہے کیوں ہل ترے ساتھ نہیں ہیں؟

سکھارام۔ معلوم نہیں؟ بچوں کو تھے دست ہوئے ہیں۔

راما۔ تو پھر اس نمائش میں آیا ہی کیوں؟

سکھارام۔ سمجھتا تھا شاید ہل جائے دل

(ایک کان دوڑتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے نمائش میں اس کی جوڑی بہت پسند کی جا رہی ہے۔ شاید

انعام مل جائے۔ بازو سے لوگ گاتے ہوئے گزرتے ہیں)

پانی برسا، کھیتی پھولی، خوش ہو ڈھونڈے رام

اب کے روٹی خوب کئے گی، گھر میں ہانڈی بھر کے پیگی

گھر کی عورت بچے بوڑھے پائیں گے آرام، خوش ہو ڈھونڈے رام

دسانے پولا ہوا ہے۔ جانوروں کو سیندی شراب پلائی جا رہی ہے۔ دبیزوں کے ساتھ لوگ شہیا  
ادھر ادھر دڑا رہے ہیں بعض لوگ ناپتے ہیں۔ ناپتے ناپتے ایک شخص نے تان لگائی،

بٹم جھم زم جھم بوندیں برسیں      گھر گھر گھر گھر بادل بولے  
نندی نالے بل تل بل تل      پنکھ پکھیر و بازو کھولے

لٹیا ہماری سب سے ابھی      بیل ہمارا سب پر بھاری  
آئیں ناہیں کو دیں مل کر      گوپی سنگ اب گر وھاری

ہوشو ہوشو اچھونا چھونا      ہوشو ہوشو! چھونا چھونا

(ایک منچلے نے سکھارام کے ایک دھول لگائی)

نکھو بھاؤ گاؤ ناچو، دیکھو کیسا نظارہ ہے      منہ اڑکا اپنا بنا کر غلوں میں منڈی کو جھکا کر  
کر کر کیوں کرتے ہو سجا کو؟ یہ بھی کیا پوچھا رہے

(سکھارام غصہ میں آکر اس شخص کو زمین پر دے مارتا اور گلا دباتا ہے بعض لوگ اس حرکت کو دیکھ کر ہنستے  
ہیں بعض لوگ اسے چھڑاتے ہیں سکھارام شکر باندھتے ہوئے رات سے کتا ہے)

سکھارام۔ نہ جانے چڑھائی ہے کتنی کی اتنے      کہ جاے سے باہر ہوا جا رہا ہے

وہاں اس شرابی کو ہنسنے کی سوچی      یہاں دم ہمارا گھٹا جا رہا ہے

راما۔ اسے بدھو، یہ پی کرنا چتا ہے      تری پیوٹ سے کیوں ناراضگی ہو

سکھارام۔ یہاں دل میں لگی ہے آگ ساری      اور اس کو ہم سے سوچی دل لگی ہے

راما۔ ہمارا جیون ہے کھیل سارا اسے زمانہ کھلا رہا ہو      کوئی دکھاتا ہے بچ اپنا کوئی غم اپنا بھلا رہا ہو

(گنگناہو) سکی اگر ہے جہاں میں جینا تو ہنسے والو نکھاسا تھڑنا      یہاں اسی کا بوجھ سارا جو زندگی کو بھرا رہا ہو

کوئی تنگن حسرت نکھاتا ہم بھاری کلفت سے سارا عالم      دہواں غم زندگی کا ہی ہم ہا یک بستی پہ چھا رہا ہو

فہمی میں آفت کو ٹال دیا خوشی سے انعام زیت لینا      قدم قدم پر نیاز زمانہ سبق یہ ہم کو سکھا رہا ہو

دگاؤں کے دو چار آوارہ آدمی سکھارام اور راماکو پینے پلانے کے لئے گھسیٹ لے جاتے ہیں سکھارام

پیتا ہے۔ اور راماکو روپی گیت گاتا ہے۔ ہمارا جیون ہے کھیل سارا، سکھارام کی آنکھوں سے آنسو پھرتے

لے پولا۔ بیلوں کو شراب پلا۔ تلے یہ گیت کھڑا مال میں بول میں۔ "وہاں کے ماتن نامے گئی نا، اور تقطیع ہے فعلن فعلن فعلن"

ہیں۔ لوگ اطراف سے جمع ہو جاتے ہیں۔ بچے ہتھتے ہیں۔ عورتیں روتی ہیں۔ مردانک پونچھتے ہیں۔ اتنے میں بھاگی دوڑتی ہوئی آتی ہے اور پلاتی ہے)

بھاگی۔ میرا بچہ مر گیا۔ اے لوگو! میرا بچہ مر گیا۔ سندر کا دم گلے میں آ رہا ہے ہائے ہائے!  
(سارے کان اس کے قریب آ جاتے ہیں سکھرام گھر کی طرف بھاگتا ہے)

ایک کسان۔ دو اکو بھی بچے کے پیسے نہیں تھے۔

دوسرا۔ جو پیسے بھی ہوں تو دو اکون دیوے

تیسرا۔ چلو سندر کی خبر لے تو لیں ہم۔

چوتھا۔ چلو اپنی بھاگی کو گھر لے چلیں ہم

(بھاگی روتی ہوئی کانوں کے ساتھ گھر کی طرف جاتی ہے۔ دو چار آدمی گاؤں کے دیر کے پاس دوڑتے ہیں۔ لوگ آنے کے بعد سکھرام کو دیکھتے ہیں وہ بچے کی لاش کو اٹھا کر باہر لا رہا ہے)

## پانچواں منظر

### ترغیب

(مغرب۔ ابابیل شفق آو دلفز میں تیر رہی ہیں۔ درختوں پر کوؤں اور میناؤں کا شور مچا ہوا ہے بھاگی کسیت سے واپس آکر جو بیڑی کے سلسلے برتن مانچ رہی ہے۔ اس کی لاکھوتی لڑکی سندر کا پنج سال کی ہے اُپلو سے کھیل رہی ہے۔ ایک بڑھیا سانے بیٹھی ہوئی چپکے چپکے باتیں کر رہی ہے)

بڑھیا۔ اچھی بھاگی! بھاگ تیرے جاگ جائیگے ضرور  
بھاگی۔ چاچی مراد دل آپ کو معلوم نہیں ہے  
جو اچھے ہیں کچھ ان کو خبر ہو نہیں سکتی  
چاہت کی مصیبت بھی بڑی ہوتی ہوتا  
بڑھیا۔ اسی تکلیف سے تجھ کو بچانا پاتے ہیں وہ  
بھاگی۔ کیاں پھر بھی میری مصہم بھی ساتھ رہتی ہے  
کماں بازوں کی اپنے گاؤں سے منہ موڑ کر چاچی

گنگھاروں کے مصلوں سے تو ٹوٹی جنوبیڑی اچھی  
یہ تھوٹھو کی میری سے غریب زندگی اچھی



خدا نے ہر کسی کو ایک حالت میں نہیں رکھا  
کسی کی رختیں اچھی کسی کی بے کسی اچھی  
بڑھیا - تو پھر کندول کہ تو گھر چھوڑ کر واں آ نہیں سکتی؟  
بھاگی۔ (اکتی ہوئی) میرا مطلب ہے چند رے کنا۔ کہ میں.....

(بڑھیا اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ بھاگی زمیندار کے لڑکے کی ناراضی سے کچھ خوف کئے لگتی ہے بڑھیا سیڑھی چند  
کے کمرے میں پہنچتی ہے۔ چند رے کے قریب اس کا ایک راز دار دوست سدھا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ بڑھیا کی  
زبان سے بھاگی کا سہم جواب سن کر۔

چندر۔ (ہنستے ہوئے) فوراً ہی ہے راہ پر آجائے گی

سدھا راہ پر آگے کی لیکن یہ جتا دیتا ہوں  
ایک ہنگامہ مچا دیں گے یہ دھقان سارے  
سر پر بھاگی کے زمانے کی مصیبت ہوگی  
ہوں گے رسول کے جہاں آپ کے ارام سارے

چندر۔ ہم سے منہ آئیں گے یہ ٹھکانوں کے محتاج کس؟

سدھا۔ شوخی رنگ زمانہ پر نظر ہے کہ نہیں؟  
آپ کو اپنے زمانے کی خبر ہے کہ نہیں؟  
چندر۔ آہستہ سے کیا کر گیا اپنی بیوی اور بچے چھوڑ کر  
جانتے ہیں آپ کھوٹلے نادار ہے

اس میں تاب ریت تک ٹھل سہا جاتی ہو سہا  
ایک ہل ہے ایک بیوی کنے کنے کا ہے  
وہ حرامی آنکھ تک مجھ سے ملا سکتا نہیں  
اور اگر ایسا ہوا بندو بھی یاں تیار ہے

سدھا۔ روشنی دن کی غنیمت ہے اسے چھوڑ کے آج  
بلے تماشا تم اندھیرے میں چلے جاتے ہو  
دل میں اس وقت تمہارے ہیں چھپے تین گناہ  
جس کو اک دوست سے کہتے ہوئے شرماتے ہو

ایک بھاگی سے ہے آزاد عیش کا خیال  
چند دن کے لئے بے چاری کو پھسلاتے ہو  
دوسرے تم کو سکھارام پر کچھ حسد نہیں  
ایک مظلوم کو بے رحمی سے ٹھکراتے ہو

تیسرے تم میں نہیں جو صلہ اسراف کا بھی  
نام سنتے ہو جو پیسے کا تو مرجھاتے ہوا  
چندر۔ دیکھی قدر تیز ہوئی بج گیا آپ نے خواہش ہے مرے دل کی یہی

سدھا۔ آہ پا مال میں مختار کے مجبور غریب  
رات دن رہتے ہیں ماحول کے محصور غریب  
حادثے ان کو تو ناشاد کئے دیتے ہیں  
اہل زراور بھی برباد کئے دیتے ہیں

مرد و غریب کے پیٹوں میں گرفتاریاں و  
ذمہ داری ہے ہیں پر کہ گنہ گار ہیں وہا

## چٹا منظر

### دھوپ

بادل ٹہنے سے دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ چاروں طرف جس۔ لوگ پسینے میں نہا رہے ہیں۔ ہرن درختوں کی  
چھاؤں میں کھڑے ہوئے ہانپ رہے ہیں۔ عورتیں بیچ کھیت میں کپاس کو نندوائی دے رہی ہیں سکھانام  
اور بھیکا وغیرہ کو تلپے اور ڈور سے چلا رہے ہیں،

دھوپ۔ اکان کو ننگے جسم کے ساتھ کام کرتا ہوا دیکھ کر

جلا کے خاک نہ کر دوں تو آفتاب نہیں!

مرے جلال سے اس شخص کو حجاب نہیں

جلانا کام ترا ہے بچانا کام مرا

روح عاطفت۔ ترے فروغ سے بڑھ کہ ہے احتشام

تڑپ رہے ہیں مرے دل میں برقی راشٹلے

دھوپ میں کارخانہ قدرت کی روح مضطربوں

مرے کمال سے ہوتے ہیں دلربا شٹلے

روح عاطفت میں تیری آگ کو دامن میں کھینچ لیتی ہوں

مگر کسان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

گرمی۔ جلس رہی ہے زیں سیری آہ سوزاں

وہ سخت جاں ہے کہ درد بگنیں ہوتا

وہ بے نوا ہے کہ ہل میں خطر اینیں

یہ اپنے فرض سے کیوں بچ نہیں ہوتا؟

میں پچھتی ہوں ہزاروں کی طرح اک دن بھی

مری مجبوریاں بن جاتی ہیں زنجیر پلاس کی

صدائے آفراسی کا مجرم ہے وہ غفلت سے خطا اس کی

ابھر سکتی ہے کیسے بے نیازی کی اداس کی

تقدیر لگا رکھا ہے میں نے خلق کی خدمت گزاری میں

آگ بن جائیں گی اک دن دیکھنا

صدائے { سردیاں بھولے ہوئے انسان کی

زلزلے لائیں گی اک دن دیکھنا

انقلاب { اس سکوں میں درد کی مجبوریاں

تخریب کے پہلو میں ہے تمہی کی دنیا

روحِ صداقت۔ بننے سے سوا بات بگوتی ہے جاں میں

ہم دیکھتے ہیں اصل میں تمہی کی دنیا

جوساز ہے وہ سوز ہے جو نور ہے وہ نار

تقدیر کی دنیا ہو کہ تدبیر کی دنیا

دونوں میں ہے اک نگلش قوت بیدار

آزاد کماں ہوتی ہے زنجیر کی دنیا؟

یاں علت و معلول کے میں طوق و سلاسل

لے نندوائی دنیا یعنی پودوں کے درمیان سے ہریالی بھالنا وغیرہ۔ تلے کو پے اور ڈور سے چلانا بھی اسی قسم کا ایک عمل ہے۔

حسین نطرت کی تابشوں میں، ہے چاند سورج کی دلربائی  
کمال اضداد سے خدائی، جلال بھی ہے جلال بھی ہے  
کسی کو معراج نور حاصل، کسی میں ادنیٰ کی روح شامل  
فلک کی آئینہ داریوں کو، عروج بھی ہے زوال بھی ہے  
ہے انقلاب آفریں زمانہ، بدلتا رہتا ہے یہ فسانہ  
زمین والوں کی قسمتوں میں، نشاط بھی ہے ملال بھی ہے  
کبھی وجود عدم کے اندر، کبھی وجود عدم کے باہر  
تصور ایزدنی کو حاصل، فسراق بھی ہے وصال بھی ہے

(نطرت کے اس خاموش سانسے میں: کسان اپنا پینہ پونچتا ہے پھر کپاس کے ایک پوے کی طرف دیکھو،

سکھا رام۔ منہ موڑ کر کسان سے شہروں میں جا بیگا  
کس طرح دیکھ بھال کے میں نے بڑا کیا  
ہر پھول پر کپاس کے آنکھیں نثار ہیں  
اس پر بھی دام کو دہی میں اس کے نہ آنکھیں  
پودا جواب دیتے، بنائے کوئی اور بگاڑے کوئی  
کمائے کوئی اور کھائے کوئی  
جو بیٹھا ہوا ہے وہ سرمایہ دار  
نہ زری کی مدد اور نہ محنت کی قدر

دوسرا پودا۔ مہوش ہے افلاس کی بے راہ روی میں  
محدود کشاکش کو سمجھتا ہے ضروری  
تیسرا پودا۔ احساس سے کیا فائدہ مجبور ہے دہقان  
کس طرح یہ جاں بیچ کے روٹی نہ کمائے  
چوتھا پودا۔ یہ دہوپ یہ گرمی کہ پریشان ہیں ہم بھی  
آندھی ہو کہ طوفان ہو بارش ہو کہ جاڑا  
لہ گوہی گوہام ملے جگام۔ آج فروخت ہونے کا زمانہ۔

دہقان کو اس جور کا احساس نہیں ہے  
اللہ کی طاقت کا اسے پاس نہیں ہے  
نا قدری انسان کا لگہ کر نہیں سکتا  
یہ زلیت کا حامل ہے یونہی مرنے لگتا  
اور اس پر یہ بے چارہ گمبان ہمارا  
کرتا ہے حفاظت کا یہ سامان ہمارا

چوتھا پودا جانتے ہیں کہ ضروری ہے شکم کا بھرنا اس پر بھی اہل جاں کو نہیں دستان کا درد  
یہ صدا آتی ہے دنیا کے تعامل سے مجھے آہ ہوتا نہیں انسان کو انسان کا درد  
(بھاگی سکھ رام کو روٹی کھانے کیلئے آواز دیتی ہے سکھ رام ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کے روٹی کھاتا ہے۔  
بھاگی سانسے بیٹھی رتی ہے کھانے کے بعد کھرپ لے کر تلاش کے درمیان بیٹھ جاتی اور نہربالی نکالتی ہے  
پھر باز دوا لی سے کہتی ہے

بھاگی۔ بیٹھا تو میں نے صاف کیا اونگھتی ہے تو  
عورت۔ کچھ تو میرے پیٹ میں ہے اور ہورہا ہے درد  
بھاگی۔ میرے بھی بچے ہوئے ہیں تجھے معلوم نہیں؟  
عورت۔ بچہ تو مر گیا ہے یہ زندہ ہے تیرا مرد  
بھاگی۔ کیوں کوستی ہے آج تو میرے ساگ کو؟  
عورت۔ بھاگی میں کوستی نہیں بھگوان ہیں گواہ  
بھاگی۔ خوش ہوں گی میں کہ میری طرح تیرے بھاگ ہوں  
عورت۔ تیری دعا قبول ہو میں دیکھتی ہوں راہ

## ساتواں منظر

### چٹوانی

دکپاس تیار ہو گئی ہے۔ بوڑھے مکمل کر اس میں کی سفید روٹی چاروں طرف نظر آئے گی ہے تاسوں کے دیکھ  
پانچ پانچ عورتیں رنگ رنگی ساڑیاں پہنے ہوئے پشت کے پیچھے اپنی اوڑنی کا تھپکا سا بنا کر واسنے ہاتھ  
سے دکپاس کا بوڑھا توڑتی اور منہ میں کرتی اور بائیں ہاتھ سے دکپاس کھال کر پیچھے تھیلے میں بھرتی جاتی ہیں  
یہ کام تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ پھر باری باری سے لگتی جاتی ہیں،

پھولوں کی ڈالی کا سولہا سنگھار۔ بھاگی کی گردن میں پھولوں کا ہار

لے تاس۔ پودوں کی قطار صف پٹا پودوں کا درمیانی حصہ زمین۔ صف چٹوانی۔ دکپاس کے بوڑھے توڑنا اور روٹی کھانا۔  
جنوے الگ کرنا صف یہ داد رہا ہے۔ اس کے بول ہیں۔ دھا دھا۔ دھا دھا۔

ریشم سی روئی کی انگیا بنائی، کٹن بھی سلائی ساری بھی لائی  
 مانی کے جو بن پہ آئی بہار  
 بیلوں کی جوڑی کو کھلتی کھلا کر، روئی پیکا کر، بچے سلا کر  
 جاتی ہوں اٹھلا کے نگری کے پار  
 کھیتوں میں پھولی ہے اچھی کپاس، ہنسیں میں نراس دینا ہے اس  
 ندوروں پہ روئی کا آیا بھار  
 (بھاگی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے)

## آٹھواں منظر

### لگان

ارکٹھ اور سونگھنی کے بعد مال بٹھا، شروع ہوا ہے۔ بنڈیاں آرہی ہیں۔ روئی کے تھیلے بھرے جا رہے  
 ہیں۔ چاروں طرف سفید روئیں بکھرے ہوئے ہیں۔ دو تین بنڈیاں تیار ہیں سکھارام کی جھونپڑی کے  
 سامنے درخت کے نیچے سن کی چار پائی پر گاؤں کے ٹیل پٹواری جو پورے مال کی بکاسی سے پیٹل ہی  
 آگئے ہیں بیٹھے ہوئے ہیں تحصیل کا چراسی قریب کھڑا ہوا بیڑی بی رہا ہے۔ سکھارام ایک طرف چلم کادم  
 مار رہا ہے۔ بھاگی دوسری طرف سندرا کو گودیں لئے کھڑی ہے۔

سکھارام۔ ہاں تو سرکار کو کتنے ادا کرنا ہے؟

بیٹیل۔ کچھ کو معلوم نہیں؟

سکھارام۔ اب کے اجرت بھی نکلتی مری دشوار ہوئی۔

پٹواری۔ سچ ہے مانی بھی تو سرکار نے پھرمائی ہے۔

تحصیل کا چراسی۔ بھاگ اچھے ہیں سکھارام ترے۔

بیٹیل۔ چلو چار آنے سے چکنا کریں گے۔

چراسی۔ ہمارا تو کچھ اس میں شامل نہیں ہے؟

لہ کٹن۔ ایک قسم کا مسوری دیا تھی کپڑا۔ کٹن اور سونگھنی۔ مال کی حفاظت اور کٹائی تلہ مال بہا یعنی فروخت کے لئے کھیت  
 سے بازار تک جانا۔

پٹواری۔ دو آنے کا دستور باقی ہے اب تک۔

سکھارام۔ بارہ آنے سے کمیت جوتا ہے دیکھئے کیا حساب جوتا ہے

پٹیل۔ کدیانا کہ ہے پچاس روپے

سکھارام۔ میرے پاس اتنے روپے اب تو نہیں ہیں سرکار

پٹیل۔ یہ تو ہر وقت کسانوں سے بنا کرتے ہیں۔

بھاگی۔ میرے دو بچوں کو تھے دست ہوئے تھے مالک

چیرا ہی۔ اس کا سرکار نے مانی ہی میں رکھا ہے لحاظ۔

سکھارام۔ ابھی مال کی کچھ نکاسی ہے باقی

پٹیل۔ اسی واسطے دیر سے مانگتے ہیں

سکھارام۔ میں اس وقت پچیس گنڈرا نسا ہوں

(اکرمیں بندے ہوئے دھوتی کے کپڑے سے روپے نکالتا ہے)

پٹیل۔ (بینک سے جاتے ہوئے) یہ سرکار ہے کوئی ساہو نہیں ہے

سکھارام۔ (باتھ جڑتے ہوئے) میں سمجھتا ہوں کہ سرکار میں ماں باپ مرے

چیرا ہی۔ پٹیل سے، اس کو قانون سمجھ میں کبھی آتا ہی نہیں

پٹیل۔ کمیت ہراج اگر ہو تو مزا آئے گا۔

(ٹٹنے کی کوشش کرتا ہے)

بھاگی۔ پٹیل تم سے یہ امید ہو نہیں سکتی۔

(تحصیل کے چیرا ہی کو دو مرغیاں اور کچھ انڈے دیتی ہے)

پٹیل۔ بھاگی اپنے گھمو کو ذرا سمجھاؤ۔

(بھاگی اپنے پاس سے پانچ روپے اور گلے کی پٹلیاں اتار کر دیتی ہے سکھارام سر جھکا لیتا ہے)

## نواں منظر

### شام

فصل ربیع جو اتریا ہے۔ بعض کھیتوں میں ابھی چیک نہیں بھری ہے۔ ایک آدھ سنتے کی دیر ہے شام کا وقت  
سوچ ڈوب رہا ہے۔ سکرام موٹ مار رہا ہے۔ یہ قبل از وقت ضعیف و ناتواں نظر آ رہا ہے۔ سر کے بال سفید  
ہو چلے ہیں۔ پشت اور شانوں کے پاس خم آ گیا ہے۔ بیلوں کو مہراتے ہوئے۔ ایک کان میں بھگی ہے دوسرا  
باتھ اسی پردا ہوا ہے)

دڑے چال بیلا ہے دھما دھما ہمارے میں پانی تین  
مول کا جوڑا ہائی آئی، اویسیں ہے چیک سا ہو کھوئی مال کرے گھسانا گئے بیک  
یہ کیا دایلا ہے گھانٹا ہے

بڑھا سہنا بیلوں کا ہے جیسے میری آس روپے ان کے کیسے میں اور کوڑی سیسے پاس  
دڑے چال بیلا ہے (پیر گھانٹا ہے)

(پزندول کا ایک غول اڑتا ہوا آتا ہے اور کھیت پر منڈلاتا ہے۔ پندے فہمے مانتے ہیں،)

ایک چڑیا۔ زمین کو پنا کے سبز چڑیا ہمارے معجزہ دکھایا

سیاہ مٹی کی خشکیوں پر ہری جوانی کا روپ آیا

دو ننھے ننھے حسین پتے ہوا کے جھوٹے میں جھوٹے ہیں

دو پیارے پیارے مکانی رہنے خوشی کی بارش کو بھولتے ہیں

اگر فلک پر ہیں ماہ و انجم زمین پر بھی ہیں پاندتارے

یہ کس کنواری نے ڈالو کو ہنسی مہی میں پھول مائے

دوسری چڑیا۔ حسین فطرت کا سبز جسلوہ دل و نظرمیں بسا ہوا ہے

لے سلاتے ہوئے موٹہ بیلوں کو ہانکے ہوئے تلے یہ مصرع گان کے اصل گیت کا ہے تلہ دھما دھما موٹ پر پیل پلنے کی جگہ ہر لکا

چوڑا بینی پننے تلے جھ بالی بینی گیسوں کے دانے جوابی تنے میں ہیں۔ تلہ اویسی بینی گیسوں کی بالی۔ کھ چیک دودھ جو

مکانی میں آتا ہے۔ شال کھوئی کرتا۔ دہن رکھنے سے قبل مال کا انداز کرنا۔ لہ۔ بڑھا سہنا یعنی موٹ کے بیلوں کا آگے پیچھے چلنا

ہاری آپا کا پیٹ شاید  
 پہلی چٹیا۔ آنکھ ہر وقت غذا ہی پہ جمی رہتی ہے  
 دوسری۔ رات دن نور ازل پستی نہیں  
 تیسری۔ بار کے پر لگے ہیں ہسم کو  
 ہوا میں گانے ہارے ناچیں  
 زمیں کے سب خوشنا پرندے  
 فضا کے سیال کی نمی میں  
 دوسری۔ لہو اور سنو، پیٹ بھروں کی یہ ترنگیں  
 جب چھاؤں نظر آنے لگی زرخ و زین کی  
 بے فکری ہستی بھی عجب چیز ہے ہدم  
 حب دل میں غم و رنج کا طوفان بہا ہو  
 چوتھی۔ خدا کی بستی میں کم لگا ہو  
 ازل کے آزا و گلشنوں میں  
 ملی ہے فطرت کو شادمانی  
 نظام قدرت کی بندشوں میں  
 دوسری۔ وہ وقت ضائع نہ کرو اور زمیں پر اترو  
 نعتیں فصل بہاراں کی اڑاتے جاؤ  
 دیکھو انسان نے بھی ہم پر عنایت کی ہے  
 لطف اٹھاؤ کہ بہت کم ہے شباب ہستی  
 (کان چان پر کھڑا ہوا گوہن ہار ہا ہے۔ روح صداقت مکراتی ہوئی آواز دیتی ہے)  
 روح صداقت۔ کس شان سے کھڑا ہے محافظ بنا ہوا  
 طعنہ زن کشاکش ہستی ہے کس قدر  
 کتنے پیام ایک اچھی نظر میں ہیں

بہت دنوں سے بھرا ہوا ہے  
 تجھ کو بس پیٹ ہی کی فکر لگی رہتی ہے  
 چاند تارے کھا کے میں جیتی نہیں!  
 ہارے بازو میں ہے جوانی  
 دکھائیں ہم رقص زندگانی  
 خوشی کی بنی بجا رہے ہیں  
 ستاروں کی طرح چھا رہے ہیں  
 کیا شان بڑھاتی ہیں زمانے کی ہوا کا!  
 سب لوگ سمجھنے لگے سایہ ہے ہما کا  
 ہر گھاس کی پتی میں گستاں نظر آئے  
 پھولوں بھر اگلہا ریا بیاں نظر آئے  
 نظر کی بربادیاں نہ رکھو  
 ہوس کی معیادیاں نہ رکھو  
 دلوں میں ناشادیاں نہ رکھو  
 اسیر آزادیاں نہ رکھو  
 کتنی رنگین غذاؤں سے بھری ہے دنیا  
 اور کتنے دھواک سبز پرپی ہے دنیا  
 سارے میدان کو شاداب بنا رکھا ہے  
 خشک مداحی آفاق میں کیا رکھا ہے  
 اس بادشاہ کشور ہستی کو بھی تو دیکھ  
 موسم زدہ شباب کے لب پر پی تو دیکھ  
 پروردگار زلیست کی یہ عاشقی تو دیکھ



عالم نواز کی نظر سیکسی تو دیکھو  
مردوش انتظار کی یہ بے ہمتی تو دیکھو  
کشت بہشتی کی نگہبان مبی جاتی ہے  
میری آہ تو اک انسان نبی جاتی ہے  
شکر خون ریزی دہقان ادا کرتے ہیں  
ہم بھی اک سنت انسان ادا کرتے ہیں۔

سر بہ کیتوں سے محفل کے رونے ہو  
صحن زمیں پہ ڈھونڈتا ہر زلیخا کا صلہ  
پانچوین چڑیہ حامل محنت دہقان کی شناخاں بنکر  
دل میں اک درو طلب لب پہ صد لئے اٹھنا  
دوسری ہاں بہن لوٹ کے ہم دولت دنیا کی بہار  
غیر کے خرمن امید کے مالک بن کر  
روح عاطفت (پندوں کو اترتا ہوا دیکھ کر)

روح غریب میں بھی قوت پرواز ہے کیا؟  
تیری دنیا سے نظم بھی خوش آواز ہے کیا؟  
رنگ بوگلش دہقان کی غار ہے کیا؟  
ایک کٹیا ہی میں تکلیف کا دبا ہے کیا؟  
پھر آ رہے ہیں مجھ کو ستانے کے واسطے  
تم تو بنے ہو گیت سنانے کے واسطے  
درد شکم کا شور مچانے کے واسطے  
اور زندگی ہے مجھ کو ستانے کے واسطے

کیوں چلے؟ تہیں کھیتوں میں پندے پاڑ  
گو بجے رہے ہیں خرمن پہ تضا کے نغمے  
آتے ہیں آڑتے ہوئے نوٹنے والے اس کے  
تیری سببی میں کہیں اور نہیں اس کو جگہ  
سکھا رام ہاڑتے ہوئے، مچلے ہوئے، چیتے ہوئے  
کیوں وٹے ہو خون پسینے کی محنتیں  
بگوان میرے تیرے پندے بھی آتے ہیں  
میں زندگی کو تمام رہا ہیں کسی طرح

ایک دخت کے پیچے سے کوئی دوشیزہ خاتون جدید آرائشوں کا مجسمہ نظر آتی ہے زرق برق لباس میں  
سانے آتی ہے ہاتھ میں کیمہ ہے سکھا رام دوشیزہ کو سلام کرتا ہے اس کے ساتھ جاگلا بابو، بھی ہے  
جاگلا بابو کیوں، جی نہ لگا شمر کی پر شور فضا میں  
دوشیزہ۔ ہاں صورت انسان کو پھر دور ہوئی میں  
تفریح کو اس دشت میں پھر پیچھے سرکار  
جنگل میں نظر آتا ہے اللہ کا دربار  
اکن کی تصویر لینے کے لئے کیمہ اٹھاتی ہے

جاگلا بابو۔ یہ سوچتا ہوں دیکھ کے اس جسم خیز کو  
دوشیزہ۔ اک جسم کے ڈھانچے کو نہیں لیتے ہیں  
شاید یہ غریب آپ کا انسان نہیں ہے  
فطرت کی عطا ہے سر و سامان نہیں ہے  
اچھے سے اس کی ایک جیلی دخت کی آڑ سے ہاتھ میں منڈولیں لئے ہوئے آتی ہے اور نکلتی ہے

سہیلی۔ نگہ پرستار رنگ ہستی خیال سو کر کین دوستی  
 غریب انساں کی فیتوں پر بڑی ان کی نظر کنا تنگ  
 حیات اک شان بے نیازی میں ارماں کی مریزا  
 کسی تڑپ میں فروغ کتنا کسی فنا میں اثر کنا تنگ  
 جہاں میں تہذیب کی شامیں بول چوک میں آ رہی ہیں  
 کسی کی محو میں بیکار یا رب روگی ان کو خبر کنا تنگ  
 کبھی ہے فطرت کا جواں بکھی ہے دنیا لغو راہ سے  
 الہی یہ سختیاں فلک کی بے گتیرا بشر کنا تنگ

## دسواں منظر ”سنگنی“

سکھارام جھونپڑی میں ہوار کی روٹی بیازہ می مرغ اور تھپا کھا رہا ہے چھاچھ کا ایک پیالہ سلنے اس کی  
 لڑکی سندرا گردن پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے بھاگی ایک طرف جاؤ دے رہی ہے  
 بھاگی۔ چلو جلدی کھاؤ کہ لوگ آ رہے ہیں۔

سکھارام۔ یہ مطلب ہے روٹی میں ثابت نکل جاؤں؟

بھاگی۔ ادھو مزاج تیز ہوا جا رہا ہے روز۔

سکھارام۔ میرا مزاج تیز کہ تیرا مزاج تیز؟

بھاگی۔ ہلانے لٹ صاحب کا دل پوچھے مزاج  
 بنگوائی ایک خرید کے لاؤں گی گاؤں سے

سکھارام۔ بھاگی کی بے دفاعی کا خیال کر کے اچھا ہے تیرے جھولنے کے کام آئے گی

بھاگی۔ میں زمیندار نہیں کوئی کہ جھولا جھولوں۔

سکھارام۔ جانتا ہوں تو زمیندار بنے گی اک دن

بھاگی۔ کون اس طرح زمیندار بنائے گا مجھے؟

سکھارام کیا خبر کون ہے وہ؟

روٹی ختم کر کے سیاہ مٹی کے بدن سے ہاتھ دھو رہا ہے۔ اتنے میں دو مرد اور دو عورتیں آتی ہیں

سندرا بلی کے ساتھ کھیلتی ہوئی دوسری جھونپڑی میں ہے

سکھارام۔ آؤ بیٹو کہ بہت دیر سے نکلتا ہوں راہ

ایک مرد۔ سکھو، مجھے ایک کعبیت ہم کو دینا پڑے گا۔

بھاگی۔ وہ دوسرے کے ہارے میں سوچا ہے تم نے؟

نئے جہیز کے طور پر کعبیت طلب کیا جا رہا ہے تلہ مرہن ہواری کا قاعدہ ہے کہ لڑکی والے لڑکے والوں سے رقم مانگتے ہیں

عورت۔ نہیں بھاگی اتنا تو ہم سے نہ ہوگا  
 بھاگی۔ تو لڑکی کو چھوٹا سا نمبر ہی لکھ دے۔  
 مرد۔ ہم بھی کسان تو بھی وہی۔ کچھ جیتی نہیں۔  
 سکھارام تمہارے دو سونہ کھیت میرا چلو پونہی سندر اکو لے لو۔  
 مرد۔ لے دے کے اس بھج کو فقط کھیت ہی سے ہے!  
 عورت۔ (سکھارام سے) فتح چند سے کتنے بیگئے بچائے؟  
 سکھارام۔ ہرے پاس اس وقت دو کھیت ہیں۔  
 بھاگی۔ جو پانی نہ پڑنے سے سوکے ہوئے ہیں۔  
 دوسری عورت۔ چلو جی یہاں کام کیسے بنے گا۔  
 بھاگی۔ یہ لڑکی کا سودا ہے یا اس زمین کا؟  
 پہلی عورت۔ جانتی ہو گاؤں میں لڑکوں کی بے کتنی کمی؟  
 سکھارام۔ چلو خیر اک کھیت میرا ہی بے حساب  
 میں جیتا رہوں گا تو مانگوں گا تم سے  
 بھاگی۔ اور کم از کم سو کا کر لو بند و بست  
 عورت۔ ذرا سندر اکو بھی آواز دینا۔  
 سکھارام اپنی پانچ سالہ لڑکی کو گود میں لئے ہوئے آتا ہے۔ ایک کے ماں باپ اپنے ساتھیوں کو دکھاتے  
 ہیں اور کچھ سوچ بچا رہتا ہے۔ پھر بات چلی ہو جاتی ہے اور سب لگ لٹک چلے جاتے ہیں۔ ایک عورت واپس آ کر  
 عورت۔ لگائے تو اپنے ہی گھر آ گئے گی نا؟

(سکھارام ہاں کا خاموش جواب دیتا ہے)

## گیارہواں منظر

### طوفان

رات کا وقت۔ زور کی آہنی ہلچل ہے۔ بادل گرجتے ہیں اور آن کی آن میں دھواں دھار بارش شروع

ہو جاتی ہے ہر سال ہمارے جل قہل ہو جاتا ہے جھونپڑیاں اڑ جاتی ہیں دو ایک درخت ٹوٹ کر گرے ہیں،  
 طوفان کی آواز کون کستا ہے کہ ناگاہ ہے آنا میرا  
 منتظر پہلے سے رہتا ہے زمانہ میرا  
 چشم ظاہر پہ گراں ہے مری میرا رومی  
 اہل دل خوب سمجھتے ہیں فسانہ میرا  
 زندگی دولت غم نذر کیا کرتی ہے  
 ڈھونڈتا ہے دل نگین ہمانہ میرا  
 پتے پتے سے عیاں ہو مری بتیائی دل  
 زخم کرتے ہوئے ہر چیز کو لے لیتا ہوں  
 قافلہ جوش سے ہوتا ہے روانہ میرا  
 طبع نازک پہ ہویا کوہ کی سنگینی پر  
 کبھی خالی نہیں جاتا ہے نشانہ میرا  
 زندگی میرے لئے چنیتی چلاتی ہے  
 موت کے ہاتھ سے بھرتا ہے خزانہ میرا  
 سکھارام طوفان دیکھ کر اپنے کھیتوں کا خیال کرتا ہے۔

وقت کی آواز گاؤں کو اکھیتوں کو، اور دہقان کو  
 آتی ہے، برق و باراں کو جگا اے چرخ پیر  
 لوٹ لے اے زندگیانی لوٹ لے  
 بے نواؤں کی جوانی لوٹ لے  
 تانہ رہ جائے کہیں تسہ لگا  
 اے بلائے آسمانی لوٹ لے  
 غمزدوں کو اور بھی نگین بنا  
 بیکسوں کی شادمانی لوٹ لے  
 (طوفان کو اور زور ہوتا ہے ہوا اور پانی کے سیلاب آنے لگتے ہیں،)

طوفان کی آواز دیکھی جو کبھی محفلِ یستابی دل  
 دوسری آواز برق بن جاتا ہے جب میری فضا بکھا چوہا  
 بجلیاں کوند گئیں میرے شبستانوں میں  
 سانس جب زور سے چلتی ہو شکیبائی کی  
 چاک پڑ جاتے ہیں بادل کے گریبانوں میں  
 وقت آتا ہے تو دنیا کی نظر سے بچ کر  
 زندگی جھوٹے لگتی ہے بیابانوں میں  
 آگ بھڑکتا ہوں میں ریت کے پیمانوں میں  
 کھٹکتا ہوں میں وودوازہ اسیر دل کا اگر  
 شور زنجیر کا ہو جاتا ہے زندانوں میں  
 شورش جاتا ہے دنیا کے پریشانوں میں  
 یاد رہتی ہے مری ریت کے ایوانوں میں  
 اس پہ بھی دہر کو ہر وقت طلب ہو مری

(باہر سے بیلوں کے پھارنے کی آواز آتی ہے سکھارام طوفان سے لڑتا ہوا اچھڑک جاتا ہے چھڑاڑ جانے سے  
 بیل صیگ رہے ہیں وہ بیل کو لکڑی جھونپڑی میں لے آتا ہے اور ان کا جسم خشک کرتا ہے۔ رات بھر میاں بیوی  
 کھڑے کھڑے گزار دیتے ہیں،)

## بارہواں منظر میلہ

گاؤں کے باہر چھوٹا سا میلہ مختلف قسم کے جوڑے پڑے ہوئے ہیں۔ بچے جوان، بوڑھے سب ہی بھول رہے ہیں۔ پاروں طرف دوکانیں، بندیاں، میوہ، ترکاری، نیاری سامان، کپڑوں اور کھلونوں کا بازار۔ بچے سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ ایک طرف دراری کے کتب، دوسری طرف ریچھ اور بندروں کا ناچ، میدان کا، طرف بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کسان، چاول و زرد دریا، پٹیل، پٹواری، سیٹھ، ساہو، اکثر جمع ہیں کھادی کے ایک کپڑے پر کمان کے بیچوں بیچ۔ کسان سدھاڑ لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف زرعتی آلے و زنت بیچ دھیرہ کی تاش کا موڑ کھڑا ہوا ہے۔ ایک شخص تخت پر کھڑا ہوا کچر دے رہا ہے۔ سکھ رام بھی بھاگی کو لئے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور تقریر کا یہ حصہ سنتا ہے۔

ضرورت ہے کہ تم اس وقت اپنے خوابے جاگو ذرا اچھی زراعت کے لئے سید اکرو سامان  
نئے آلات اور کھاد لو، سیکھو نئی باتیں کہ لہلہ لگیں فعلوں کو سارے کھیت اور پیدا  
نئے جتنے طریقے ہیں انھیں تم آزماؤ۔ تو ترقی کے چھپاؤ گے کہاں تک دل میں تم ارمات  
(سکھ رام وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ راستے میں اس کا دوست رام لٹا ہے)

راما۔ ارے چل کھانسیں گے کہ چلے ہیں سب ادھڑی۔

سکھ رام۔ اسے سن چکا ابھی میں۔

راما۔ کام کی باتیں ہیں وہ

سکھ رام۔ سب لوٹ کی گاتیں ہیں وہ

راما۔ خبر ہے ولایت کا بد چار ہے

سکھ رام۔ یہ سب کچھ صحیح ہے پوچھا رہے۔

استے میں دو تین دوشیز و کیمو لے ہوئے آتی ہے پیچے اس کی پہلی ہے۔ سکھ رام کو ساتھ چلے گا حکم دیتی ہے۔ سکھ رام کھانا ہے اور تھوڑی دیر سیٹ بڑکے بیٹھ جاتا ہے۔ سندھارا سے اٹھاتا ہے۔ دونوں مل کر دوشیزہ کے ساتھ ایک پنڈال میں جاتے ہیں جس پر "امداد باہمی" کا پورٹو لگا ہوا ہے۔ دوشیزہ

وہاں کے سکریٹری سے)

دو تیز و تارزو ہے مری کچھ قرض اسے بھی مل جائے  
سکریٹری کتنا قرض اس کو ملنا چاہئے؟

((دو تیز و سکرام کی طرف دیکھتی ہے))

سکرام ہے میرا جیون ہی قرض سارا حساب کی یاں خبر کسے ہے؟

دو تیز و دین سمجھتی ہوں اسے دو چار سو سی چاہئیں

سکرام ہے کہ پاتھاری، مگر چار سو میں مگر ایک نمبر بھی سا ہونہ دے گا

سکریٹری (دو تیز و سے) معاف فرمائیے اس وقت مرے کھاتے میں ہاپ کے واسطے دو سو کی رقم باقی ہے۔

(سکرام ہیکو کھا کر گر جاتا ہے)

## تیرہواں منظر

### موت

(تاریک رات۔ ندی کا کنارہ۔ سکرام کی لاش چٹا میں جل رہی ہے سناٹا اور ہوا کے ہلکے ہلکے سرو جھونکے۔

چٹا کی کڑی ٹپختی ہے۔ اوپر سایہ کیا ہوا درخت)

درخت۔ ختم ہو جلد تری آخری تکلیف حیات میرے پتے تڑے شعلوں کو بھاد دیتے ہیں

مدتوں روتی ہے دنیا کی فضا میں اس پر لوگ مظلوم کو مدفن میں سلا دیتے ہیں

آ رہی ہے عدم آباد سے آواز سنو آجے اپنے مکانوں میں چھا دیتے ہیں

خدمت دہر نے تو جھین لی ہستی تری آسمان والے تجھے دیکھنے کیا دیتے ہیں؟

(ہلکی چٹا کے قریب بال کھولے ہوئے آنسو بہا رہی ہے۔ شعلوں کی سرخیاں اس کے چہرے پر

چمکتی ہیں۔ درختوں کے نیچے چند ایک باتھ پیڑ سے لگائے بھاگی کو دیکھ رہا ہے)

محمد عبد القیوم خاں صاحب باقی

لکچرار ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ

# امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر

اندر سبحا کے مصنف اور اردو ڈرامے کے باوا آدم کی حیثیت سے امانت کا نام غیر معروف نہیں، شاعری میں لکھنویت کے ایک خاص عنصر یعنی رعایت لفظی کی ایجاد در و راج کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے، واسوخت گوئی میں وہ اپنے فن کے امام ہیں۔ ان کے ابتدائی عمر کے سلام اور بعد کے مرثیے بھی بے مزہ نہیں لیکن ان سب نے مل جل کر ان کے جوہر اصلی اور کمال حقیقی یعنی غزل گوئی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس وادی میں بھی وہ معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں لیکن موجودہ شاعری کے رنگ سے ان کے کلام کا مقابلہ کرنا یا ان کے کمالات کو اپنے زمانے کے اصول تنقید پر پرکھنا انصاف سے بعید ہے

نام آغا حسن تھا اور امانت تخلص میاں دلگیر نے تجویز کیا تھا جن کی مرثیہ گوئی کا آوازہ انہیں ودیہ کے نھور سے پہلے لکھنؤ میں گونج رہا تھا، اندر سبحا میں بعض اوقات انھوں نے اپنا تخلص اتنا دکھا ہے۔ اس کے متعلق ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”بعد اس کے اجاب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کجے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور نثر اور ٹھمریاں اور ہولیاں اور لبنت اور ساون اور دادے اور چنندہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں۔ بسبب اصرار ہر دوست و یار چاروں ماہ ۱۲۶۵ھ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبحا اس کا نام رکھا کہ آج تک خاص و عام کی زبان پر جاری ہے اور صد ہا مرتبہ چھپنے کی نوبت آئی مگر چونکہ اندر سبحا کا تصنیف کرنا خلاف شان و تہذیب جناب مغفور تھا اس لئے اس کتاب میں سے اپنا تخلص نکال لیا اور جا بجا بجائے تخلص لفظ استاد رکھ دیا مگر عاشقانہ غزلوں میں جو تخلص امانت تھا وہی باقی رکھا۔“

لہ۔ پیش لفظ از سید حسن لطافت ابن آغا حسن امانت بر دیوان امانت کی جہاز ان الفصاحت مطبوعہ مشائخ مطبع خاص نئی دہلی پر شاد لکھنؤ می محلہ نواز گنج۔

مگر نور الہی محمد مرصاحبان اس سے متفق نہیں ان کا بیان ہے:-

”اندر سب امانت میں امانت اور اتنا دو تخلص استعمال کئے گئے ہیں ہیں شک ہوا تھا کہ یہ ڈرامہ بھی کسی اشتراک عمل کا نتیجہ ہے مگر ذیل کے شعر نے شک دور کر دیا ہے

ہیں قیامت بت بے شرم و حیا کی باتیں      کبھی کتا ہے امانت کبھی استاد مجھے  
دو تخلص کیوں استعمال کئے گئے اس بارے میں یقینی طور پر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، ہاں تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعموم غزلوں میں امانت اور اس نظم میں جو ڈرامے سے تعلق رکھتی ہے اتنا دو تخلص کرتے تھے یہ خیال کہ وہ ڈرامے کو اپنے سے منسوب ہونا پسند نہیں کرتے تھے صریحاً غلط ہے کیونکہ اس میں استاد اور امانت کی ایک ہی ہستی ہونے کا اعلان ہے۔ ہمارے نزدیک بات یہ ہے کہ ریختہ کے شعرا جب فارسی میں یا ریختہ میں کچھ کہتے تھے تو کوئی دو تخلص کیا کرتے تھے، جیسے تیر و زشتاں تخلص ہیں نواب ضیا الدین دہلوی کے..... اسی طرح امانت نے اس صنف جدید کے لئے یہ نیا تخلص اختیار کیا ۱۱

ٹائٹل ساگر کے مصنفین نے جو شعر پیش کیا ہے وہ اندر سب میں نہیں بلکہ دیوان خزائن الفصاحت میں موجود

ہے۔ دوسرے سید حسن لطافت کے بیان سے اختلاف کرنے کی کوئی معقول دلیل ان مصنفین نے پیش نہیں کی ہے۔ یہاں تک دونوں متفق ہیں کہ غزلوں میں ان کا تخلص امانت ہی ہے۔ البتہ اندر سب میں ”جا بجا بجائے تخلص کے لفظ اتنا در کھدایا“

اکثر شعرائے ریختہ و فارسی نے دو زبانوں کے لئے دو مختلف تخلص بھی استعمال کئے ہیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اساتذہ وقت انگریزی اور عام پسند چیزوں کی طرف کبھی توجہ کرتے بھی تھے تو پہلے خواص و معذرت کر لیتے تھے کہ اگر وہ ان کے اصلی کمالات کو دیکھنا چاہیں تو مودب اصناف پر نظر ڈالیں۔ عرصہ تک، بحیرہ گو فارسی شاعر اپنی اردو شاعری کو ”محض تغنن طبع“ کے لئے کہتے تھے اور اس پر فخر کرنا مایوسا سمجھتے تھے

۱۱ خزائن الفصاحت مطبوعہ ۱۲۶۷ھ میں دوسرا مصرعوں ہے ”کبھی کتا ہے امانت مجھے استاد کبھی۔

۱۱ ٹائٹل ساگر کے دو باب از نور الہی محمد مرصاحبان صفحہ ۶۶-۶۷۔



یہ دوسری بات ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے باعثِ رنج و غم سمجھتے تھے وہی ان کی شہرت کا اکثر ذریعہ بنی غالب اپنی اردو شاعری کو مجموعہ بے رنگ، کنگیز گزر گئے ہیں حالانکہ ان کے اشعار اردو شعر و شاعری میں بے مثل ہیں یہی حال آہانت کا ہوا ہو گا۔ اندر بجا عوام اور اسباب کی فراکش سے لکھی گئی اور عوام نے ہی اس میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں کیا آج بھی ثقہ لوگ اسے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اس لئے کچھ بعید نہیں جو آہانت نے اپنا دامن بچانے کے لئے معذرت کے طور پر اپنا تخلص جگہ جگہ سے نکال کر آتا دکھانے کا کھدیا ہو۔

جیسا کہ مذکور ہوا اندر بجا کی شہرت نے ان کی غزل کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا۔ علاوہ ہر ابتدا ہی سے ان کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہو گئی کہ ان کا کلام صرف رعایتِ لفظی اور ضلعِ جگت تک محدود ہے یہی وجہ ہوئی کہ غزل گو شعراء کے تذکروں میں ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں ڈراموں کی تاریخ میں اندر بجا کے مصنف کی حیثیت سے ان کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ ان کے دیوانِ خزائن الفصاحت کے اس دیباچہ سے ماخوذ ہے جو ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت نے لکھا تھا۔ یہ دیوان جو ۱۲۵۷ھ میں خود شاعر کے صاحبزادے نے مرتب کیا یہی اس کا قدیم ترین اور مستند نسخہ ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ یہ متعدد بار شائع ہوا مثلاً نول کشور پریس میں لیکن کوئی نسخہ اس کی صحت کو نہیں پہنچتا۔ اس دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا حسن آہانت کا سلسلہ نسب میر آغا بن سید علی ابن سید محمد بنی ابن سید علی مشہدی سے ملتا ہے سید علی مشہدی جو ان کے مورثِ اعلیٰ تھے مشہد مقدس میں جناب امام علی ابن موسی الرضا کے روضہ مقدسہ کے کلید دار تھے۔ لکھنؤ میں ان کی اولاد کو شاید وہ کششِ کلیجہ کرائی ہو گی جو نواب سعادت خان برہان الملک نے مذہبِ اثنا عشریہ کی سرپرستی سے پیدا کر دی تھی۔ یہیں لکھنؤ میں آغا حسن پیدا ہوئے اور میں برس کے سن تک علومِ مردوجہ کی تحصیل کرتے رہے شاعری کی بزمِ بہار نئی نئی قائم ہوئی تھی یہی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے یہ زمانہ لکھنؤ میں مرثیہ کی اٹھان کا تھا چنانچہ انھوں نے بھی ابتدا میں چند سلام موزوں سکئے۔

اس وقت لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء میں میاں دلگیر کمال بول بالا تھا چنانچہ آغا حسن کے والد اس کو

شاعر کو ساتھ لے کر کہنے مشق استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے آغا حسن نے اپنے سلام سنانے جن کو سن کر دلگیت خوش ہوئے اور مستقبل کے متعلق امید افزا خیالات کا اظہار کیا اور امانت تخلص تجویز کیا

عرصے تک سلام گوئی کی مشق جاری رہی اور اس فن میں کچھ نام بھی پیدا کیا لیکن یکایک طبیعت غزل کی طرف متوجہ ہوئی اور جبند غزلین کہہ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح چاہی چونکہ میاں دلگیر کو غزل سے لگاؤ نہ تھا اس لئے خلوص کے ساتھ معذوری ظاہر کی البتہ وعدہ کیا کہ وہ ان کا تعارف اپنے بعض دوستوں سے کرا دیں گے جو اس فن میں کامل تھے۔ امانت نے قبول نہ کیا اور اس دن سے اپنی فکر کی راہبری پر بھروسہ کر کے غزل گوئی شروع کی اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی۔

اس عمر میں کسی بیاری سے ان کی زبان بند ہو گئی اور یکایک گویائی سے محروم ہو گئے، مہجور اور بذریعہ تحریر کلام کرنا اختیار کیا، اس بیکارمی اور خاموشی میں مشق سخن کا زیادہ موقع اور محنت سے شاعری کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا اکثر لوگ ان کے شاگرد ہوئے جن میں صاحب عالم ہایوں بخت بہادر بھی تھے۔ انہوں نے ہی پہلا دیوان بہ تلاش و محنت جمع اور مرتب کیا لیکن وہ دیوان کسی حادثہ میں تلف ہو گیا اور ساری محنت رائیگاں گئی پھر ایک سو دس بند کا ایک ماثقانہ واسوخت نظم کیا وہ ایک دوست نے مستعار مانگا اور پھر باوجود اصرار و تقاضے کے واپس نہیں کیا۔ چنانچہ پہلے دیوان کی طرح پہلا واسوخت بھی دریا برو ہوا۔ یہ کلام اگر موجود ہوتا تو معلوم ہوتا کہ جوانی میں کلام میں کیا انور اور رنگ تھا۔ اب جو سرمایہ موجود ہے وہ اس کے بعد کا ہے۔

۱۲۵۹ھ میں اپنا واسوخت نظم کیا جس میں تین سو سات بندیں اور باوجود اس کے کہ رعایت لفظی اور معاملہ بندی کے مضامین اس میں بہت ہیں یہ عرصہ تک بہت مقبول رہا۔

واسوخت کی تکمیل سے پہلے عبات عالیات کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور گویائی سے محروم ہونے کے باوجود کمر ہمت باندھ کر آٹھ کھڑے ہوئے ۱۲۶۱ھ میں زیارتِ مدینہ منورہ میں امام حسین علیہ السلام سے مشرف ہو کر لوٹے وہ زبان جو دس برس سے بند تھی کھل گئی، نامک ساگر کے مصنفین کا بیان ہے کہ کسی علاج نے یہ مرض دور کیا بعد حسن لطافت لکھتے ہیں کہ بئیر کسی علاج کے صرف زیارت کی برکت

سے یہ پیار می دور ہو گئی البتہ کچھ لکنت باقی رہ گئی جو مرتے دم تک ساتھ رہی۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر واسوخت کو مکمل کیا اور ۱۲۱۶ء میں ایک محفل مفتقد کی اور تمام امر اور دوسرا اور عامدین شہر کو جمع کر کے برسر نعل یہ واسوخت پڑھا اور دو کمال محفل کی اب اس واسوخت کو پڑھئے تو ثقاہت کا خون ہوتا نظر آتا ہے لیکن اس محفل میں واسوخت کے سننے نہانے سے اس عہد کی معاشرت اور لوگوں کے مذاق کا کیسا صاف پتہ چلتا ہے۔

۱۲۱۶ء میں عوام کی فرمائش سے اندر سبھا کا قصہ نظم کیا اس اندر سبھا کے لئے لکھنؤ میں فضا پہلے سے تیار تھی۔ اختر نگر کے عیش خانے اندر کی سبھا کے مکمل نمونے تھے امانت نے اندر سبھا لکھی تو گویا محفل سے متاثر ہو کر اس کی ترجمانی کی: ناک ساگر کے مصنفین اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۱۶ء بتاتے ہیں اور اس کے ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

زروئے وجد بول اٹھے یریزاد خلایق میں ہے دھوم اندر سبھا کی

اگر شعر میں دوسرے مصرع سے پورے عدد محفل نہیں ہوتے بلکہ وجد کے دو یعنی ویسے تمہیہ کے بعد ۱۲۱۶ء برآمد ہوتے ہیں لیکن خزان الفصاحت کے دیباچہ میں صاف ۱۲۱۵ء تحریر ہے اس سلسلہ کی عبارت یہ ہے:

”بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں غزل اور مثنوی

اور تراد و شعر نایب آ رہے لیاں ۱۰، البتہ ۱۰ رسون اور دادر سے اور چند ہوں تاکہ اس زبان

میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں بسبب اصرار ہر دوست دیار چار و ناچار

۱۲۱۵ء میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبھا اس کا نام رکھا

مکن ہے ۱۲۱۶ء قصہ کا سنہ اشاعت یا طباعت ہو جسے ناک ساگر کے مصنفین نے غلطی سے ۱۲۱۵ء تصنیف

سمجھ لیا۔ یہ حسن لطافت کی حیثیت شاہدینی کی ہے۔ ان کے اس بیان سے اختلاف کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اندر سبھا اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کی تفصیل اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

۱۲۱۶ء میں چند غزلیں مسدس خمس ترجیع بند ایک جامع کئے اور مجموعہ کا نام گلہ ستہ امانت رکھا۔ یہ مجموعہ

بھی متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ زیارت ثنات مالیات کے بعد پھر سلام گوئی اور مرثیہ کی طرف منوجہ ہوئے۔ جسے میں برس کے بن میں ترک کر چکے تھے۔ ہند کے حال کا ایک مرثیہ زرمیہ لکھا۔ اس صنف کے دہی موجود تھے۔ علاوہ اس کے اور مرثیہ بھی بکثرت تصنیف کئے۔ آخر عمر میں جب طبیعت رعایت لفظی سے سیر ہو گئی تو جیستان ممہ اور پہلی گوئی اختیار کی اور اس فن میں بھی داد کمال دی۔

۱۱۱۱ھ میں جادوی الادل کی اٹھامیسویں تاریخ کو بہ مارضہ استقار انتقال کیا، آغا باقر کے امام باڑے کے قریب مسافر خانے میں دفن ہوئے۔

ان کے مرنے کے بعد باقی ماندہ کلام کا مجموعہ ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت نے خزان الفصاحت کے نام سے مرتب کر کے شائع کرا دیا۔

غزل گوئی پر تبصرہ | تبصرہ سے پہلے ان کی ایک کل غزل دیکھئے جس سے ان کے عام انداز کا پتہ چلتا ہے۔

کان کی لوجا جو شملہ پر تو فاسگن ہو گیا	اک باز و کاشب گیسو میں روشن ہو گیا
خوگر قاتل گیا جس دم ہائے سر میں پیر	فرق کا کاسہ جاب آب آہن ہو گیا
عکس مرگاہن پڑ گیا جب ہمہ تاریک گاہ	یار کی شالی تبا پر کار سوزن ہو گیا
دست باغ جان کا جب کیا ہم نے خیال	آسمان نیلگوں اک برگ سوسن ہو گیا
عمر پر کانٹوں میں لوٹا نظروں کی یاد میں	جامہ ہستی مجھے صحرا کا دامن ہو گیا
قتل پر عشاق کے قاتل نے جو باندھی کر	تن دیال جان مجھے سر بار گردن ہو گیا
بتکدوں میں ہے جائے لالہ دل کا جواج	اسے صنم کوڑی کا ناقوس برہن ہو گیا
لے فلک محتاج ہم یکیش نہیں برسات کے	لگ کئی جس دم جھڑی اشکو کی سادن ہو گیا
ہو گیا جس رات میرا لالہ سوزاں بلند	آسمان کا مقمہ زیب میں روشن ہو گیا
منس دل کو کر دیا زلف حق انساں نے خاک	ابر جھٹ میرے حق میں برقی خوسن ہو گیا
سرنگیں مرگاہن کی الفت نے گھلایا کس تہ	جسم لاغر اپنا میل چشم سوزن ہو گیا
چنکیوں نے تیری لے رشک چن کیا گل کھائے	جو پڑ انیل اپنے تن پر برگ سوسن ہو گیا

ہوں و دزار و ناتواں کھا جو منہ اس زلف پر  
 حلقہ زنجیر گیسو طوق گردن ہو گیا  
 اس کے جاتے ہی اڑا کیا رات کو نفل کاٹو  
 شمع کا شعلہ چہرا رخ زیر و اس ہو گیا  
 رخنہ ہر شے میں پڑا تیرنگا و یار سے  
 پردہ دنیا کا نظر بازی سے چلن ہو گیا  
 باغ کے در پر کیا اس گل کا یا تنک انتلا  
 جسم خاک کی پرستہ دیو انگلشن ہو گیا  
 کر دیا تن کو ہائے کیا تبا نے بے فردغ  
 داغ سینہ کا چہرا رخ زیر و اس ہو گیا  
 ہٹ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پانچ  
 اک دو شاخہ نور کا نفل میں روشن ہو گیا  
 نشے سے ہوا روشن چراغ حسن یار  
 ساقیا پانی سے شب کو کار و غن ہو گیا  
 کر دیا حسن صنم نے سرخرو پیش منہود  
 دیکھی جب زلف سیاہ کالی کا دشمن ہو گیا

بتکڑ ہیں مہر کے بندہ جلے گی اپنی ہوا

گرا آنت رام وہ طفل برہن ہو گیا

اس غزل میں بعض خصوصیات ایسی ملتی ہیں جن میں لکھنؤ کے دبستان شاعری نے نفل رکھنے والے سب کے سب شریک ہیں مثلاً غزل کی طوالت، بھرتی کے مضامین، لکھنؤ کی فائیت، فارسی کی دلاویز ترائے کی کمی، خارجی مضامین کی زیادتی۔ داخلی اور روحانی مضامین کا فقدان، تصوف کا فقدان، رعایت لفظی کا شوق، معاملہ بندی، ابتذال اور رکاکت، ہیودہ اور مبتذل تشبیہات و استعارات کا استعمال، لیکن ان میں سے بعض اور ان کے علاوہ چند دیگر خصوصیات ایسی ہیں جو آنت کا خاص حصہ ہیں مثلاً رعایت لفظی و معنوی جو ضلع جگت کی حد سے جا ملی ہیں، محاورہ بندی، محاکات مختلف علمی و مذہبی اصطلاحات کا استعمال، ہندی الفاظ و محاورات، زبان کی بندش اور خوبی اور کمزوری کہیں طرز ادائیگی و جدت، اب ان کی تفصیل سنئے:-

غزل کی طوالت۔ اس امر کے دور قدیم میں طویل غزلیں بالعموم ناپید ہیں اور شاید اسی وجہ سے متقدمین شعرائے دہلی بھی مختصر غزلیں کہتے تھے۔ یوں تو غزل کے اشعار کی تعداد میں و مقرر نہیں تھی لیکن شاد نادر

ہی گیارہ اشارے زیادہ کی غزلیں لکھی جاتی تھیں۔ ان اشاروں میں بالعموم بہترین قافیہ صرف ہو جاتے تھے۔ شعرائے لکھنؤ جو ہمیشہ مضمون کے مقابلہ میں زبان پر جان دیتے تھے۔ اسے گناہ عظیم سمجھتے تھے کہ قافیوں کی ممکن فہرست میں سے کوئی قافیہ نظم ہونے سے رہ جائے چنانچہ اسی شوق میں طویل غزلیں لکھی جاتی تھیں اور جب ایک غزل سے سیری نہیں ہوتی تھی تو دو غزلہ اور سر غزلہ تک نوبت پہنچتی تھی اور ان میں اکثر ترکیب اور مبتذل قافیہ بھی نظم کرنا پڑتے تھے۔ آتش کی ایک بہت مشہور غزل ہے۔ اس کے دو شعر ہیں۔

بوسہ بازی سے مری ہوئی ہے اندا ان کو      منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا  
لب شیریں سے ترے چاشنی ممکن نہ ہوئی      دس سے شکر ہوئی شکر سے بتا سے پیدا  
چنانچہ آمنت کی مذکور الصدر غزل میں بھی جسے ہم نے بطور نمونہ پیش کیا ہے یہ عیب موجود ہے  
ایک قافیہ سوزن ہے جس کے لئے شاعر کو ایک عجیب خیال اور مضمون پیدا کرنا پڑا۔

سر مگرں مژگماں کی الفت نے لگلا یا اس قدر      جسم لاغرا پنا میل چشم سوزن ہو گیا  
اس قسم کی بعض اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک غزل ہے۔

دکھلائے خدا اس ستم ایجاد کی صورت      استاد ہیں ہم باغ میں شمشاد کی صورت

اس میں ۲۱ اشارے ہیں، قافیہ ایجاد، شمشاد، بیداد، صیاد، جلا، فراد، آباد، میاد، ہزاد، فلا، ولاد، آزاد وغیرہ جو بنی نظم ہوئے ہیں۔ لیکن دو قافیہ حداد اور نصادرہ گئے تھے۔ ان کو شاعریوں نظم کرنا سہیجہ ہے۔

دہ دشتی لاغر ہوں کہ ہرج ہو انے      زنجیر ہپانی بچے حداد کی صورت

پہلوں کے بچھپنے نچاکت سے دھوکے      ہے ہر گ گل نشتر نصاد کی صورت

دوسرا شعر تو کسی حد تک درگزر کے قابل ہے لیکن پہلے شعر کی آدھ کو سبب صاف نہیں کی جاسکتی ہائیک اور غزل ہے

دیکھی جو نہیں زلف سیاہ فام کی صورت      دلن تیرہ مری آنکھوں میں ہے شام کی صورت  
اس کا ایک شعر ہے۔

اغیار عصا پتے رہے باغ جہاں میں      توام میں رہا یار سے با دام کی صورت

بادام کی وجہ سے توام اور پتے کا مضمون کمالنا پڑا جس میں رعایت لفظی کے علاوہ ابتذال بھی پیدا ہو گیا۔

ایک اور غزل ہے چشم تو کی طرح، نظر کی طرح، گہر کی طرح۔ اسی میں ایک شعر ہے۔

نہات کی لب شیریں سے یار نے اکدن پڑی گروہ پر گروہ دل میں نے ٹکرو کی طرح

لب شیریں کی رعایت سے نہات اور نیشکر کا مضمون صرف نیشکر کا قافیہ نظم کرنے کی غرض سے بھکانا پڑا  
آمانت کے یہاں یہ عیب ہے لیکن کتر لکھنؤ کے معاصرین شعرا کے یہاں یہ اور بھی نمایاں ہے کیونکہ  
انہوں نے طویل غزلوں پر اکتفا نہ کر کے دو غزلے، سہ غزلے اور چار غزلے تک لکھے ہیں اس روش کا اثر انشا  
کے کلام پر دیکھئے۔ ایک ردین ہے غرض کیا۔ اس میں سلسل نو غزلیں لکھی ہیں۔

نسائیت۔ لکھنویت کا اہم ترین عنصر ہے، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد اور لکھنؤ نے مجاہدینوں  
کا مسکن بن کر یہاں کی تہذیب اور معاشرت میں نسائیت کا عنصر غالب بنا دیا۔ شاعری اور زندگی کو ایک  
دورے سے جدا کر کے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ شعرا کے لکھنؤ کے ہاں بالعموم نسائیت کا رنگ غالب  
ہے اور یہ ماحول کی ترجیحی کرتا ہے اس قسم کے مضامین آمانت کے ہاں بھی موجود ہیں۔

ڈو پٹہ اور ڈھکرا آب رواں کا سرخ انگیر پر دولایا باغ میں اس گلبدن نے خوب شبنم کو  
ڈو پٹہ آب رواں، انگیر، گلبدن اور شبنم کے مضامین خارجی تو ہیں ہی ان میں نسائیت بھی پائی جاتی  
ہے۔ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

خاسے پاؤں گلزار اس گل رعنا کے کیس ہیں بندھا ہے کاسنی رشیم کا گیندا بوٹ دھانی ہے  
سیہ موبات با جامہ گلابی چسپی نیمہ ڈو پٹہ سرخ، انگیر، سبز کرتی زعفرانی ہے  
لیکن یہ نہ سمجھے کہ ان کے ہاں صرف نسائیت ہے۔ شعرا کے متقدمین کی امر پرستی کا رنگ بھی موجود ہے۔  
دم زقارا اگر کہے سے شکم ہے سات گھنٹا کمر باندھا کر چھوڑ دیاں باتیں لڑکپن کی

خارجی مضامین۔ یہی خصوصیت دہلوی اور لکھنوی شاعری کا امتیاز دکھانے کے لئے بالعموم پیش کی جاتی  
ہے۔ اس کا یہ مطلب نکالنا غلط ہے کہ شعرا کے دہلی کے یہاں صرف داخلی اور جذباتی یا روحانی  
مضامین میں اور لکھنؤ والے صرف خارج واقعات یا متعلقات حسن تک محدود رہ گئے ہیں۔ یہ البتہ صحیح  
ہے کہ دہلی میں جذبات، زیادہ تڑاو متعلقات کتر موضوع شعرا نے گئے ہیں۔ لکھنؤ میں اس کے برخلاف

متعلقات زیادہ تر اور داخلی جذبات کمتر نظم ہوئے ہیں۔

پسینہ اس کے رخ آتشیں سے ہے جاری  
عجب تماشہ ہے آتش سے آب نکلا ہے  
بعض اوقات نہایت مضحکہ انگیز مضمون پیدا ہو گیا ہے

ہے حسن کے دریا میں جابوں کا یہ جھرمٹ  
چمپک کے ترے گال پہ ابھرے نہیں دانے  
اس غزل کا مطلع ہے۔

نخشب ہے نزاکت یہ مرے بُت کو خدا نے  
تار کشی دو پیڑ تو اوڑھے جو کرن ٹانگہ کے  
سرداجم کو تو نے سب کی نظروں سے آزار ہے  
روشن یہ ہے کہ سبز کنول میں ہے سبز شمع  
اے بحر حسن باندھے جوڑا اُٹھا کے بال  
کھلتی ہے مے شورش پہ ہر رنگ کی پوشاک  
افسان روپلی یار نے باؤں پہ ہے چنی  
دم رفتار اُلجھتے زلف میں موتی کے جھالے ہیں  
لیکن ان غزلوں کے باوجود آنت کا دامن خارجی مضامین کے سلسلے میں اس قدر آلودہ نہیں جتنا  
لکھنؤ کے بعض اور سرآمد شعرا کا مثلاً

یاد آتا ہے تو کیسا پھرتا ہوں گھبرا یا ہوا  
کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی  
کہاں یہ بال پیڑ پر سمجھ چوٹی کی پرچائیں  
بام پرنگے نہ آؤ تم شب مستاب میں  
حسرت اس کے ساتھ سونے کی ہے کیلاقت گلزار  
پینے کرتی اگر وہ حبالی کی  
چنپی رنگ اس کا اور جو بن وہ گدرا یا ہوا  
حباب کے جو گنارے کبھی حباب آیا (آتش)  
کہ ہے پشت شکم آمینہ شفاف کا جوڑا (انتفا)  
چاندنی پڑ جائے گی سیلاب بدن ہو جائیگا (دماج)  
ان دونوں میں مثل تصویر ہلائی ہو گیا (۱۰)  
کرے ہر حلقہ کو ستارا یسٹ (۱۱)



وہل کی شب بے کے دم عریاں کرینگے اسکوڑے ایک دن دا عقدہ ناف اوکمر ہو جائے گا  
 دانہ ہے اس پری کے حکم پرچہ جال ہو عالم ہاں کی جالی کی کرتی سپہ جال کا  
 معاملہ بندری :- معاملہ بندی یا وقوعہ بھکاری لکھنؤ سے مخصوص نہیں اس کی ابتدا اور انتہا ناری میں بہت پہلے  
 ہو چکی تھی۔ دہلی کے شعرائے متقدمین کے بیاں کتر اور شعرائے متاخرین کے ہاں اکثر وقوعہ بھکاری کے اشعار  
 موجود ہیں لکھنؤ میں اس فن کے امام میاں جرات تھے جن کے انداز بیان نے معاملہ بندی کے اشعار کو  
 ادبی مبتذل بنا دیا ہے چند مثالیں اس کے اندازے کے لئے کافی ہیں :-

کل واقف راز اپنے سے کھتا تھا وہ یہ بات جرات کے بیاں رات جو مہمان گئے ہم  
 کیا جانے کجنت لئے کیا ہم پہ کیا سحر جوبات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم  
 انشا فرماتے ہیں :-

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت  
 ناسخ کا ایک شعر ہے :-

رات کو چوری پیچھے پہونچا جو میں غل مچایا اس نے دوڑ دوچور ہے  
 تجربے لکھا ہے :-

دوپٹے کو آکے سے دوہرا ڈھو نمودار چپریں چھپانے سے حامل  
 فلیل کا ایک شعر ہے :-

منہ گال پہ رکھنے سے خفا ہوتے ہونا حق مس کرنے سے قرآن کی فضیلت نہیں جاتی  
 یہ مثالیں اس حرافات کی پوری کیفیت پیش کرنے سے قاصر ہیں جو معاملہ بندی کے پردے میں لکھنوی  
 شعرا کی یادگار ہے۔ اس حام میں اگر سب کے سب برہنہ ہو گئے بلکہ ان میں سے بعض اس حد سے  
 بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس منزل کی مثالیں بھی ذوق پر بارگزیں گی اس صنف میں امانت کے بھری  
 چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا سے گلے بکا جو پاؤں باتھ کمر سے محل گیا

اسی سلسلہ کی چند کرہاں اور دیکھئے۔

دو رشک آفتاب اگر جو لیٹا اپنے پہلوں  
عاشق کے کام آتی ہے اکثر یہ وصل میں  
شاع مہر کا عالم ہوا ہر تار بستر پر  
ہو کر برہنہ غسل کریں آپ گھساٹ پر  
غیروں کے منہیں دسے کے نہ کیجئے زباں خراب  
اکیلے گھر میں جو میں اس سے دوڑ کر لیٹا  
دریا میں ہوگی محرم آب رواں خراب  
شرم آتی ہو اگر تم کو نہاتے میرے ساتھ  
لکا کہ ہٹ درو دیوار دوام دیکھتے ہیں  
چھوڑوں آنکھوں پر ہیں شرکاء کی چلن آب میں  
تلخ بادام کا مرے منہ میں آتا ہے مرہ  
چشم کا بوسہ جو وہ ہو کے خدا دیتا ہے

معاملہ بندی کی داد آمنت نے اپنے واسوخت میں دل کھول کر دی ہے پوری رسوخت معاملہ بندی  
کے مضامین سے بھری ہوئی ہے لیکن اس عہد میں بہت مقبول تھا۔ ایسی صورت میں آمنت کا عیب  
جو صرف ماحول کا ترجمان تھا ماضی سے مقدار میں کم اور رنگ میں ہلکا ہے کچھ زیادہ قابل گرفت نہیں تھا۔  
ابتدال : اردو شاعری کے کسی دور میں بھی مبتذل خیالات اور مبتذل بیان کی ایسی مثالیں نہیں ملینگی  
جیسی لکھنؤ کے شعراء نے متقدمین کے کلام میں موجود ہیں بعض خاص اصناف مثلاً ہزل گوئی اور سنجی تو ان  
خیالات کے لیے مخصوص تھیں غزل میں بھی بالعموم ان مضامین کو شامل کر لیا گیا تھا۔ جو نگہی اس عہد کی  
معاشرت میں راہ پال گئی تھی وہی اس دور کے کلام میں بھلکسی ہے۔ اس میں ہر شاعر شریک ہے۔ البتہ بعض کے  
میان یہ رنگ بہت گہرا اور بعض کے یہاں نسبتاً ہلکا ہے۔ آمنت کے یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

شب وصال ہے دل کھول کر گلے لپیٹو  
خون اس کے ما سے سے جو عارض پہ پہ نکلا  
کساں کی شرم کہاں کا حجاب نکلا ہے  
باتہ آگئے میرے شب کو جو وہ اک بات نہ میں نے انکی سنی  
یا قوت کی چینی مہ کامل پہ جڑی ہے  
کیا انکی کو چست اس نے تو شب کو ہو گئے روشن  
کیا کیا ترپ لے کر ابھی بھلانت سے چھٹے قدم سے چھٹے  
کٹوری کے کنول میں شمع انگشت حنائی سے

(باقی آئندہ)

محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے (اینگلش)

# نفل

صبح کا وقت تھا۔ آفتاب کالال لال چہرہ دیکھ کر بیٹیوں، بھولوں کے منہ پر دھواں سا اٹھنے لگا تھا۔ سب سے  
 کانم اپنیل سوکھ چلا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بھی گرانی تھی چڑیاں چھپانا اور لڑنا چھوڑ کر چارہ چگنے کی فکر میں لگ گئی تھیں  
 بلوں کی سیٹیاں ہو چکی تھیں۔ مزدور دل کا ریوڑ سڑک سے گانا گنگنا تا، پکنا، ہانپتا، کھانتا، گالیاں بکتا جا چکا تھا۔  
 ہنتر مہترانیاں سڑکوں پر جھاڑو دے کر کوڑوں کا انبار جگہ جگہ لگا چکے تھے۔ گنگا گھاٹ پر تڑکے انسان کیسے  
 جانے والے اپنے کو پاک و صاف کر کے پلٹ رہے تھے جھنڈے جھنڈ غول کے غول ٹریکا لکڑے والا بچتے  
 بچن لگاتے کوئی بھگوان کے دیوان میں۔ کوئی بل پر سی کی یادیں، کوئی سودیاج کی فکر میں، کوئی اپنی ٹکڑائی  
 کے بچے چھانٹ کرتا ہوا کوئی اچکا ہر نوجوان عورت کو گھورتا ہوا۔ کتے مانگے بھی لاکا دکا چلنے لگے تھے۔ یکا بانوں  
 کی ٹخ، موٹا رویوں کی پوں پوں سانی دینے لگی تھی۔ اور بسوں اور لاریوں کے انجن گرائے جانے لگے  
 تھے۔ گویا رات کے سکوت کی چادر کو دن کا شور آہستہ آہستہ چاک کرتا جا رہا تھا۔ گر سکوت میں جو جھوٹا ہے وہ  
 اب تک باقی تھا۔ شہر کی ہر شے گویا بھی، تک خواب آلود انگڑائی میں تھی۔

سب دھونگی رات رہے سے جھاڑو دینے بھلا تھا۔ وہ اپنی ایک دردالی کو ٹھہری میں ٹھیکر ایک چلم نریل پی بچا  
 تھا۔ اب کوڑا گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کی بھنگن بھی میسپٹی کی لازم تھی وہ میاں سے پہلے ہی تھوڑا سا کام  
 کرنے چھوٹے بچوں کا خیال کیسے اپنی کالی کوٹھری میں واپس آگئی تھی۔ چار برس کا ڈولوا اب کارات کی بابو جی کی  
 دی ہوئی دال اور بجاجی سوکھی روٹیوں کے ساتھ اڑا چکا تھا۔ ڈیڑھ برس کی بسنتی البتہ اب تک ماں کی چھانی کر  
 کیڑے کی طرح لیٹی تھی، ادھر اس کا چار انگل کا پیٹ کسی طرح نہ بھر چکا تھا۔ ادھر بنگن کو کوڑا گھر جانے کی جلدی دراد وہ  
 چھڑایا اور وہ لگی ٹیں میں کر کے چیخنے۔

سب دھونے لگا۔ یہ چھو کر ہی جان کا روگ ہے، ایک نہ ایک دن تم کو بھلا اس کے چھوڑے گی۔  
 میکیا بولی گیا کریں آج اس گلوڑی کا کسی طرح پیٹ ہی نہیں بھر چکتا۔

”پریت کیسے بھرے دودھ بھی تو ہوتا“

”دودھ کیا خاک ہوگا جب پریت بھر کھانے ہی کو نہیں ملتا“

”تو اسے روٹی دوٹی چٹانا شروع کر دو“

”اس وقت تو وہ بھی نہیں، یہ دلو پا جی سب چٹ کر گیا“

”تو تم جانو اپنا کام میں تو چلا، نہیں تو وہ سالاجیدار کھا ہی جائے گا“

وہ اپنی کوٹھری سے نکلا۔ سامنے لوہے کا ٹھیلہ میلا ڈھونے والا کھڑا تھا۔ وہ ادھر بڑھا۔ نیچا ڈولا ایک

پٹی قمیص پہنے دوڑا۔

”دادا ہم بھی تلیں گے، دادا ہم بھی تلیں گے!“

سدھوانے ڈانٹا۔ ”ارے تو کہاں جائے گا پاجی! تیری ماں کو بھی جانا ہے، تو بہن کو تاکنا، ہم دونوں

ابھی پلٹ کر آتے ہیں“

بچہ چلا، ”نہیں ہم تلیں گے“، بنگن بھی باپ بیٹے کی جنگ دیکھنے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

اتنے میں سامنے سے ایک جوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک ہندوستانی صاحب اور ان کی سیم

صورت شکل میں کچھ ان غریبوں سے اچھے نہ تھے۔ ہاں مگر کپڑے سترے تھے۔ صاحب صبح کے گرم سوٹ

میں منہ میں چوٹ دبائے تھا۔ سیم ریشمی ساڑی پر ایک لال بیرہوٹی کے رنگ کی سوٹر کوٹ ڈالے تھی۔ ان کا

ننھا، بچہ ایک پریسٹیوٹر میں تھا۔ دونوں اسے ٹھیلے پلے آ رہے تھے۔ انھوں نے پاس آکر بنگنی، بنگن اور

ان کے بچوں پر ایک جھپکتی ہوئی نظر ڈالی۔ گویا نظر بھر کر دیکھنے میں آنکھوں کے گندہ ہو جانے کا ڈر تھا۔

سیم صاحبہ نے کہا، ”اوہ، یہ لوگ کتنا میلا ہے“ اور ایک ہلکی تھخیر آمیز نہی کے ساتھ ایک چھوٹے

سے سفید رومال سے ناک چھپالی۔

ڈولانے تالی بجا کر کہا، ”دادا ہم بھی گاڑی میں تلیں گے، ہم بھی گاڑی پر تلیں گے“

سدھوانے مسکرا کے میکیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک چمک پیدا ہوئی اور وہ کوٹھری کی کنڈی

چڑھا کے آکر برابر کھڑی ہو گئی۔ سدھوانے ڈولا کو اٹھا کر میلے والے ٹھیلے میں بٹھا دیا۔ میکیا نے بستنی کو

اس بچے کی گود میں دے دیا۔ پھر دونوں قدم سے قدم ملا تے ہوئے ٹھیلے کو ٹھیلے بالکل صاحب لوگوں کی طرح کوڑا گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

پاجی ڈولار استہ بھر اس طرح ٹخ ٹخ کر کے یوں مانگوں کی اور پوں پوں کر کے موٹر لاریوں کی نقل کرتا کہ دونوں کی خوشی سے باپیں کھل جاتی تھیں اور انھیں ایسا جان پڑتا جیسے وہ میلے کے ٹھیلے کو نہیں لے جا رہے ہیں۔ بلکہ پنڈتوں پر دہتوں کا بنایا ہوا پھولوں سے لڑا آسانی رتھ ہنگار رہے ہیں۔

(علی عباس صاحب مینی)

# غزل

جو ہو سکے تو اسی زندگی کو موت بنائیں  
 ہمیں بھی چاہئے اس وقت ہی میں کچھ شرمائیں  
 اُسے نہ با محبت تو کھیت ہی ہو جائیں  
 ہمیں کو دکھ لیں دیوانے تیرے دور نہ جائیں  
 کہ جا کے بھی جو نہ جائیں اور آ کے بھی جو نہ آئیں  
 کمانک اس نگہ لطف کے بھی دہو کہ کھائیں  
 اب ایسی باتوں میں کیا ہو کہ تو نہ دیکھائیں  
 نہ کھل سکا کہ یہ نچھہے ابھی سے کیوں مجھائیں  
 ابھی عناصر عالم کچھ اور پلٹے کھائیں  
 ارے وہ درد محبت ہسی تو کیا مر جائیں؟  
 یہ کیا ضرور کہ مست خرام شراب کھائیں  
 وہ دیکھتے ہیں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چرائیں  
 تری قسم تجھے اس یاد سے تو بھول ہی جائیں  
 یہ انجمن بھی ہوا ہو جو یہ کنول بچھ جائیں  
 ہمارا کام نہیں کچھ ہوا تو کیا اٹھ جائیں؟  
 کہ بن کے مست گھٹا کائنات پر چھ جائیں

تلاش مرگ میں کب تک فراق جان کمپائیں  
 غم فراق میں اس کی جنائیں کیوں یاد آئیں  
 یہ بوجھ لے کے اگر گر پڑیں تو بیٹھا پار  
 غرض کہ ہوش میں آنا پڑا محبت کو  
 دھمال و بھرا ایسوں کے بھی ٹھکانا کیا  
 معذرت کو چپا نا ہے دلہی کیسا ہے  
 یہ کیا کہا کہ نہ ہو عشق پھر بھی ملتے رہیں  
 ہماریں نہ کھلے دل خزاں ہے دور ابھی  
 زمانہ بدلا ہے اک آدھ کروٹوں کو کہیں  
 کچھ آدمی کو بھی مجھوریاں ہیں دنیا میں  
 قیامتیں نہ اٹھنا ابھی اک قیامت ہے  
 جہاں میں ترک تعلق نہیں ہے ترک رسوم  
 یہ حال زار تو کچھ احترام حسن نہیں  
 ازل سے رونق بزم جہاں ہیں قلب تپاں  
 یہ تیسری انجمن ناز بزم غیہ نہیں  
 دلوں کو بیٹھے بٹھائے یہ آج کیا سوچی

فروغ انجمن دہر مہرواہ بھی ہیں  
 کریں تو کس سے کریں راہ عشق کا شکوہ  
 لئے رہیں وہ زمانے میں اپنی بے شکوی  
 ”نگاہ اہل محبت تمام سو گندہ ست“  
 نثار جذب نہاں کیا یہ ہو نہیں سکتا  
 وہ بے نیاز ہیاں موت و زندگی کی ل  
 سے کا پھیر کہیں یا سنے کی ہل ساری  
 اے یہ آنکھوں ہی آنکھوں جلنے کیا کہ جا  
 معاملہ تو بوجھا نظر نہیں آتا  
 سوال غم کا بھی نکلا سوال منزل غم  
 خرام حسن کی کچھ آہیں تو ملتی ہیں  
 جو با فراغ ہیں کچھ پائیں زندگی کا مزہ  
 فضائے یاس بھی پہنچا سکتی ہے یہ آواز  
 فراق بعد کو ممکن ہے یہ بھی ہونہ سکے  
 جو آگ دل میں دبی ہو اسی کو کیوں اکسائیں  
 رکھیں تو پاؤں نہ نائیں چلیں تو منہ کی کھائیں  
 جو غم شناس نہیں وہ خوشی کو منہ نہ چڑھائیں  
 سکوت شوق کو بس دیکھ لے قسم کیا کھائیں  
 جنھیں نظر سے گزائیں وہی دلوں میں مائیں  
 دعا بجا کر ایسے میں کس کی خیر سنا میں  
 نگاہیں اپنی جگہ ہوں اور اس طرح پھر جائیں  
 نگاہ شوق ہے بیاک اس کو منہ نہ لگائیں  
 بنائیں عشق سے باتیں کہ حسن کو سمجھائیں  
 کہ حسرتیں تو دہی ہیں جو خاک میں مل جائیں  
 وہ آ رہے گا کسی روز ادھر بھی کیوں گھبرائیں  
 رُکے نہ سانس گران کے دم بھی ٹھٹھٹے جائیں  
 دل خواب کو یہ کون دے رہا ہے صدا میں  
 ابھی تو رو بھی لے کچھ نہیں بھی لے دو آئیں آئیں

ہو اے سرد چلی داستان غم توئی خستہ

فراق رہ گئی ہے تصویری رات اب سو جائیں

(فراق گورکھپوری)

لہ یہ مصرع حضرت امیر خسرو کا ہے۔

## مسلمان اور تجارت

مسلمانوں کے منزل کے اسباب و علل پر اس قدر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ان کا اس قدر تفصیلی تجزیہ کیا جا چکا ہے کہ بلابالغہ ایک انسان کو پینڈیا بن سکتی ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ اسباب زوال ملت کی اس لمبی فہرست میں بھی ”فقدان تجارت“ کی مکمل نظر نہیں آتی تجارت سے نفرت مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے زوال کی ایک معقول وجہ کو کم از کم تسلیم ہی کر لیں۔

تجارت سے اتنی بے رخی ممکن ہے کسی زمانہ میں ان کو زیب دیتی ہو مگر موجودہ سرمایہ دارانہ دور میں اس کو کسی صورت سے بھی جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ مسلمان دیکھ چکے ہیں کہ مغربی تعلیم کے متعلق ان کی ابتدائی نفرت اور بے رخی نے ان کو ہندوؤں کے مقابل میں پچاس برس پیچھے کر دیا اور باوجود سخت کوشش کے بھی ابھی تک وہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کے اس دوسرے اہم شعبے میں بھی وہ اسی طرح پیچھے رہیں؟ تجارتی لحاظ سے اب بھی وہ براہِ دران وطن سے بہت پیچھے ہیں۔ اور اگر فطرت اور لاپرواہی کی یہی رفتار رہی تو تھوڑے ہی عرصے میں ان کی پوزیشن صفر کے برابر ہو جائے گی۔

معاشی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت ہمیشہ سے انسان کا ایک اہم وسیلہ معاش رہا ہے اور آبادی کے ایک معتد بہ حصہ نے اسی ذریعہ سے روزی کمائی ہے۔ روزی کے علاوہ جو دوسرے فوائد تجارت کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اسی وجہ سے ترقی یافتہ قوموں نے ہمیشہ تجارت کو دوسرے وسائل معاش پر ترجیح دی ہے اور اس سلسلہ میں حوصلہ مند لوگوں نے دور دراز کے سفر بھی کئے ہیں۔ عرب تجارت ہی کی وجہ سے جزائر شرق الہند اور چین تک پہنچ گئے تھے۔ یورپی اقوام بھی آج اسی وجہ سے تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔

مشینوں کی ایجاد اور پیداوار بیانہ کبیر نے تجارت اور صنعت و حرفت کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اب دولت آفرینی مکمل طور پر تجارتی اور صنعتی آدمیوں کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔ اور دوسرے لوگ ان کے



دست نگر ہو گئے ہیں صنعت و تجارت کی اہمیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو گا کہ اب وہ سیاست پر بھی مادی ہو چکی ہے۔ حکومت کی تمام مشنری پر صنعتی اور تجارتی آدمیوں کا قبضہ ہے۔ ہر ملک کی سیاست کا محرک اب یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تجارتی و صنعتی فوائد حاصل کئے جائیں، خود غرض تو ہیں اس غرض کے لئے کمزور ممالک کو بھٹم کرنے سے بھی نہیں چکتیں۔ وہ کچے مال کے گودام اور تیار شدہ مال کی منڈیاں تلاش کرنے میں ہر جائز اور ناجائز ذریعہ استعمال کرتی ہیں پھر کمزور ممالک کی تعمیر ہی پر آپس میں جھگڑے اور لڑائیاں ہوتی ہیں۔ موجودہ جنگ بھی اسی وجہ سے برپا ہوئی ہے کہ لطف تو یہ ہے کہ جنگ بھی آج کل صنعت و تجارت کے زیر اثر ہے۔ موجودہ جنگ میں فوج سے زیادہ کارخانوں کی اور باہری سے زیادہ صنعتی استعداد اور تنظیم کی ضرورت ہے میدان جنگ میں لڑنے والی فوج کے کام سے زیادہ اہم کام سامان جنگ تیار کرنے والے کارخانوں کا ہے۔ دراصل جنگ کارخانوں میں لڑی جاتی ہے اور جفریقی اپنی صنعتی اور تجارتی استعداد کا زیادہ ثبوت دیکھا ہی کا سیلاب ہو گا۔ غرض سیاست اور ملکی دفاع جیسے اہم قومی شعبوں پر بھی تجارت اور صنعت کا قبضہ ہے۔

تجارت اور صنعت کی اس اہمیت کے جتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو یہ بتلایا جائے کہ اقتصادی، سیاسی اور دفاعی ترقی کے واسطے تجارت اور صنعت کی ترقی کس قدر ضروری ہے۔ یہ حقیقت کوئی نئی بھی بات نہیں کہ انگریز اپنی عظیم اثرات تجارت اور صنعت کو برقرار رکھنے کے واسطے ہندوستان کو سیاسی طور پر غلام بنائے ہوئے ہے اس لئے تمام حریت پسند اور آزادی خواہ لوگوں کا فر ہے کہ وہ استعمار اور شنشاہیت کی اس جڑ پر ضرب کاری لگائیں۔ شاہین خود بخود گر پڑیں گی۔ اگر پیداوار و لوٹ کے ان وسائل پر خیمیں برطانیہ ناجائز طور پر اپنے قبضہ میں کئے ہوئے ہے۔ ہندوستان کا بلن ہو جائے اور اپنی تجارت اور صنعت کے تمام ذریعے اس کے ہاتھ میں آجائیں تو سیاسی غلامی کا بڑی آسانی سے خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں نے اس گمراہ سمجھ لیا ہے اور پچھلی جنگ عظیم سے وہ برابر استقلال کے ساتھ اپنی تجارتی اور صنعتی تنظیم کو رہا نہیں پچھلی جنگ عظیم میں سلسلہ آمد و رفت دور آمد و برآمد ایک حد تک بند ہو گیا تھا۔ اس موقع سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ نئی نئی صنعتیں قائم کیں۔ کپڑا، فلاڈیمینٹ اور سن دھوپ کے کارخانے قائم کئے پھر بعد میں باقاعدہ اور مسلسل کمیشن کے ذریعے نہ صرف ان صنعتوں کو برقرار رکھا بلکہ او

ترقی دی۔ حکومت کی مالی پالیسی میں ترمیم کرائی اور اس سے بھی پورا پورا فائدہ حاصل کیا۔ صنعت و تجارت پر پورا قبضہ کر لیا۔ موجودہ جنگ نے صنعتی ترقی کا ایک اور موقعہ ہم پہنچایا ہے اور برادران وطن اس سے بھی کماحقہ فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور عجب نہیں کہ جنگ کے خاتمہ تک وہ ہندوستان کی صنعت و تجارت اور وسائل دولت پر مکمل طریقے سے قابض ہو جائیں۔

دل میں خود بخود یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس عظیم الشان صنعتی ترقی میں جو اس وقت ہندوستان میں ہو رہی ہے مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے جو اب میں یقیناً بایوسی ہوتی ہے سیاسی طور پر پچاس فیصدی حق مانگنے والی قوم صنعتی میدان میں پانچ فیصدی حصے پر بھی قابض نہیں ہے۔ درانحالیکہ صنعت و تجارت کی اہمیت سیاست سے بہت زیادہ ہے۔

اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہنا ہے تو انھیں اس اہم شعبہ زندگی کی طرف ضرور توجہ دینی ہوگی۔ دولت آفرینی کے ان وسائل میں جو اس وقت انگریزوں سے ہندو کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ انھیں بھی اپنے واجب حصہ پر قابض ہونا چاہئے۔ ورنہ جس طرح آج وہ انگریز کے غلام ہیں کل ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ سیاسی تحفظات کی کوئی اسکیم انھیں اقتصادی غلامی سے نہیں بچا سکے گی۔ اقتصادی غلامی سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وسائل دولت میں۔ اب ان کا شریک ہوا جائے۔ جاگیر داری اور تعلقہ داری کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اب وسائل دولت سمٹ کر تجارت اور صنعت میں آگئے ہیں مسلمانوں کو بھی اس میں پورا پورا حصہ لینا چاہئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ پیداوار دولت ان کے قبضہ میں آجائے گی اور وہ اقتصادی طور پر کسی کے پابند نہیں ہوں گے بلکہ سیاست اور ملکی دفاع میں بھی ان کی پوزیشن مضبوط ہوگی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تائثر کو کشش صرف نشستوں کی تعیین اور مراکزی ملازمتوں کے تناسب پر لگی ہوئی ہے۔ اور صنعتی اور تجارتی ترقی کے واسطے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی جا رہی ہے ضرورت ہے کہ اس طرف بھی کماحقہ توجہ صرف کی جائے۔ تاکہ صنعتی ترقی کی اس دوڑ میں مسلمان اپنی بہت قوم کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔ ورنہ بعد میں وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے اور پھر کسی طریقے سے بھی برابر نہیں ہونگے ترقی کی کوئی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ تنزل کے اسباب دریافت نہ کئے

ایں اور مچران کا علاج نہ تشخیص کر لیا جائے صنعتی اور تجارتی ترقی سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے اب تک اس میدان میں کیوں ترقی نہ کی تاکہ ان خرابیوں کو جو اس وقت تک اس ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں دور کیا جاسکے۔

صنعتی اور تجارتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اماؤں کی تجارت سے طبعی بے رحمی اور نفرت ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس کا تاریخی پس منظر پیش کرنا از حد ضروری ہے

مسلمان اس ملک میں حکمران کی حیثیت سے آئے۔ حاکمانہ اقتدار کی وجہ سے انھوں نے فوجی اور سرکاری ملازمتوں ہی کو اپنا پیشہ بنایا۔ فوجی خدمت کے صلے میں بڑی بڑی باگیاہیں اور زمینداریاں حاصل لیں اور اس طرح معاش کی طرف سے بالکل بے فکر ہو گئے صدیوں تک تجارت سے بے تعلقی نے ان کا مزاج بھی غیر تجارتی بنا دیا اور وہ تجارت سے نفرت تک کرنے لگے۔ حکومت چھین جانے کے باوجود ان کا غیر تجارتی مزاج بدستور قائم ہے اور وہ معمولی سی معمولی سرکاری ملازمت کو تجارت اور صنعت و حرفت پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت میں حاکمانہ اقتدار سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں نہیں بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت میں ہے۔ خود انگریزوں نے یہ اقتدار تجارت ہی کی بدولت حاصل کیا ہے اس لئے اگر مسلمان بھی اقتدار اور اختیار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لینی چاہتے ہیں تو انھیں بجائے لوکر بننے کے آقا بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔

موجودہ تعلیم نے بھی ان کے اس غلط خیال کی اصلاح نہ کی بلکہ ان کے غیر تجارتی مزاج کو اور بھی مستحکم کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر چٹا لکھا مسلمان سرکاری ملازمت کے لئے سرگرداں ہے۔ اور تیس تیس روپے کی نوکری کے واسطے ٹھوکر بن کھاتا پھرتا ہے لیکن اس اصلی کمی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ دیگہ برداران وطن نے تعلیم کے اس نقص کو بھی بہت جلد محسوس کر لیا اور اپنے نوجوانوں کو تجارتی تعلیم دلائی شروع کی تاکہ وہ تجارت و صنعت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں اور پھر اسی طرز پر اپنے کاروبار شروع کریں۔ تجارتی تعلیم ہی نے ان کو تجارتی تنظیم بھی سکھادی ہے اور انھوں نے بڑے بڑے ایوانہائے تجارت بنا کر اپنے مفید مطلب مراعات حاصل کی ہیں۔ مسلمانوں میں نہ تجارتی تعلیم ہی کا کوئی

خاطر خواہ انتظام ہے اور نہ تجارتی تنظیم ہی ہے۔

تجارتی پسندگی کی ایک اور وجہ مسلمانوں کا افلاس ہے۔ تجارت روپے سے چلتی ہے اور مسلمانوں کے پاس اسی چیز کی کمی ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو تجارتی ترقی کرنی ہے تو اس کمی کو دور کرنے کی بھی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے افلاس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی اور خرچ میں صحیح توازن نہیں رکھتے اور ہمیشہ خالی ہاتھ یا قرض دار رہتے ہیں پس اندازی کی عادت ان میں سرے سے نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی تجارت کو کامیاب طریقے سے نہیں چلا سکتے۔ خرچ کے زیادہ ہونے کی بڑی بڑی وجوہات ان کی لاپرواہی، فساد، لٹریچر اور فضول رسم و رواج ہیں۔ ضرورت ہے کہ کسی باقاعدہ کوشش کے ذریعہ مسلمانوں سے اسی بری عادت کو چھڑا جائے۔ ان کو پس اندازی کی عادت ڈلوانی جائے۔ ان رسم و رواج میں ترمیم کی جائے۔ جن پر ان کا روپیہ بالکل بیکار خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے پاس کچھ نہ کچھ وسیع ہو سکتا ہے جس سے وہ اپنی تجارت خواہ چھوٹے پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو شروع کر سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ تجارتی لحاظ سے مسلمانوں کو اگر اپنا واجب حصہ لینا ہے تو انھیں مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔

غیر تجارتی مزاج کو بدل کر تجارتی مزاج پیدا کیا جائے، تجارت کی اہمیت جتنا کہ اس سے رغبت دلائی جائے اور ایک اہم شعبہ زندگی کی طرف سے جو نفرت اور بے رخی ہے وہ دور کی جائے۔ اس مقصد کے واسطے ہندو نصائح کافی نہ ہوں گے بلکہ علی مثالیں دینی ہوں گی تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی شوق پیدا ہو۔

تجارتی تعلیم کا تسلی بخش انتظام کیا جائے تجارتی کالج کھولے جائیں، وظیفوں اور دوسرے ذرائع سے غریب طلباء کی امداد اور بہت افزائی کی جائے۔ تاکہ مسلمان نوجوان تجارت و صنعت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں اور پھر قوم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھا سکے۔

اردو میں تجارتی اور صنعتی مضامین کو متقل کیا جائے تاکہ وہ تجارتی لوگ بھی جو انگریزی نہیں جانتے

ملک کی ضروریات و وسائل اور دوسری تجارتی معلومات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

تجارتی تنظیم کی جائے مسلمانوں کے ایوانہائے تجارت قائم کئے جائیں مختلف کمیٹیوں اسمبلیوں اور کونسلوں میں اپنے نمائندے بھیجے جائیں تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کو فائدہ پہنچا سکیں۔

مسلمانوں کے اعلاس دور کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ وہ تجارت میں حصہ لے سکیں

ان کو پس اندازی کی عادت ڈلائی جائے۔ فضول رسم و رواج میں ترمیم کی جائے وغیرہ وغیرہ

ان تدابیر پر عمل کرنے کے لئے باقاعدہ اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے۔ صرف وقتی اور ہنگامی ہوش

کافی نہیں۔ کاش جتنی توجہ ملازمین کے تناسب پر صرف کی جا رہی ہے اگر اتنی توجہ تجارتی ترقی پر بھی صرف کی جائے تو مسلمانوں کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے۔

اس تمام گد و دو میں ہیں ایک بات فراموش نہیں کرنی چاہئے وہ یہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور ایک

مسلحہ نظام زندگی اور ضابطہ حیات رکھتے ہیں۔ ہمارا ایک نظام معیشت بھی ہے جو ہمارے عقیدے کے

مطابق بہترین نظام ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری تمام تجارتی و صنعتی ترقی اس اسلامی نظام

معیشت کے ماتحت ہو۔ امیر غریب اور سرمایہ و محنت کے درمیان جو ناقابل مہور علیج یورپ کے معاشی نظام

نے پیدا کر دی ہے۔ اس سے ہمیں بچنا چاہئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم میں طبقہ دارانہ احساس پیدا

نہ ہو۔ ہمارے امیروں میں سرمایہ دارانہ اور غریبوں میں شکست خوردہ ذہنیت پیدا نہ ہو۔ ہماری تمام تجارتی

ترقی کا مقصد یہی ہو کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو۔ نہ یہ کہ دولت اور وسائل دولت صرف

پنڈا شخص کے ہاتھوں میں سمٹ کر آجائے۔ ہمیں اس عمل اور رد عمل سے بچنا چاہئے جس نے پہلے سرمایہ

دارانہ نظام اور پھر اشتراکیت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمارا راستہ دونوں کے مین بین ہے۔

محمد منصور صاحب بی کام (فائل)

## تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سُریلیے بول۔ مجموعہ کلام عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم ۲۲۸ صفحے قیمت پانچ روپے و لمبا عت و دید زیب  
لئے کا پتہ۔ محمد رشید اللہ خاں برکت بنگلہ ٹنگلی جیل قدیم حید آباد دکن

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو بازاؤں میں مانگ دیکھ کر دوکان بجاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو گاہکوں  
کے بے خبر ہونے کی پرواہ نہیں کرتے اپنے مال کی نایابی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ پہلے قسم کے شاعروں کو زیادہ غنت نہیں  
اٹھانی پڑتی وہ جانے پہچانے خیالات کو جانے پہچانے انداز میں نظم کر دیتے ہیں۔ ان کے لئے خیالات کے پیکر  
الفاظ کے سانچے سب ڈھلے ڈھلائے ہوتے ہیں۔ انہیں میں ادل بدل کر کے وہ داد حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے  
قسم کے شاعر اس داد سے اکثر محروم رہتے ہیں۔ ان کا ایک قدم اپنے زمانے میں اور ایک آنے والے زمانے  
میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بنے بنائے سانچوں کے بجائے خود بنا بنا جاتا ہے۔ نئے بت بنانے والے  
کو پُرانے بت توڑنے بھی پڑتے ہیں مگر کتنے ہی لوگ یہ کمی سمجھ نہیں سکتے کہ پُرانے بتوں کو توڑنے کی ضرورت پیش  
ہی کیوں آتی ہے۔ آخر اپنے پرانے لئے پسے جانے والے خیالات میں کوئی خرابی ہے کہ نئی چیز کی طرف توجہ  
کی جائے۔ جب راستہ صاف اور کشادہ معلوم ہوتا ہے تو ادھر ادھر دیکھنے سے کیا فائدہ۔

مگر جب لوگ ادھر ادھر دیکھتے ہیں اور شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کی سزا بھی  
ملتی ہے نظیر نے محمی خیالات اور عجیبی اصناف کو چھوڑ کر مقامی رنگ اور دیسی موضوعات کی طرف توجہ کی۔ نا ب  
لے پرانے خیالات کو نئی بندشوں میں پیش کرنے کے بجائے زبان اور خیال کی نئی دنیا بنائی۔ حالی نے رنگینی  
بلند آہنگی، آرائش اور صنعت کے بجائے سادگی، سنجیدگی، ملائمت اور پاکیزگی پر زور دیا۔ عظمت اللہ خاں نے  
تافیر، رولین، غزل اور عربی مازے عروض کی پابندی سے آزاد ہونا چاہا۔ یہ سب باغی تھے اور اس بغاوت کی  
انہیں سزا بھی ملی۔ اپنے زمانے میں لوگ جانتے ہوئے بھی ان سے انجان رہے۔ ان کی آواز ہمیشہ سنی ان سنی

کردی۔ ان کے شاعر ہونے سے انکار کیا، کروئن (A. J. Cronin) کے ہیرو ڈاکٹر کے ساتھ جو سلوک اس کی برادری نے کیا تھا، اسے ان شاعروں کی برادری اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آتی رہی جو اپنے وقت سے آگے دیکھتے ہیں ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔

عظمت اللہ مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے یہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن اپنی بیشتر عمر حیدرآباد میں گزاری۔ اردو، فارسی، ہندی کے علاوہ انھیں انگریزی سے ذوق تھا۔ انہوں نے صرف انگریزی مصنفین کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے طرز سے تاثر بھی ہوئے تھے۔ اور ان کے چرخ سے چراغ روشن کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے نہ تو شاعری بیکاری کے شغل کے طور پر شروع کی، نہ شاعروں میں داد پانے کے خیال سے۔ وہ پہلے تمام ادبی سرمایہ کو بہت بے بیاعت سمجھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں خود شنہ کی قوت اور خود محسوس کرنے کی صلاحیت تھی، اس لئے وہ تمام طبائع سے علیحدہ نتائج پر پہنچتے تھے۔ سہیلے بول میں جو مضمون شاعری پر شامل ہے وہ بہت اہم ہے اور اس سے ان کے ادبی نقطہ نظر کی بہت کامیاب ترجمانی ہوتی ہے۔ عظمت اللہ خاں ان شاعروں میں سے تو تھے نہیں جو یہ نہیں جانتے کہ شعر کیوں کہتے ہیں اور اگر جانتے ہیں تو بتا نہیں سکتے۔ ان کی شاعری محض ایک شیریں دیوانگی نہیں تھی۔ وہ شاعری کا اپنا ایک نصب العین رکھتے تھے۔ انھوں نے شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ بہت وسیع ہے اور اس میں اچھا شعر اچھی طنز، اچھا ڈراما سب کچھ آسکتے ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ یہ شاعری پر صادق آتی ہے۔ شاعری تھیلی پیکر کے پیدا کرنے کا نام ہے۔ اور تھیلی پیکر کی تشبیہ کی مدد سے وجود میں آتے ہیں۔ اپنی اس تعریف کو واضح کرنے کے لئے انھوں نے میر حسن، ظفر میر اور غالب کے اشعار سے مثالیں دی ہیں اور پھر اس کے ماتحت اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔

انھیں اس سرمایہ میں ”انمٹ ادب بہت کم ملتا ہے اور وہ ایک مفکر کی حیثیت سے اس کی کے اسباب پر بھی غور کرتے ہیں۔ ایک عام نظام تعلیم کے نہ ہونے سے افراد کمزور اور سست ارادے کے ہوتے تھے اور طبیعت کی بے مرکزگی انھیں کسی طرف پوری طرح جمنے نہ دیتی تھی۔ عظمت اللہ خاں کا خیال ہے کہ اردو کی نشوونما کے زمانے میں دماغی، سیاسی اور سماجی لہریں کی انتہا ہو چکی تھی۔ اس آبد و ہوا اور ایسے

کمزور کیہ کڑ کی آغوش میں اردو شاعری پلٹے اور تربیت پانے لگی ہر کس و ناکس شاعری پر پل پڑا۔ اس لئے اردو علوم کی کڑی جھیلے کی نہ ہمت تھی نہ دماغ۔ درحقیقت یہ رائے ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اردو شاعری جموں کی شاعری نہ تھی صرف ایک ایسے طبقے کی شاعری تھی جو متوسط اور بالائی دنیا کے مین مین تھا۔ اس کا ایک سراخانہ سے اردو دوسرا دربار سے ملتا تھا۔ خانقاہ نے اسے اتنا نقصان نہیں پہونچایا جتنا دربار نے۔ دربار کی فضا عیش و عشرت کی تھی یہاں وہی رنگ مہلول تھا جو فانی بالبال نہ تھے وہ بھی جھوٹے میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتے تھے۔ ان خوابوں میں اپنے آپ کو بھلانے کی خواہش ساری قدیم شاعری میں ملتی جو غزل کا انتخاب ہی ہمارے قدیم شعرا کی نفسیات پر روشنی ڈالتا ہے عظمت اللہ خاں لکھتے ہیں کہ غزل ریزہ خیالی اور پریشان گوئی کا ایک ویسا ہی ڈراؤنا خواب ہے جیسا ہمارے شعرا کے لئے ان کی سماجی زندگی بن گئی تھی۔ غزل کے خلاف یہ بغاوت نئی نہیں ہے سب سے پہلے حالی نے اسے شروع کیا مگر حالی نفس غزل کے خلاف نہ تھے۔ شاعری کے معنی غزل کے معنی لینے کے خلاف تھے۔ حالی نے غزل کی تعریف بھی کی ہے۔ اس کے انتشار و عدم تسلل اور بے لٹی کا جو از بھی بتایا ہے عظمت اللہ خاں حالی سے بہت آگے ہیں دو بے تکلف اور بے پیمان غزل کی گردن مار دینا چاہتے ہیں لیکن اصلاح کے جوش میں انھوں نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ غزل بعض صورتوں میں فطری اور حقیقی بھی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے اور کبھی کبھی جذبات کے سیلاب میں غزل کی آسان ہلکی پھلکی اور لطیف صنف بھی کام دے سکتی ہے۔ نیز جب تانیہ اور ردیف کی پابندی اس قدر سخت نہ ہو تو اس کے فارم میں اتنا لوج اور لچک موجود ہے کہ جذبات محبت کی حقیقی جوش کا اظہار مصوری ہو سکے۔ بات یہ ہے کہ غزل میں بے لٹی اور انتشار اس قدر عام رہے ہیں کہ اب غزل کے معنی ہی بے لٹی کے سمجھ لئے گئے ہیں۔ حالانکہ غزل سے بہت سے بلند پایہ شعرائے مسلسل خیال کے مختلف پہلوؤں کے ادا کرنے کا کام لیا ہے۔ جمیر، غالب اور دوسرے شعرا کے یہاں علاوہ قطعات کے بہت سی غزلوں میں ایک خیال کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ پھر اس میں صرف محبت (اور وہ بھی فرضی) نہیں۔ ہر قسم کے مطالب کے اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔

عظمت اللہ خاں کا سب سے بڑا اعتراض اردو کے شعرا پر یہ ہے کہ وہ "کائناتی مطالعہ سے کور"



ہیں اور دراصل ہی ہمارے شاعری کے تقلیدی اور مصنوعی ہونے کی وجہ ہے تخیل کے زندہ اور نئے پیکر دیکھنے  
 مبالغے اور برتنے سے ہاتھ آتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے یہاں ذاتی تجربے ضروری نہیں بلکہ ہر تجربے کا عنوان  
 مقرر ہے اس لئے اس میں تقلیدی رنگ کو اور ترقی ہوتی ہے عظمت اللہ خاں اس سلسلے میں انگریزی شاعری  
 کی مثالوں کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شاعری اس طرز پر کی جائے اور اس کے لئے  
 عروض بھی نئی بنائی جائے۔

ان کے مضمون کا تیسرا حصہ ایک نئے عروض کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ اردو کو عربی اور فارسی عروض  
 کے پنجے سے رہائی دلانا چاہتے ہیں کیونکہ ان میں موسیقی اور ترم کے نئے نئے امکانات کا بالکل لحاظ نہیں لکھا  
 گیا ہے۔ وہ اردو عروض کی بنیاد ہندی بگل پر رکھنا چاہتے ہیں مگر ہندی عروض کو کب لے لیا انھیں پسند نہیں  
 وہ اسے سائنٹیفک بنا چاہتے ہیں۔ وہ عربی بحر کو سرے سے ترک کرنے کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان  
 میں سے مناسب اور موزوں بحر کو اردو میں رہنے دینا چاہتے ہیں تیسرے وہ چاہتے ہیں کہ انگریزی عروض  
 کے ایسے اصول جو آزادی کی جان ہیں اور اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ہر زبان کے لئے کام دے سکیں ان  
 پر اس نئی عروض کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔

عظمت اللہ خاں اس رمز سے واقف ہیں کہ نثر اور نظم میں فرق جنس کا نہیں، آہنگ یا انگریزی کے  
 مشہور نقاد ملٹن مرے کے الفاظ میں (TEMPER) کا ہے۔ وہ عروض کا مازک طریقہ رائج کرنا چاہتے ہیں کیونکہ  
 اس کے ذریعہ ترم کی تمام وسعتیں شاعر کے احاطہ میں آسکتی ہیں۔ وہ قافیہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر  
 مہرے یا شعر کے ساتھ اس کا نباہنا ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ بے قافیہ نظم کے بھی موید ہیں بگمان براعظم  
 کرنے والے شاید ان کے اس قول کو بھول جاتے ہیں کہ ”سوائے ڈرامے کے اور صورتوں میں بے قافیہ  
 نظم ممکن نہیں“ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو میں غنائی (lyric) شاعری کی کمی ہے۔ یوں تو غزل  
 خود اس قبیل کی چیز ہے مگر روایات نے اس سے ذاتی جذبہ بچپن کراسے ”رسوائے عالم“ کو دیا۔ ان  
 کی ساری شاعری اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔

عظمت اللہ خاں کی نثر میں بھی ان کی نظم کی طرح انگریزی کا اثر بہت نمایاں ہے ان کے الفاظ

ان کے اپنے ہیں۔ یہ ان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ایک نئی تازگی اور گرمی ہے مگر یہ تازگی اور گرمی ابھی مصنف کا مزاج نہیں بن پائی۔ اگر مروجہ کو زیادہ عمل جاتی تو ان کے طرز میں جو اکٹھڑی مگر کچھ کیفیت ہے۔ جو بھونڈا پن ہے، جو اسلوب کی ناہمواری ہے وہ دور ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی میں سوچنے لگتے ہیں اور پھر ان کی اردو ترکیبیں انگریزی الفاظ کا ترجمہ یا انگریزی ترکیبوں کا چوبہ معلوم ہوتی ہیں یہ چیز ان کی نظموں میں بھی ہے مگر وہاں بدنامہ تک نہیں۔ نثر میں بدنام ہو جاتی ہے اس مضمون میں اس قسم کے الفاظ اور فقرے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ غلط نہیں بھونڈے ہیں۔ ان کی ساخت ان کی اصل کا پردہ فاش کئے دیتی ہے۔

جہاں گیر لافنا خیالات، آب حیات پئے پلائے خیالات، شکریے لپٹے اور ٹھیلے کو بچھڑا کاتے اسلوب، حکمت ہے، اصلیت پٹے، کم منظم اور بن نہجی ترکیبیں، گا پٹنے کے لئے بیتاب ابھی مستقبل کے پردے میں ہے شاعر جن جن اور تول تول کر گا کہے، اگر دیش پرست ہو جانے کی بلند صمگلی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کی نظمیں بہت آسانی سے دوسروں میں رکھی جاسکتی ہیں کچھ ترجمے ہیں اور کچھ طبع زاد یہ ترجمے انگریزی کے مشہور شعرا اور ڈس ورتھ بائرن، براؤنگ، ٹیکسیر اور بارڈی کے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت ایک قسم کی ذہنی شق کی ہے اگرچہ شاعر ان نظموں کی لطافت خیال کو اردو میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ درڈس اور تھ کی مشہور نظم ”کوئل“ کو لیجئے جس میں بقول مولوی عبدالحی صاحب ”جملہ خیال کے ساتھ ساتھ ہے اور قافیہ پر آب رواں کی طرح بہکر دوسرے مصرعہ اور پھر بعد کے شعروں میں گمل مل گیا ہے۔ یہاں عظمت اللہ خاں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اصل سے جو خیالی تصویر ذہن میں آتی ہے انہیں اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ”ہم سات ہیں“ یہ بھی اسی شاعر کا کامیاب ترجمہ ہے اور اصل نظم کی سادگی و پرکاری اور اس کے الفاظ کی رد و رکھل میں کعب جانے والی خصوصیت یہاں بھی موجود ہے۔ ایک بند دیکھئے۔

نہیں ہوتی مردوں کی زندوں میں گنتی یہ سب بھولے پن کے خیالات ہیں

عقیدے کی اپنے وہی ایک بچی کما پھر نہیں واہ! ہم سات ہیں  
 گران کے بعض ترجموں میں اصل کی روح تو ہے مگر اصل کی بنگلی نہیں ہے جو چیز انگریزی میں  
 بجلی معلوم ہوتی ہے اسے اردو میں ادا کرتے وقت وہ موزونیت پیدا نہیں ہوتی۔ میر ڈتھ کی ایک نظم  
 کے پہلے دو مصرعے یہ ہیں :

On my darling's bosom

Has dropted a living rose bud

اس کا ترجمہ غنیمت اللہ خاں یوں کرتے ہیں

میرے نگر کی دیوی کے بالائے سینہ کھلا ہے محبت کا تازہ کنول

یہاں بالائے سینہ کی ترکیب بالکل بالائے قلعہ معلوم ہوتی ہے اور اس سے مصرعے کی لطافت زائل  
 ہو جاتی ہے۔

برازنگ کی مشہور نظم (Pippa Passes) کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ بالکل بے جان ہے

اٹھنا پڑا دکھ کسی کو زیادہ؛ بڑی یا چھوٹی نظر میں خدا کی

سب یکساں ہے خدمت اگر سبالتی ہے عرش معلیٰ پر حق جلوہ فرما

مگر اسی کی دوسری نظم زیادہ کامیاب ہے (A pretty woman) کا ایک بند اس طرح پیش کیا گیا ہے

کسیں اک اشارے پر تم مہرباں ہو

مزید ارتعیر بھائی کسیں چکدار شمشیر بھائی کسیں

غرض دھل گئیں جیسا موقع جاں ہو

بحیثیت مجموعی غنیمت اللہ خاں مرحوم نے نظموں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ باوجود کہیں کہیں دلکش ہونے کے

بہت کامیاب نہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ خصوصاً گیتوں کا ترجمہ جس میں صرف لفظوں کو بدلنا یا انگریزی

لفظ کی بجائے اردو لفظ رکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک لطافت کو دوسری لطافت کا قالب دینا ہوتا ہے۔ مگر

طبعاً و لفظوں کا معیار بہت زیادہ بلند ہے۔

ان نظموں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنے گرد و پیش کے مناظر پیش کرتا ہے جو چیزیں اسے

متاثر کرتی ہیں وہ اس کی بجھی اور ربانی پہچانی ہیں اور انہیں وہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان میں ایک نیا بات پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر شاعر کسی منظر کی تعریف میں بڑے خوبصورت الفاظ جمع کرے، مگر اس کی تصویر سے کہیں حسن نہ ٹپکتا ہو تو یہ محض فن کی دلیل ہوئی لیکن کم سے کم الفاظ میں اگر اثر پذیر ی کا دریا بند کر دیا جائے تو دل میں رہ رہ کر لہریں سی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرے وہ جن مناظر کو لیتا ہے ان میں سے بعض اچھوتے میں انہیں ان سے پہلے کسی اردو شاعر نے منہ نہیں لگایا۔ حتمہ پیلپل کا درخت، تتری کیڑا، جغرافیہ۔ ان بے رنگ اور سیاٹ عنوانوں میں شاعر نے اپنی رنگین شخصیت سے توس قزح کی سی وحالیاں پیدا کر دی ہیں پیلپل کا ایک رنگ یہ ہے۔

کونپلیں نازی سوریوں جیسی رنگ وہ دہانی ہلکاسا      اس میں جھلک وہ پیازی پیازی

ٹھنی ٹھنی پیلیاں ہیں جڑے ہوئے نگ ہیں گویا      جان کی ہے اک شعبہ بازی

حتمہ کی کیفیت یہ ہے۔

نیلا ابر کجھے تائے حُسن فطرت موحیں مائے      اک دیدہ حیران ہے حتمہ

سنان ساں بھید کے سائے جھل جھل کرتے اتار      گویا صاحب عرفان ہے حتمہ

اچھوتے مضامین میں سے ایک بالی بیوی "ہے ہندوستان میں یہ کوئی نئی چیز نہیں مگر تعجب سے کہ اس کے متعلق ہیں شاعریں کوئی بھی اشارہ نہیں ملتا عظمت اللہ خاں کی یہ نظم ہندوستانی جذبات کا بڑا دکش مرتع ہے بالی بیوی کے خدو خال کے متعلق جو اشارے ہیں بڑے بلند ہیں۔ ہندی بھراور ہندی کے الفاظ نے ایک ریلی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ دو اشارے ملاحظہ ہوں۔

ترے ہونٹ یہ لال ہیں      نہیں سانس میں گرمیاں

ترے پھول سے گال ہیں      نہیں باس میں مستیاں

ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دہی سی ہو

ترے مکھ نے پیتا دیا      ترے اُٹھے سبھاؤ کا

ابھی کچھ نہ پیتا ملا      ترے من کے لگاؤ کا

ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دہی سی ہو

عورت کی مظلومیت کا بھی غفلت اللہ خاں کو بڑا احساس تھا۔ ان کی نظموں میں سے کئی اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ”مرے حسن کے لئے کیوں خرے“ ”وہ ہوں بھول جس کا پھل نہیں ہے۔“ مجھے پیت کایاں کوئی پھل نہ ملا۔“ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو یہ سب ان کی بہترین نظموں میں شاعر کی جاسکتی ہیں۔ ان سب میں عورت کی زبان سے مرد کی غفلت شعاری اس کی بے وفائی، عورت کی آرزوں کو بھڑکا کر انھیں پامال کرنے کا ردنا رویا گیا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے خشکایت کمیں نالہ و شیون کی حد تک نہیں پہنچی، ان کی بحریں روان اور سترم ہیں اور ہندی الفاظ کے مناسب اور موزوں استعمال نے انھیں ہندی افادی کے الفاظ میں شعاع کی چیز ”بنا دیا ہے۔“ ”مرے حسن کے لئے کیوں خرے“ اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت تلخ لہجہ اختیار کر سکتی تھی مگر اس کے آخری بند میں ہندوستانی عورت کی فطرت کا کتنا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔

مرے دل سے ہو گا یکب جہا تمہیں سے سکوں کوئی بدعا وہ ہوا جو اتمے پہ تھا لکھا مرے دل سے آئیگی یہ صدا

مرے حسن کے لئے کیوں خرے؟ نہیں لینے تھے تمہیں یوں خرے

”مجھے پیت کایاں کوئی پھل نہ ملا۔“ مرحوم شاعر کی بہترین نظم قرار دی جاسکتی ہے اس میں نظم کے فانی

انگریزی طرز کے ہیں بحر ہندی ہے مگر اس کے پڑھنے میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی جو شاعر نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق ایک مکمل تصویر خیال کے سامنے آجاتی ہے یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ مگر

ایک عورت کی زبان سے بیان کر کے غفلت اللہ خاں نے اس میں درد و اتار کوٹ کوٹ بھردیا ہے۔ ہر بند دوسرے بند سے وصل ہوتا جاتا ہے اور خیال ٹھوکریں کھانے کے بجائے خوش اسلوبی سے بڑھتا اور پھیلتا

ہے۔ عورت کا تعارف ایک بند میں ہو جاتا ہے۔

کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی

مری باتوں نے گھر کو ہی موہ لیا

نہ تو روٹی کبھی نہ کسی سے لڑی

اس کی محبت اس طرح شروع ہوتی ہے۔

میری چاہ کے راج دلائے بنے

مرے سر میں تمہارا ہی دھیان با

میری بھولی سی آنکھ کے تائے بنے

تمہیں دیوتا مان کے من میں رکھا

مگر جب پڑھ لکھ کر دئے دوسری جگہ شادی کی تصویرائی تو عورت کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بستر مرگ پر  
پڑ گئی۔ اس وقت بھی لہجہ کتنا نرم ہے۔

مرا آخری وقت ہے آں لگا کوئی اور تمہاری ہے پیاری دہن  
مجھے اب بھی تمہارا ہی دھیان لگا نہ بنی پر رہی ہوں تمہاری دہن  
ایک دوسری نظم ”وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے“ دراصل ایک طوائف کی داستان ہے۔ اس  
نظم کو محض جذباتیت بارت کر سکتی تھی مگر شاعر نے توازن قائم رکھا ہے۔  
مری زندگی بڑا سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے ہے مئے کی چیز پر یہ دنیا نہ تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے  
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جکی گل نہیں ہے

عظمت اللہ خاں کے گیتوں میں ترنم بھی ہے اور تصویریں بھی۔ انھوں نے شباب کے مختلف مناظر  
بڑی خوبی سے پیش کئے ہیں۔ ان میں مکن ہے بعض لوگوں کو عریانی نظر آئے۔ ہماری غزلوں میں خیال اس  
سے زیادہ عریاں ہے۔ اسے خوشنما الفاظ کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ عظمت اللہ خاں بھی مہدی کی طرح حسن کے  
بجاری ہیں اور جہاں کہیں حسن ہے انھیں عزیز ہے۔ چند نقوش ملاحظہ ہوں۔

چال نشلی جھوٹا بادل یا کوئی ندی اسراتی

چو جوانی میں اٹھلاتی

ڈرتی ڈرتی بچتی بچاتی زکاتی رکاتی شراتی

دل کو ملتی دل تڑپاتی

سینہ مستی کا جو لاکھ کمر چمکتی بل کھاتی

ہوش رہا اتار چڑھاؤ

حسن نسوانی ہی نہیں فطرت کا ہر حسن ان کے پیش نظر ہے۔ برکھارت کے پہلے پیٹھ میں کبلی کی تصویر کھینچی ہے

بجلی بجلی انگارہ سی آگ کی ناگن اسراتی لہریا کا ٹھابیل بناتی

بھاکے دریا میں قدرت نے نور کی پھلتی تیرائی ادھر ادھر تڑپتی تڑپاتی



افتتاح الاندلس :- مترجمہ محمد جمیل الرحمن صاحب ایم۔ اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد  
مقدمہ اور حواشی لاکر ۱۶۴ صفحے کتاب ناسپ میں چپی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے اور کتابتان الہ آباد  
سے مل سکتی ہے۔

یوں تو اردو زبان میں اندلس کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر بیشتر یورپی زبانوں سے ترجمہ  
کی گئی ہیں بیش از حد کتاب اندلس کے ایک مشہور مسلمان عالم اور ثقہ مورخ ابن القوطیہ کے ایک رسالہ  
تاریخ افتتاح الاندلس کا ترجمہ ہے اور مترجم نے شروع میں نہایت تحقیق سے مقدمہ لکھا ہے اور کتاب کے  
آخر میں مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ ابن القوطیہ کا زمانہ ۳۶۷ھ ہے ماں کی طرف سے آپ کا شجرہ  
اندلس کے عیائی بادشاہوں سے ملتا ہے اور آپ کے دادا حضرت عمر بن عبد العزیز کے مرید تھے موصوف  
بڑے پایے کے بزرگ تھے اور عربی زبان اور لغت کے علاوہ حدیث و فقہ میں اپنے زمانے میں بڑی شہرت  
رکتے تھے۔

تاریخ افتتاح الاندلس کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہو چکے ہیں یہ تاریخ اندلس کی ایک مستند کتاب  
سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے کا کوئی مورخ بھی جس نے اندلس پر کچھ لکھا ہے اس کتاب کی اہمیت سے انکار  
نہیں کر سکتا۔ پروفیسر جمیل الرحمن صاحب نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کر کے بہت بڑا کام کیا ہے اور انھیں  
طور پر مقدمہ اور حواشی کی ترتیب میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے جس کے لئے اسلامی تاریخ سے دلچسپی  
رکنے والے اُن کے بے حد شکریہ ادا ہونگے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کا بہت چرچا ہے اور اس موضوع پر نہایت کثرت سے  
کتابیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کتابوں کی حیثیت بیشتر یا تو یہ ہوتی ہے کہ انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے یا محض  
ردائی قصید خوانی ضرورت ہے کہ تاریخ اسلام کے اہل معاصر تک ہماری رسائی ہو چنانچہ اس سلسلہ میں فتح  
اندلس پر اس کتاب کا شائع ہونا بہت مفید ثابت ہو گا۔ ترجمہ کی زبان بہت صاف ہے مقدمہ میں مترجم نے  
نہایت سلیس ہونے انداز میں فتح اندلس کے متعلق اپنی تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مترجم کی یہ  
کوشش علمی مطلق میں ضرور سراہی جائے گی۔



طلسم عمل و مترجم سید مجتبیٰ احسن صاحب مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، طبع کا پتہ درج نہیں، تقطیع ۲۰۲۶ء  
حجم ۲۵۸ صفحے، قیمت جر. لکائی چھپائی، کاغذ اوسط درجہ۔

شیخ سعدی کی گستاخ کو اتنی مقبولیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ انہوں نے اخلاق کے مجدد احوال  
کو عمل مصالح کے ساتھ سمو کر اپنے معصروں کے لئے کا حیاہ زندگی کا ایک چلتا ہوا نسخہ تیار کر دیا۔ ڈیل کا رنگ  
کی کتاب جس کا ترجمہ جناب سید مجتبیٰ احسن صاحب نے اردو میں ”طلسم عمل“ کے نام سے کیا ہے اسی قسم کا نسخہ ہے  
موجودہ زمانے کے لئے۔ ترجمہ ایسا بے تکلف اور رواں ہے کہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب  
اس کا بازارِ اری کے زمانہ میں بھی بہت مقبول ہوگی۔ اور سید مجتبیٰ احسن صاحب اور بہت سی مفید اور  
دلچسپ کتابوں کا ترجمہ کر کے اردو کو مالِ مال کر دیں گے۔ (ع. ح)

سیرت شہید کربلا۔ جلد دوم مترجمہ محمد ایوب عثمانی، صفحات ۳۲۳، سا ۱۳۲۶ء مکتبہ صاف القرآن  
اورنگ آباد طبع کیا، قیمت چار، کتابت و طباعت اور کاغذ بہت عمدہ۔

یہ علی جلال حسینی مصری کی تالیف التحسین جلد دوم کا ترجمہ ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ اس سے پیشتر  
عثمانی صاحب کر چکے ہیں۔ یہ ترجمہ بھی پہلی جلد کی طرح آسان رواں اور بے تکلف ہے۔ اردو  
میں وقتی ایسی مبسوط اور مفصل کتاب حضرت امام حسینؑ کی سیرت پر اب تک شائع نہیں ہوئی، مگر کربلا  
کے بعد کے تمام واقعات تفصیل سے اس جلد میں دئے گئے ہیں نیز ان تمام ضعیف روایتوں اور من  
گھڑت قصوں کو بھی تنقید کی کوئی پر جانچا گیا ہے جو امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پیدا ہو گئے تھے  
آئرمین مختلف فرقوں اور اس زمانہ کے معروف عقائد نیز ملائے کبار اور دیگر بزرگوں کا حال بیان  
کیا گیا ہے مختصر یہ کہ حتی الامکان کوئی بات چھوڑی نہیں گئی ہے۔ امید ہے کہ لوگ اس سے ضرور  
مستفید ہوں گے۔

کتب موصولہ جن پر آئندہ مہینہ تبصرہ ہوگا

# رفتار عالم

۱۹۴۰ء

نیا سال شروع ہوا تو یورپ کی جنگ عظیم کو جاری ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے، جرمنی اور روس نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا تھا، لتھوینیا، استھونیا اور لیتویہ نے روس کی سرپرستی منظور کر لی تھی، فن لینڈ اُسی سے بچنے کے لئے لڑ رہا تھا۔ مگر فن لینڈ کا مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے طے ہو جانے سے یورپی سیاست کے معے حل ہوتے، اور جنوری ۱۹۴۰ء میں انٹریوں اور شاید اکثر ماہرین کو پتہ نہ تھا کہ جنگ آگے کہاں ہوگی، کیسے ہوگی اور کس خاص مقصد کے لئے ہوگی۔ برطانیہ نے جرمنی کی بحری تجارت بند کر دی تھی اور یہ معلوم تھا کہ جرمن بڑا انگریزی بیڑے کا مقابلہ نہ کر سکے گا، فرانسیسی فوج ماری ٹو لائن مورچوں میں محفوظ بیٹھی تھی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جرمن فوجیں ان مورچوں سے نکل کر اپنے سرکیوں چھوڑیں گی۔ ہالینڈ کی سرحد پر ۱۷ فروری ۱۹۴۰ء کو جرمن نہیں جمع ہوئی تھیں مگر پھر وہ ہٹالی گئیں اور خیال یہ ہوا کہ جنگ کے فریقین غیر جانب داروں کو نہ چھیڑیں گے انجاردوں میں غیر جانب داروں کی حیثیت، ان کے جہازوں کی تلاشی لینے یا ان کے تاجروں کے ذریعے مال منگانے کے مسائل پر جو بحثیں ہو رہی تھیں ان کا ایسی وسیع پہانے کی لڑائی کے وقت چھڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن جنگ کا دوسرا دور اسی غیر جانب داری کے معاملے میں شروع ہوا۔

غیر جانب دار

ناروے، ہالینڈ اور بلجیم ایسے ملک ہیں جن کا گزر خارجی تجارت پر ہوتا ہے



نہیں گذر سکتا تھا۔ اسی کے ایک دو دن کے اندر جرمنی نے ناروے کی غیر جانب داری کو محفوظ رکھنے کا دوسرا انتظام کیا۔ ۱۰ اپریل کو خبر آئی کہ ناروے سے لے کر ناروے کے جنوبی سرے تک جرمنی نے ہوائی جہازوں کے ذریعے فوج اتار کر تمام بندرگاہوں اور ہوائی اور فوجی مرکزوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کی ایک اور فوج ڈنمارک فتح کرتی ہوئی ناروے کے دارالسلطنت اوسلو کے قریب پہنچ گئی ہے اور ناروے کی حکومت نے دارالسلطنت کو چھوڑ دیا ہے۔

مکرور کو زبردست سے بچانا ایک اخلاقی فرض ہے اور برطانیہ نے ناروے کو جرمنی کے پنجے سے چھڑانے کا ارادہ کیا۔ اصل میں مسٹر چیمبرلین کو پہلے ہی خیال ہوا تھا کہ ناروے کو مدد پہنچانے کی ضرورت ہوگی اور انھوں نے آخر مارچ میں ایک چھوٹی مگر بہت ہی آزمودہ کار فوج ناروے بھیجنے کے لئے تیار کی تھی لیکن اس وقت وہ بھی نہ جاسکی۔ اور ۵ اپریل کو جب وہ ناروے اور ٹرونڈہائم کے شمال اور جنوب میں اتاری گئی تو جرمن ناروے میں اپنے قدم بہت مضبوط جما چکے تھے۔ برطانوی فوج کے پاس مقابلے کے لئے ہوائی جہاز اور ٹینک بھی کافی نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر اپریل میں اس فوج کو واپس بلانا پڑا۔ ناروے کے محاصرہ البتہ جاری رکھا گیا اور یہ شہر فتح بھی ہو گیا۔ مگر اس وقت تک ناروے کی قیمت کا فیصلہ ہو چکا تھا، ناروے میں نہیں بلکہ فرانس میں۔ ڈنمارک اور ناروے کی ہم سے فارغ ہو کر جرمن فوجیں ہالینڈ اور بلجیم پر لوٹ پڑیں۔ فن جنگ کے نئے اصولوں کا مظاہرہ جرمنی نے ہالینڈ اور ناروے میں بھی کیا تھا لیکن ہالینڈ بہت دور تھا اور ناروے میں جو مقابلہ ہوا اس کی حیثیت مقامی سی رہی۔ لیکن اگر اتحادی یہ بھانپ بھی لیتے کہ جرمنی کس ڈھنگ سے لڑے گا تب بھی اس کی چالوں کا مناسب جواب دینا ممکن نہ تھا، اس لئے کہ انھیں ہمت بہت کم ملی۔ ۱۰ مئی کو جرمنی نے ہالینڈ پر حملہ کیا، کسی ایک جگہ پر نہیں بلکہ سارے ملک پر۔ جہاں جہاں ہالینڈ کے ہوائی

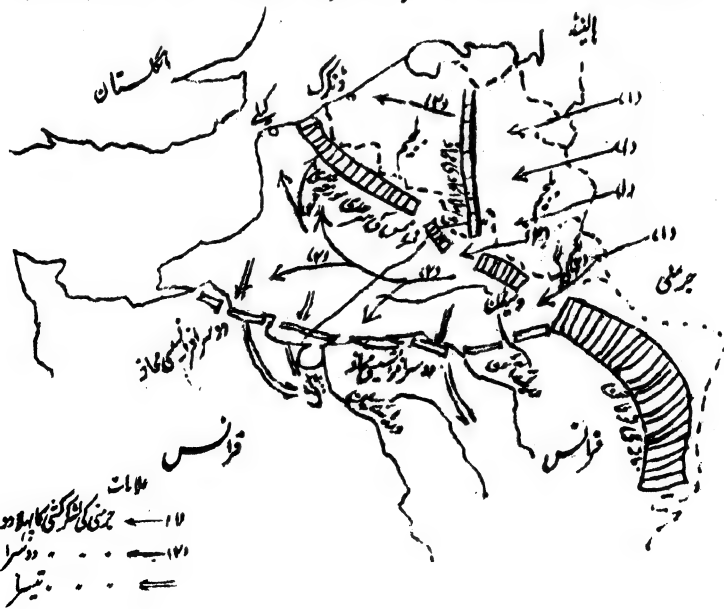
مرکز تھے، جرمن ہوائی جہازوں نے آکر پہلے بمباری کی اور پھر مسلح سپاہی اتار دئے جنھوں نے مرکز پر قبضہ کر لیا۔ ہالینڈ کی فوج نے اکثر مرکزوں پر ان مسلح سپاہیوں کا صفحہ کر دیا، مگر دشمنوں کے ہر جگہ اچانک نمودار ہونے سے ایسی کھلبلی مچ گئی اور انتظام میں ایسی گڑبڑ ہو گئی کہ ملک کو دشمن سے بچانا ناممکن ہو گیا۔ تین دن میں جزیرہ زے لاند کے سوا باقی ملک پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا اور ۱۴ مئی کو ہالینڈ کے سپہ سالار نے صلح کی دستخط کر دی۔ اس کے بعد بلجیم کی باری آئی۔ یہاں جرمنی کا کام اتنا آسان نہ تھا، اس لئے کہ برطانیہ اور فرانس کی بڑی بڑی فوجیں بلجیم میں مغرب کی طرف سے داخل ہو کر تیزی کے ساتھ مقابلے کے لئے آ رہی تھیں۔ انھوں نے جرمن حملہ کو روک بھی لیا، مگر یہاں بھی ان کے پاس ہوائی جہاز اور ٹینک اس افراط سے نہ تھے کہ وہ ترکی بترکی جواب دے سکیں اور جرمنی نے اس وقت ایسی چال بھی چلی جس نے جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا۔

### فرانس کی شکست

فرانسیسیوں نے شمالی سوستان سے لے کر بلجیم تک زمیں دوز مورچوں کا ایک سلسلہ بنالیا تھا، جو ماثری فلائن کہلاتا ہوا اور جے سامنے سے حملہ کر کے فتح کرنا امکان سے باہر ہے۔ بلجیم اور فرانس کے درمیان ایسی کوئی روک نہیں۔ فرانسیسی ماثری فلائن کے سے مورچے یہاں بھی بنا سکتے تھے، لیکن اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالا جاتا کہ فرانس نے اپنی فکر کرنی ہی۔ بلجیم کی اسے فکر نہیں، مگر جرمن فوجوں نے سرحدی قلعوں کو پہلے ہی ہتے میں فتح کر لیا اور اتحادی فوجوں سے ان کی مدد بھر وسط بلجیم میں ہوئی۔ تب خیال ہوا کہ جنگ کی صورت آخر کار وہی ہو جائے گی جو ۱۹۱۴ء کی جنگ میں تھی۔ دونوں فریق خندقیں کھود کر بیٹھ جائیں گے، اور خالی گولہ بارود کے زور پر آگے بڑھ سکیں گے لیکن اس خیال کو جرمنی نے چند دن کے اندر ہی غلط ثابت کر دیا۔، امریکی

کو ایک جرمن فوج نے ماڑی نولائن کے آخری شمالی قلعے کے قریب شہر سیدان کے سنے  
 فرانسیسی سرحد کو پار کیا، یہاں پر جرمن فرانسیسی فوج بھی وہ اس کے شدید حملے کو برداشت  
 نہ کر سکی اور جرمن فوج ملک کے اندر گھسٹی چلی گئی۔

اصل حالات کا جب پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ فرانسیسی اس وقت جنگ کے لئے تیار  
 ہی نہ تھے، فوج کا انتظام خراب تھا، سپہ سالار اتنے بوڑھے تھے کہ بس لکیر کے فقیر  
 ہو کر رہ گئے تھے اور لڑائی کے نئے طریقے نے ان کو بالکل عاجز کر دیا۔ سیدان کے  
 قریب جرمن حملے کی شدت سے فرانسیسی فوج ایسی گھبرائی کہ پس پا ہوتے وقت پلوں  
 کو توڑتا بھی بھول گئی اور جرمن فوج کا کام بہت آسان کر دیا۔ پھر فرانسیسیوں کے  
 پاس سامان کی بھی بڑی کمی تھی۔ جرمنی نے خشکی پر حملہ کرنے سے پہلے ہی فرانس کے  
 ہوائی مرکزوں پر ایسی بباری کی تھی کہ فرانس کے بیشتر ہوائی جہاز ضائع ہو گئے اور  
 فوج کا یہ بازو ٹوٹ گیا۔ جرمنی کے پاس تیز رفتار ٹینک، مسلح موٹر اور ہوائی جہاز



اتنے تھے کہ وہ ہر فہم میں جتنے چاہتا کھپا سکتا تھا، فرانسیسی اپنے سامان کو بچا بچا کر ہی صرف کر سکتے تھے اور اس لئے مقابلے میں کامیابی کی شرط یہ تھی کہ جنگ کے وقت اور موقع اور صورت کا انتخاب وہ کریں۔ لیکن جرمنی نے انہیں سوچنے کی مہلت نہیں دی، اور اس طرح فرانسیسی سپہ سالاروں کی جو تھوڑی بہت عقل تھی وہ بھی کام نہ آئی۔

جرمنی نے جنگ کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی نرالا تھا۔ ہر محاذ پر پہلے سینکڑوں ہوائی جہاز لگاتار حملے کرتے، صرف دشمن کی فوج ہی پر نہیں بلکہ اس کے پیچھے بہت دور تک۔ ان حملوں میں بہت سے ہوائی جہاز ضائع جاتے، مگر اس سے بھی حملوں کے تسلسل اور شدت میں فرق نہ آتا۔ جب ہوائی جہاز اپنا کام کر چکے تو ٹینک اور مسلح موٹر آگے بڑھتے اور ان کی بھی تعداد اتنی ہوتی کہ فرانسیسی مقابلہ کرتے کرتے عاجز آجاتے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتے لیکن کسی ایک جگہ پر ان کے قدم اکھڑتے تو انہیں پھر دوسرا محاذ قائم کرنے کا موقع نہ دیا جاتا۔ جرمن ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور مسلح موٹروں کے حملے کبھی رکتے ہی نہیں تھے اور جہاں کہیں فرانسیسی محاذ ٹوٹا اور بیچ میں جگہ خالی ملی تو چھوٹے تیز رفتار ٹینک، مسلح موٹر اور موٹر سائیکلیں گھس کر فرانسیسی فوج کے پیچھے پہنچ گئیں۔ ان کا مقصد فوج کو گھبرانہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے جس قدر دور تک ممکن تھا عام آبادی کو خوف زدہ کرنا اور رسد کے انتظامات کو دزہم برہم کرنا تھا۔ ان کی مدد کو فوج نہیں پہنچ سکتی تھی اس لئے انہیں اس طرح دشمن کے ملک میں دوڑا دینا اصول جنگ کے باطل خلاف تھا۔ اگر جرمن فوج دو تین ہفتے تک بھی پورے محاذ پر روک لی جاتی تو ان ٹینکوں، موٹروں اور موٹر سائیکلوں میں سے ایک بھی باقی نہ بچتی۔ لیکن پوری جرمن فوج کہیں روکی نہ جاسکی، اور اس لئے یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی۔

ماژی نولان کے شمال میں فرانسیسی محاذ جگہ جگہ پر توڑا جا چکا تھا اور فرانسیسی فوجیں اتنی دور تک ہٹ گئی تھیں کہ اتحادی فوج کا شمالی حصہ جو بلجیم کی مدد کو گیا تھا دیسے بھی خطرے میں تھا جب بلجیم نے ہتھیار ڈال دئے (۲۸ مئی)۔ اب اتحادی فوج کے لئے پس پا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انگریزی فوجیں ڈنکرک کی طرف واپس ہوئیں فرانسیسیوں نے سین اور آئن دریاؤں پر اپنا محاذ قائم کیا اور شمال مشرقی فرانس، جس میں جرمن ٹینک، مسلح موٹر اور موٹر سائیکلیں آوارہ پھر رہی تھیں بالکل خالی کر دیا گیا۔ ۶ جون کو جرمنوں نے فرانسیسیوں کے نئے محاذ پر حملے شروع کئے اور آٹھ دنوں میں فرانسیسیوں نے ہاری مان لی۔ ۱۸ جون کو فرانسیسیوں نے دشمن سے لڑائی بند کرنے کی درخواست کی، جو منظور کر لی گئی، لیکن اس دوران میں جرمن فوجوں نے ماژی نولان کو پیچھے سے گھیر لیا اور اس میں جو فرانسیسی فوج تھی وہ بغیر لڑے ہوئے منتشر ہو گئی۔ یہ تھا انجام اس مورچہ بندی کا جس پر فرانسیسی اتنا بھروسہ کرتے تھے۔

### برطانیہ اور فرانس

اتحادی فوجوں کی بلجیم سے پس پائی کا سب سے افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور انگلستان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ برطانیہ کے مقابلے پر فرانس کا جو ساحل ہے اس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا تھا، برطانیہ اور فرانس کے الگ الگ محاذ بن گئے تھے اور ہر ایک کو اپنی ساری قوت اپنی حفاظت کے لئے سمیٹ کر رکھنا تھا۔ برطانوی فوج کو بلجیم سے واپسی کے وقت خاصا نقصان ہوا تھا اور اس کے بعد امکان تھا کہ جرمنی فرانس میں جنگ کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر کے انگلستان پر حملہ کر دے۔ اس کے باوجود برطانیہ کے نئے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے ایک فوج تیار کر کے فرانس کی مدد کو بھیجی۔ فرانس کی حالت نازک ہو گئی تو مسٹر چرچل نے تجویز کیا کہ فرانس اور برطانیہ ایک مشترک حکومت



قائم کر لیں۔ فرانسیسی اس تجویز کو منظور کر لیتے تو ان کی حیثیت ہسپانی کی سی ہو جاتی، وہ جنگ جاری رکھ سکتے اور ہر ہٹلر کا میابی کا سہرا پہن نہ پاتے۔ لیکن فرانس کے رہبروں میں سوائے جنرل ڈی گول کے کوئی ایسا نہ تھا جس میں جنگ کو جاری رکھنے کی ہمت تھی، مسٹر چرچل کی تجویز پر جیسا کہ چاہئے تھا غور نہیں کیا گیا اور جرمنی سے یہ درخواست کر کے کہ لڑائی بند کر دی جائے فرانس نے برطانیہ سے اپنا پڑنا تعلق توڑ دیا۔

### برطانیہ

جمہوریت میں بڑی خوبیاں ہیں، لیکن فن جنگ کے نقطہ نظر سے خامی بھی ہے کہ حملہ اور مدافعت کی پہلے سے تیاری نہیں کی جاسکتی، جرمنی نے جنگ کے لئے اس وقت سے انتظام کرنا شروع کر دیا جب سے کہ نازی پارٹی برسر اقتدار ہوئی، انگلستان میں اس طرف توجہ چار سال بعد کی گئی جب یہ یقین ہو گیا کہ جرمنی سے لڑائی ضرور ہوگی۔ لڑائی کے لئے اس نیت سے تیاری کرنا جو کہ جرمنی کی تھی آدمیت اور تہذیب کے باطل خلاف ہو اور آدمیت اور تہذیب کی قربانی چند فوجی افسروں کی خوشنودی یا تماشائیوں کی واہ وا کے لئے نہیں کی جاسکتی۔ جب واقعی ضرورت پیش آئی تو برطانیہ کی جمہوریت نے بھی اپنے جوہر دکھائے۔ ناروے کی مہم ناکامیاب ہوئی تو مسٹر چیمرلین نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ۱۰ مئی کو بغیر بحث مباحثہ کے چند گھنٹوں کے اندر اشخاص اور ملکیت کے بارے میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر لیا جس سے برطانیہ کی حکومت کو شہریوں اور ان کی ملکیت پر اتنا ہی اختیار ہو گیا جتنا کہ نازی پارٹی نے برسوں کی گالی گلوچ اور غنڈے پن اور خونریزی اور خفیہ پولیس کی بے شمار زیادتیوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ نئی حکومت کی خود اعتمادی اور جمہوری سیاست کا استقلال اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شروع جون میں مسٹر چرچل نے بلجیم اور شمالی فرانس سے ہسپانی کے سارے حالات

صحیح صحیح بیان کر دئے، قوم کو نقصان پورا کر کے اپنے زبردست دشمن کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور یہ دعوت بڑے جوش سے قبول کی گئی۔

فرانس کی شکست اور اس کے ہتھیار ڈال دینے کے معنی یہ تھے کہ فرانس کی شمالی بندرگاہیں اور کیلے کے پاس کا ساحل، جہاں سے برطانیہ صرف چوبیس میل ہے، جرمنی کے قبضے میں ہوگا اور انگلستان پر حملہ کرنے کے لئے وہاں انتظام کیا جاسکے گا۔ جرمنی ہوائی جہازوں کے لئے بڑی آسانی ہوگئی کہ وہ فرانس سے اڑ کر برطانیہ کے جس حصے پر چاہتے ہیں باری کر آتے۔ جولائی میں تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی واقعی برطانیہ پر لشکر کشی کرنا چاہتا ہے، لیکن اگر جرمنی نے حملہ کا ارادہ بھی کیا تھا تو برطانیہ کے بیڑے اور ہوائی جہازوں نے اس کی نوبت نہیں آنے دی۔ اگست سے برطانیہ پر ہوائی حملے ہونے لگے، جن کی شدت گھنتی بڑھتی رہی اور جواب تک جاری ہیں۔ لیکن جون جولائی اور اگست ہی میں برطانیہ نے اپنی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا۔ اور جرمنی نے ہوائی حملے کر کے بہت سخت نقصان اٹھایا۔ ان حملوں کے جواب میں برطانیہ نے بھی جرمنی پر باری شروع کر دی اور چونکہ جرمنی میں مدافعت کا انتظام اتنا اچھا نہیں ہے جتنا کہ انگلستان میں اور جرمن ہوابازوں کو فرداً فرداً لڑنے کی خاص مشق نہیں ہے، جنگ کی موجودہ شکل میں جرمنی بہت گھٹائے میں رہتا ہے۔

فرانس اور جرمنی کے درمیان لڑائی بند کرنے کی شرطیں طے ہوتے ہی برطانیہ نے فرانسیسی بیڑے کے ان تمام جہازوں پر جو بحر روم کے باہر تھے یا تو قبضہ کر لیا یا انھیں بیکار کر دیا۔ چند جہازیں بھی تھے جنھیں ان کے کپتانوں نے اپنی خوشی سے برطانیہ کے بیڑے میں شامل کر لیا۔ برطانیہ کے لئے یہ کارروائی لازمی تھی، اس لئے کہ فرانسیسی حکومت پر جرمنی دباؤ ڈال کر فرانس کا پورا بیڑا حاصل کر لیتا تو جرمنی کی بحری قوت بہت بڑھ جاتی اور مفت کے جہازوں سے جرمنی وہ کام لے سکتا تھا جو وہ اپنے جہازوں

سے لیتے ہوئے گھبراتا ہو۔ برطانیہ نے بڑی ہوشیاری سے اس خطرے کی پیش بندی کر لی۔

اٹلی

۱۸۷۰ء کو جب اس کا پورا اقیس ہو گیا تھا کہ فرانس جرمنی کا مقابلہ ایک ہفتے سے زیادہ نہ کر سکے گا، اٹلی نے برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۹۳۶ء سے جرمنی اور اٹلی کی سیاست کا ایک ہی مسلک رہا ہے اور ہر معاملے وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں لڑائی چھڑی تو اٹلی غیر جانب دار رہا، لیکن یہ بھی واضح کرتا رہا کہ اسے جرمنی سے ہمدردی ہے اور اس کی غیر جانب داری محض اصطلاحی ہے، بحر روم کی حکومت کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اپنے حق کو وہ حاصل ضرور کرے گا۔ یہ سب کہنے کی باتیں تھیں اٹلی جنگ کے لئے تیار نہیں تھا، اور نہ اس کے لئے ہر لحاظ سے بہتر تھا کہ فوراً لڑائی شروع کر دے۔ اس نے ۱۹۳۸ء کے آخر میں مصر اور یونان پر حملہ کر دیا ہوتا تو برطانیہ کو اس کے مقابلہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتیں۔ اور اپریل سے جون ۱۹۴۰ء تک جرمنی کو جو کامیابیاں ہوئیں وہ فاشسٹ سیاست کے لئے بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ ظاہر میں کچھ معلوم ہوتا ہو، اٹلی کے لڑائی ملتوی رکھنے کے معنی یہ تھے کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کامیابی کس کو ہوتی ہے۔ جون میں فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا منشا جرمنی کو مدد کرنا نہیں تھا، اس لئے کہ جرمنی کو اس وقت مدد کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اٹلی چاہتا تھا کہ فرانس کی شکست سے فائدہ اٹھائے اور فیصلہ رٹے ہوئے نیس، کورسکا اور فرانس کی افریقی نوآبادیاں حاصل کر لے۔ یہ سب مل جاتا تو بحر روم پر حکومت کرنے کا حق بھی آگے چل کر ثابت کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسے خود غرض اور گیدہ صفت دوست کی جیسا کہ اٹلی ہے، کوئی قدر نہیں کرتا۔ فرانس سے وقتی صلح کی شرائط پر گفتگو کرنے میں اٹلی کے نامزد سے مجھے بلکہ بہت پیش پیش تھے، مگر اٹلی کو ملا کچھ نہیں، اس لئے کہ فرانسیسی اٹلی کے مطالبے

منظور کرنے پر تیار نہیں تھے اور جرمنی کی مصلحت کے باطل خلاف تھا کہ اٹلی کے مطالبے منظور کرانے کی خاطر فرانس سے لڑائی جاری رکھے۔ بالآخر فرانس سے جو شرطیں منوائی گئیں وہ جرمن سیاست کی غوغواری کو دیکھتے ہوئے بہت ہلکی تھیں، فرانس کے دارالاسان اور شمالی و مشرقی حصہ دوران جنگ کے لئے جرمنی کے قبضہ میں رہنا طے پایا، الاسان لورین کے دونوں ضلعوں میں سے لورین جرمنی نے لے لیا اور الاسان فرانس کے پاس رہنے دیا گیا، فرانسیسیوں کو ملک کے ایک تہائی حصے میں، جو آزاد چھوڑا گیا تھا، حکومت کرنے کا پورا اختیار دے دیا گیا، لیکن ظاہر ہے یہ حکومت جرمنی کے مفاد کے خلاف کچھ کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ضلع سیوونٹی اور ساحل ایلپ کے وہ حصے جن کی آبادی زیادہ تر اطالوی ہے اٹلی کو دے دئے گئے ہیں لیکن اس کی تصدیق کسی مستند ذریعے سے نہیں ہوئی کہ اٹلی کا واقعی ان پر قبضہ بھی ہو گیا ہے۔

اس ناکامیابی کے بعد اٹلی افریقہ کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اس نے برطانوی سو مالی لینڈ پر حملہ کیا، شاید اس وجہ سے کہ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ یہاں پر مقابلہ نہ کرے گا۔ برطانیہ نے مقابلہ کیا بھی نہیں، اس لئے کہ یہاں لڑنے کی بہ نسبت نہ لڑنے میں زیادہ مصلحت تھی اور یہاں کی فوج اور سامان کو مصر بھیج دیا، جو اصل محاذ پر اٹلی مصر پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، اور طرابلس میں ضروری فوج اور سامان جمع کر کے اس کی فوجیں سرٹک بناتی اور ریگستان میں جگہ جگہ پٹرول اور دوسرے سامان کے ڈپو قائم کرتی اور بانی کا انتظام کرتی ہوئی سیدی برانی تک بڑھ آئیں۔ جو مصر کی سرحد کے اندر ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ رک گئیں، اس لئے کہ اب بھی اٹلی کا مقصد لڑنا نہیں تھا بلکہ لڑائی کے اتفاقات سے فائدہ اٹھانا۔ مصر کی طرف بڑھنے کے ساتھ ہی اٹلی نے جنوبی البانیہ پر حملہ کرنے کی تیاری کی، کہ یہاں بھی بغیر لڑے ہوئے

جو کچھ ملے اسے مار لی جائے۔

### جرمنی کے مقاصد

جرمنی کا جنگ سے پہلے یہ اصرار تھا اور اب بھی اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کی نئی تنظیم کی جائے۔ نئی تنظیم کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے، کیونکہ یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی براعظم اور کسی ملک کی حالت کبھی ایسی نہیں ہوتی ہے کہ نئی تنظیم سے اسے بہتر نہ بنایا جاسکتا۔ لیکن نئی تنظیم سے جرمنی کا مطلب یہ تھا اور اب بھی ہے کہ یورپ کی سیاست اور تجارت بالکل اس کے اختیار میں دیدی جائے۔ یورپ کے ان علاقوں کو جہاں جرمن آباد ہیں جرمنی اپنے اندر شامل کر لینا اپنا حق سمجھتا ہے اور آسٹریا، چیکو سلوواکیہ اور آرمینیا پر اسی حق کی بنا پر قبضہ کیا گیا۔ یہ قبضہ نئی تنظیم کے مسئلے سے بالکل الگ ہے۔ نئی تنظیم کے مسئلے میں ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ اور بلجیم پر لشکر کشی کی گئی اور رومانیہ پر تسلط حاصل کیا گیا۔ اب جرمنی کا مقصد یہ ہے کہ اپنے تسلط کو قائم رکھے اور اسے بڑھاتا اور مضبوط کرتا رہے۔

(۱) فرانس کے شکست کھاتے ہی جرمنی اور اٹلی کے تعلقات بدل گئے۔ جرمنی مغربی یورپ میں اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا اگر فرانس اس کا ساتھ نہ دے۔ اس مقصد کے لئے فرانس کے مقابلے میں اٹلی کی دوستی نسبتاً بیکار ہے اور وقتی صلح کی گفتگو چھڑتے ہی جرمنی اور اٹلی کے تعلقات نے پٹا کھایا۔ جرمنی نے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اٹلی کے مطالبوں کو منظور کرانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی اور اپنا رُو ایسا رکھا کہ فوجی انتظامات میں کوئی ٹکاوٹ نہ ہو مگر فرانسیسی کوئی خاص شکایت بھی نہ کر سکیں۔ اسی کے ساتھ جرمنی فرانس کی زندگی کو خاص نازی اصولوں کے مطابق اپنی معاشی تنظیم کے تحت میں لے آیا، کارخانوں کو کام دیا، کارخانہ داروں کی سرپرستی کی، مگر سارا نقد روپیہ اپنے قبضے میں کر لیا اور جتنا مال خرید یا بیع کیا اس کے معاد

میں قرض کے پروانے دے جن کا نقد میں منتقل ہونا جرمن سیاست کے فروغ پر منحصر ہو مارشل پے ٹین اور فرانسیسی حکومت کو راضی کرنے کے لئے ہٹلر نے موسیو لوال کے ذریعے سیاسی گفتگو شروع کی اور اسی سلسلے میں اس کی مارشل پے ٹین سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانسیسی حکومت اتحاد عمل پر رضا مند ہو گئی، لیکن یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ اتحاد عمل کن شرطوں پر ہو گا اور کس حد تک۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ فرانسیسی حکومت جرمنی سے اتحاد عمل کرنے پر راضی ہو گئی ہے۔ اس میں اسے کوئی چارہ بھی نہیں۔ مگر برطانیہ کے خلاف کوئی ایسی کارروائی کرنے پر تیار نہیں جس سے ظاہر ہو کہ برطانیہ سے اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔

فرانس کو اتحاد عمل کی عادت ہو جائے اور اس کی زندگی راہ پر آجائے تو جرمنی کا خیال ہے کہ بلجیم، ہالینڈ اور ناروے بھی اپنی شکست اور جرمنی کے تسلط کو تسلیم کر لیں گے اور یورپ کی نئی تنظیم کا ایک اور مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔ بلجیم کے بادشاہ لیو پولڈ نے ہٹلر نے معاملے کی گفتگو شروع کر دی ہے، لیکن اس کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

(۲) مغربی یورپ کی سیاست یورپ کی نئی تنظیم کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو جرمنی کا ہنگری، رومانیہ اور بلقان پر تسلط ہے۔ ہنگری سے اس کو غلہ، رومانیہ سے پٹرول اور غلہ، بلقان سے غلہ اور بھاری صنعت کے لئے کچھ اور ضروری خام اشیاء مل سکتی ہیں۔ دریائے ڈینیوب جنوب مشرقی یورپ کی سب سے بڑی تجارتی شاہ راہ ہے اور اس کو کھلا رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ جن ملکوں سے وہ گزرتا ہے وہ جرمنی کے کہے میں ہوں۔ جرمنی نے پہلے تو رومانیہ کے دو شمال مشرقی ضلع جن پر روس کا دعویٰ تھا روس کو دلوا دئے اور جنوب مشرق میں ضلع دو بروجا بلقارہ کو، پھر ہنگری کو ٹرین سلوینیا کا بیشتر حصہ دالوا کر اسے خوش کر دیا اور آخر میں کچھ بچ رہا تھا اس پر خود قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی سمجھ میں بھی آ گیا

کہ جرمنی کی خوشامد کے بغیر چارہ نہیں اور وہ بھی جرمنی کی معاشی تنظیم کے ماتحت ہو گئے۔ یہاں  
 طح جنوب مشرقی یورپ میں جرمنی نے ایک مورچہ بنالیا جو فی الحال خاصا مضبوط  
 معلوم ہوتا ہے۔ اس مورچے کی تعمیر میں روس بھی شریک ہوا تھا اور اسے قائم  
 رکھنے میں بھی شریک رہے گا جب تک کہ اس میں جرمنی سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔  
 (۳) جرمنی کے مغربی اور مشرقی دونوں مورچے ٹوٹ سکتے ہیں اگر برطانیہ جنگ  
 جاری رکھ سکا۔ جرمنی کی دولت اور اس کے جمع کئے ہوئے مختلف قسم کے ذخیرہ  
 کا لڑائی سے پہلے جو اندازہ کیا جاتا تھا وہ بالکل غلط نکلا ہے، لیکن جنگ جاری رہی  
 برطانیہ اسی طح جرمنی کے کارخانوں پر حملے کرتا رہا اور امریکہ سے اس کو ضرورت  
 کے مناسب مدد پہنچتی رہی تو جرمنی کے معاشی کرب کام نہ آئیں گے، اور یورپ کی  
 جو قومیں اس وقت مجبور اور عاجز ہیں سب اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی۔ اسی  
 وجہ سے جرمنی نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی اصل لڑائی برطانیہ سے ہے۔ اس نے ہوائی  
 حملوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہے، نومبر سے اس نے برطانیہ کے تجارتی جہازوں  
 کو ڈوبنے کے لئے بہت سے ابدوز اور ہوائی جہاز الگ کر دئے ہیں جو درہم سند  
 میں جا کر اپنا کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب پُرانی ترکیبیں ہیں جو بس شروع میں کسی قدر  
 کامیاب ہوتی ہیں۔ خود جرمنی کو بھی ان کے کارگر ہونے پر بھروسہ نہیں مٹتے ہیں  
 اسی وجہ سے جرمنی نے فرانس کے شمالی ساحل پر مازنی نولائن اور زیگفریڈ لائن کے  
 نئے مورچے بنائے ہیں، کہ فرانس اور بلجیم اور ہالینڈ کے ساحل پر کہیں برطانوی  
 فوجیں اتاری نہ جاسکیں، لیکن انسانی آزادی کی لہروں کو ایسے مورچے بھی کبھی روک  
 نہیں سکتے۔ بس لہروں کے اٹھنے کی دیر ہے۔

### جنگ کی موجودہ صورت

جیسے ہی فرانسیسی حکومت نے جرمنی سے اتحاد عمل کا وعدہ کیا، دیے ہی

اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا (۱۸۲۷ء) اس حملہ کا شاید اور کوئی مقصد تھا بھی نہیں سوا اس کے کہ ایک کمزور ملک کو شکست دے کر اٹلی اپنی سیاست کی آبرو بچائے لیکن یہ مقصد پورا نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس اٹلی نے منہ کی کھائی۔ یہ ان فوجوں کی خبر لینے کا بہت اچھا موقع تھا جو اٹلی نے سیدی برانی میں جمع کی تھیں۔ مصر کی برطانوی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ ایسی بودی نکلیں کہ کہیں پر مقابلہ بھی نہ کیا، بس جان کو غنیمت سمجھ کر بھاگتی ہی رہیں۔ ثابت قدمی اور جواں مردی کے اس مظاہرے نے اٹلی اور اس کی سیاست کو بالکل بے آبرو کر دیا ہے اور اب اٹلی دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا اگر جرمنی نے اس کی مدد نہ کی۔ لیکن جرمنی اس کی مدد کیوں کرے؟ اٹلی کے سبب سے اس کو فرانس سے سمجھوتہ کرنے میں دشواری تھی، اٹلی کے سبب سے یوگوسلاویہ اور ترکی دونوں جرمن سیاست سے بہت بدظن تھے اور اب اس کی شکست سے جرمنی کے بہت سے کام آسان ہو جائیں گے۔ پھر اٹلی کی مدد کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ اٹلی کا بیڑا اس کی فوج سے کچھ کم جاں باز نہیں، جب سے جنگ چھڑی ہے وہ برطانوی جہازوں سے پٹیا یا منہ چھپا کر بھاگتا رہا ہے۔ اگر جرمنی اپنی فوجیں اٹلی کو مدد پہنچانے کے لئے افریقہ بھیجے تو ان کی سلامتی کا دار و مدار اٹلی کے ہیرے پر ہو گا۔ رومانیہ میں جو جرمن فوجیں جمع ہیں انھیں یونان بھیجنے کے لئے بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی رضامندی درکار ہے، کیوں کہ فوجوں کو انھیں ملکوں میں سے گزرنا ہو گا اور یہ دونوں ریاستیں جرمنی کو رستہ دینے پر رضامند نہیں ہوں گی، اس لئے کہ ان ملک پھر میدان جنگ بن جائے گا۔ یونان میں بھی اٹلی کو اپنی گیدڑ بھکیوں کی سزا اکیلے بھگتنا ہو گا۔

اٹلی کی سیاست ایک زمانے میں اہمیت رکھتی تھی، اب وہ زمانہ ختم ہو گیا ہے غالباً جرمنی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر فرانس اور ہسپانیہ سے تعلقات بڑھائے گا۔



فرانس سے اس کو اتحاد عمل کی جو خواہش ہے اس کے اباب بتائے جا چکے ہیں، ہسپانیہ سے تعلق بڑھانے کا مقصد یہ ہوگا کہ بحرِ رومِ برطانیہ کے لئے باطل خطرے سے خالی نہ ہو جائے، اور ہسپانیہ جبل الطارق کا مطالبہ کر کے برطانوی جہازوں کی آمد و رفت میں خلل ڈالتا رہے۔ لیکن اس کی بھی خبریں آتی رہی ہیں کہ اٹلی میں جرمن فوجیں پہنچا دی گئی ہیں۔ جو ممکن ہے ازرقہ بھی جائیں اور ممکن ہے یونان۔ جرمنی کے رویے کا صحیح اندازہ ان خبروں کی تصدیق کے بعد ہی کیا جاسکے گا۔

### امریکہ اور برطانیہ

امریکہ کی متحدہ ریاستوں کی غیر جانب داری ویسی ہی اصطلاحی ہے جیسے کہ ایکسٹرا میں اٹلی کی تھی، یعنی انھیں برطانیہ سے ہمدردی ہے مگر وہ جنگ میں شریک نہیں ہیں، اپنے غیر جانب داری کے قانون سے وہ مجبور ہیں کہ برطانیہ کے ہاتھ جو کچھ چاہیں اس کے دام نقد وصول کریں۔ اب تک تو برطانیہ نقد دام دیتا رہا ہے، یا ایسا سودا کیا ہے جیسے کہ دو سو جنگی جہازوں کے بدلے بحرِ اٹلانٹک میں چند فوجی مرکز امریکہ کو دے دینا۔ لیکن اب نہ تو نقد دام دئے جاسکتے ہیں نہ کوئی سودا کیا جاسکتا ہے، اور امریکہ کو یا تو اپنا غیر جانبداری کا قانون بدلنا ہوگا یا کوئی اور ترکیب کرنا۔ امریکہ کے مدبر اس کے لئے بھی آمادہ ہیں، اس لئے کہ برطانیہ اس وقت جمہوری اصول زندگی، قومی خود مختاری اور انفرادی آزادی کا مجاہد بنا ہوا ہے اور اس کی مدد کرنا ہر جمہوری ریاست کا فرض ہے۔ امریکہ مدد پہنچانے کا جو طریقہ بھی اختیار کرے، دنیا کی ان دو بڑی جمہوری ریاستوں کا تعلق بڑھتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔ ممکن ہے لڑائی کے بعد پھر دونوں الگ ہو جائیں، ممکن ہے ان کی سیاست اور تجارت انھیں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دے کہ پھر وہ علیحدہ نہ ہو سکیں اور ان کے رشتے کی مضبوطی دنیا میں جمہوریت کا سہارا بن جائے۔

# سائنس اور مذہب

آج ہم تاریخ کے بڑے سیمانی دور میں سائنس لے رہے ہیں صحیح معنوں میں اس کو انقلابی زمانہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہم اپنی روحانی اور مادی تہذیب کے ہر شعبہ میں ایک نازک نقطہ پر پہنچ گئے ہیں اور اس ڈرامہ میں جہاں اپنے عروج کے قریب پہنچ چکا ہے ہم بیک وقت اداکار بھی ہیں اور تماشائی بھی۔ اس تماشکا دور عالم کی عمر آفریں رنگینیوں میں شاید خاص اداکار سائنس ہے جو ہمارے تمدن کے تمام کارناموں کے پیچھے سب سے بڑا محرکاتی عنصر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عظیم اثنان ایجادات اور انکشافات، اس کے زندگی کے نئے رجحانات، اس کے اخلاقی اور روحانی توقعات نے انسان میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ موجودہ زمانے میں خیالات اور نظریے کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اور فرسودہ مسدود اور مردوبات کا گرد و غبار جو ہماری زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اس کی تابناک روشنی میں چھٹنا نظر آتا ہے۔

سائنس ایک نئے مذہب، نئی سماج اور نئے ادب کی تخلیق کر رہی ہے اور سچ تو یہ ہے اس کی کوشش ایک نئے انسان کا عالم وجود میں لانا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنس کا یہ تفاعل انسانی تصورات اور نظریوں پر کیونکر اثر انداز ہوا۔ کس طرح سماج، مذہب اور تمدن اپنے موجودہ درجوں تک پہنچے ہیں اور پھر سائنس کس انداز میں ان کی موثر نگری کر رہی ہے؟ سائنس ہمیشہ ایک ناقداۃ اور غیر متعصبانہ طرز عمل کی سفارش کرتی آئی ہے جس کی بے لاگ خارجیت کسی سے خواہ مخواہ مرعوب نہیں ہوتی۔ دنیا کے وسیع علوم کے خزانہ میں غالباً یہ اسی کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

ہر جہاندار شے پر دو قسم کے ماحولی اثرات کا عکس پڑتا ہے۔ ایک خارجی یا اجتماعی اور دوسرا داخلی یا روحانی ہم انہیں دو ماحولوں کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ اسی خارجی عنصر کے ذریعہ ہم بیرونی دنیا سے وابستہ رہتے ہیں۔

---

اس مقالہ میں تمام مذہبی اعتقادات اور روایات سے قطع نظر کر کے خالص عقلی اور استدلالی پہلو سے گفتگو کی گئی ہے

مگر ہم اپنی اس اندرونی حکومت میں "شدید انفرادی" حیثیت رکھتے ہیں جہاں ہم اپنے وجود کے الگ الگ ملک سمجھ جاتے ہیں ان دونوں کے سناروں میں ان کے اپنے قوانین اور ضروریات کی حکومت ہے۔  
طبیعیاتی نظام میں ربط پیدا کرتی ہے اور فطرت کو تسخیر کر کے ہماری جہانی آسائش کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔  
اور مذہب ہماری داخلی دنیا پر مادی ہونے کے باعث ہماری اخلاقی فلاح کا ذمہ دار بنتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ یہ دونوں نظام جو ہماری زندگی کی دو مختلف طریقوں سے رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسے ایک سوت و دو الگ الگ راستوں سے بہہ کر ایک ہی خطہ زمین کو سرسبز و شاداب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے میں ہم آہنگی نہ پیدا کر لیں اور انسان کی ہمہ گیر ترقی میں اضافہ نہ کریں۔

یوں اپنی عمومی حیثیت میں سائنس اور مذہب میں کسی طرح کا تضادم و ردائیں نہیں ہوتا مگر سائنس اس مذہب سے ضرور دست و گریباں نظر آتی ہے جو رواجی معتقدات کے خوفناک ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔  
بلا توجہ و بصیرت اور سچائی کے اصول کی تردید کرتی ہے جو تمام سچے مذاہب کے بنیادی اصول ہیں۔ مذہب کے اس اخلاقی پہلو پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سائنس ہمیشہ مذہب سے جھگڑا کر لیتی ہے درست نہیں۔ سائنس کبھی یہ تبلیغ نہیں کرتی کہ کبھی سچ نہ بولنا چاہئے یا "دوسروں کی خدمت کرنا ٹھیک نہیں" یا "نبی نوع انسان کو تباہ کر دینا چاہئے" بلکہ اس کے برخلاف جہاں تک اخلاقی اور طبیعیاتی بہتری کا تعلق ہے سائنس ہمیشہ مذہب کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے تیار رہی ہے۔ پس ہمیں اس تضادم کا سبب کیوں اور تلاش کرنا چاہئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور مذہب میں ٹکناں کا بنیادی سبب خدا کا تخیل ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سائنس کے پرستاروں میں سے اکثر دہریہ ہیں اور تمام بڑے بڑے مذاہب (سوائے بدیت کے جیسا کہ مہاتما بدھ کی تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے) سب کے سب خدا یا دیوتاؤں کا سہارا خاص طور پر مٹھوں پر ہیں۔ خداوندی تصور کا ارتقاء اپنی مختلف منزلوں میں محدود رہا مگر نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس میں انسانی شور کی داستان پنہاں ہے۔

انسان اس دور سے گزر چکنے کے بعد جس میں وہ ہوا اور سورج بارش اور گرج کے سلسلے حیوانوں

کی طرح سرسجود ہوتا تھا، بظاہر خدا کا کوئی تصور قائم نہ کر سکتا تھا۔ اسے ایک بے حس احساس کے ساتھ بعض طاقتوں اور اثرات یعنی منہروں اور جاووں کا اعتراف تھا جو اس کے نزدیک قدرت کے جلووں میں چھپے ہوئے اور طلسماتی طور پر بعض چیزوں اور محرکات میں خوابیدہ تھے۔ بیچونا اور پولینیا کے علاوہ نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے گروہ اب بھی انہیں فرسودہ اعتقادات کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ جب اس کی ہستی کے دہندے اثرات بڑھتے گئے تو اس نے ان شخصیتوں کے مابین مطابقت پیدا کر لی جس سے اسے دو چار ہونا پڑا تھا بلکہ میں یہی شخصیتیں مختلف دیوتاؤں کی شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ تو ہم پرستی پیدا ہوتی ہے اور کچھ دنوں کے بھر یہ اصنام پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ارتقا کی منزلوں میں اس کے بعد وحدانیت کا درجہ ہے۔

خدا یا دیوتاؤں کے اس تصور کے چاروں طرف سادہ ہوں اور پیروں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جاتا ہے ان کی زندگیاں، ارشادات، شاعرانہ ظاہری اور مراسم سب مل کر ترویج مذہب کے میدان کو وسیع کرنے میں امداد کرتے ہیں۔ پھر قدرت قوم میں ایک پیغمبر بھیجتی ہے جس کی آتش بیانی کا سیلاب پھیلے اعتقادات کو خوں خاشاک کی طرح بہا لجا آتا ہے اور قوم کو ایک مطمح نظر متحد کر دیتا ہے اور خدا یا دیوتاؤں کا تخیل ہمیشہ اس مطمح نظر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا انسانی فطرت کی تمام خوبیوں — نیکی، حقانیت اور حسن — کا سرختمہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ مذہب کی یہ سادہ صورت اپنی جگہ بڑی پاکیزہ چیز ہے کیونکہ یہ عوام کی جہانی اور روحانی صلاحیتوں کے اُبھارنے اور چمکانے میں امداد کرتی ہے۔ دہریت اپنی عملی صورت میں ایک دو درجہ ہاری تلوار کا سا کام کرتی ہے۔ چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جو ایک طرف سچے دہریے ہوں اور دوسری طرف اخلاق کی کسوٹی پر بھی پورے۔ انہیں ایک عمومی انسان حب خدا کا قائل نہیں رہتا تو وہ اپنے دوجوی مقام سے ہٹ جاتا ہے اور کسی طاقت کا سارا اس کی جہانی اور اخلاقی عمارت کے کھنڈر کو گرہنے سے نہیں روک سکتا اگر کوئی مذہب اتنا سادہ ہو یا یوں کنا چاہے کہ اپنی عملیت میں اتنا سادہ نظر کرے تو شاید سائنس اور مذہب میں کوئی دہرہ مخالفت باقی نہ رہے۔ لیکن کوئی مذہب کم از کم اپنی ظاہری صورتوں میں اس حد تک سادہ اور کلل و کھائی نہیں دیتا۔ وجہ تو یہاں تعصب مذہبی پیشواؤں کی خود غرضانہ مصلحتیں اور دوسرے مذاہب کے

نظاموں سے جنگ آزمائیاں ان سب بحرانی اثرات نے ہر مذہب کی اہلی صورت مسخ کر کے اس کو مہرستا اور رسوم کا احمقانہ اور بچیدہ گھونڈہ بنا دیا ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اصنام پرستی کے دور تک خدا کا تصور پیدا ہوا اور اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنسی فکریہ نے اس پر کس طرح اثر اندازی کی ہے؟ فرانسس بیکن اور گی لیلو ان مردان مجاہدین سے ہیں جنہوں نے فکری آزادی کی راہ میں روشنی دکھائی ہے سائنس کی تحقیقات اور شہادت کو مختلف مذہبی نظاموں کے مسلمہ عقائد سے دوچار ہونا پڑا۔ مذہب کے سچے اور پر غلوں پرستاروں نے ان باغیانہ خیالات کو روکنے کی سختی سے کوشش کی۔ گی لیلو اور بروڈنورا ایسے ہی کتنوں کو اپنے بلند آہنگی سے سو پھنکے کہ جرم میں بڑی گراں قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ کیونکہ مذہبی مطلق العنانی کی بارگاہ میں یہ بڑا ہولناک جرم سمجھا گیا۔ مگر یہ سب خفیاں اور مظالم جو مذہب کے پردہ میں ہوئے عقل پرستی کی اس آنے والی روح کو پتہ نہ نہ کر سکے۔ نہ شائد ثانیہ کا دور آیا اور اس کے سایہ ماطفت میں ذہن اور دلیل کو بچھنے پھولنے کا موقع ملا اور کسی طرح کی چہرہ دستی انسان کی ازلہ پیاس کو بجھانہ سکی۔ سائنسی روح عالم وجود میں آجائے کے بعد روشن خیال طبقہ نے مذہب کے بھی بندھنوں کو توڑنا شروع کر دیا اور صدیوں کی دست اندازی کے خلاف گویا احتجاجی طور پر انہوں نے خدا کے تصور کو بھی ایک ڈھکوسلا قرار دے کر مسترد کر دیا۔

مگر اس بیسویں صدی میں پھر خداوندی تخیل نے حیرت انگیز طور پر نئے سرے سے جنم لیا ہے۔ پہلی فیمینی کے نشہ کے بعد سائنسدانوں میں زیادہ سنجیدگی اور ذہنی روحانیت پیدا ہو گئی۔ ایک تمدن سائنسدان بقنا زیادہ کائنات کی پنائیوں میں اپنے آپ کو کھودیتا ہے۔ اسی قدر وہ ریاضیاتی صحت سے زیادہ متعجب ہوا اور اور طبع و حصول کا بچاؤ تعلق اسے اس حد تک انگشت بندھاں کرتا ہے کہ اس کو ہمیشہ کے لئے ہر چیز میں یک بنیادی قانون اور منشا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک ممتاز سائنسداں کے الفاظ میں خواہ اسے قوت کا جائے یا رہنما یا عنصر یعنی دوسرے معنوں میں خدا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کائنات کی ہر چیز میں ایک غرض اور ایک منشا کی کار فرمائی ہے۔

حیاتیاتی نقطہ نظر سے بھی کسی خالق کے تصور کے باقی رکھنے کی ضرورت ہے جب تک کہ سائنس ”نگی“

کی تخلیق میں ناکام رہتی ہے، درنظر محض، کا نظریہ جو ایک زندگی سے دوسری زندگی اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے اب تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ میری خیال کی روشنی میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اولین زندگی پھر کس واسطہ سے پیدا ہوئی؟ ایک سائنس دان نے کہا اگر مجھے ادلیں مادہ ادلیں دیدیا جائے تو ارتقا کے ایک سادہ حل کے ذریعہ سے میں زندگی کی سب سے مختلف النوع شکل پر پہنچ جاؤں گا، حیاتیات کے ایک فرانسیسی عالم نے یہ انوکھا نظریہ پیش کیا ہے کہ دنیا کی اولین زندگی پہلے آسمانی اجرام میں سے کسی پر قائم تھی جس سے ایک ذمہ زمین اتصال میں آئی اور پھر اس کو جاندار حلویہ ملا لیکن یہ سب ایسا ہی ہے کہ سوال کو دلیل سمجھ کر اپنے آپ کو دہرایا دے لیا جائے اور اس کو زائے کے پھیلاؤ سے ایک قدم اور پیچھے بنا دیا جائے کیونکہ یہ مسئلہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ ”زندگی“ اس سرکش کروہ پر کس طرح نمودار ہوئی؟ سائنس اس کا جواب دینے میں سکت نظر آتی ہے۔ خدا کے بحث پر اس کو خاموش رہنا ہی آسان نظر آتا ہے کیونکہ وہ اس کا اقرار کر سکتی ہے اور نہ انکار جیسا کہ ایک معین نے کہا ہے سائنس کی صحیح دعایہ ہوگی ”اے خدا... اگر اس کا وجود ہے، میری روح کو بچا... اگر یہ کوئی چیز ہے... کیونکہ روح ایک دوسرا معلول ہے جس کے وجود کے متعلق سائنس نے غمخوشی کو دانشمندی سمجھا ہے۔

گرچہ ہمیں یہ تفاوت سائنس اور مذہب کے امین کوئی تضاد پیدا نہیں کر سکتا، اگر آج تمام مذاہب کے مختلف نظام اپنے عقیدے عقل حوّل اور اولم پرستیوں، دنیاؤسی خیالوں اور یہودہ ظاہر داریوں کی اصلاح کی کوشش کریں اور اصول اخلاق اور انسانی بھلائی کے دہن عاطفت میں سکون کی تلاش کریں تو شاید خدا اور روح کے مسئلہ میں اتنی پیچیدگی باقی نہ رہے۔ سائنس کے بنیادی اصول مادہ اور قوت ہیں۔ ان کا کھوج لگانے کیلئے ایک ہر خیمہ کی تلاش ضروری ہے۔ سائنس دانوں کو حقیقت میں فی الحال خدا کے وجود پر نہ اعتراض ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

گرچہ اصل تضاد سائنس کے حکمانہ طرز عمل اور مذہبی عقائد کے فرسودہ اصولوں اور روایات کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے بہت سے سائنس دان اپنی ابتدائی نعتیہ یوں کے پندار میں یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکے کہ انسان کا داخلی یا روحانی ماحول خود اپنے قوانین کی بنیادی میں کام کرتا ہے اور سائنسی قوانین جو خارجی طاقت پر حکمرانی کرتے ہیں وہاں اسی درجہ پر جائز قرار نہیں دئے جاسکتے۔ روحانیت کی موجودہ تحقیقات اور تحلیل نفسی نے ان قدامت پسند سائنس دانوں کے اس فکری

گرد و غبار کو پوری طرح صاف کر دیا ہے۔ جدید سائنس۔ کامیاب علم کی تفتیش میں پیدا ہونے والی انکساری کی روشنی میں یہ دیکھ لیتی ہے کہ وہ کائنات کے اس بسیط جیتان کے متعلق کچھ نہیں سیکھ سکی۔ اب انڈنگٹن اور جنرل جیے متنازع سائنسدانوں کی رہنمائی نے اس کا تعین سستی روحانی طور پر کیا ہے اور وہ مادہ اور ادراک کے روحانی پہلو کو زیادہ نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ جوتین ہکس نے لکھا ہے۔ اس زمانہ میں کوئی حقیقی سائنسدان اس کی اہمیت کو یہ لکھ کر نہیں کر سکتا کہ مذہب جیسی کسی شے کا کوئی وجود نہیں اور یہ کسی دوسرے عالم کی چیز ہے یا یہ ایک عجیب ہر اس ہے یا لطیف منہی و مدان یا خوش اعتقادی اور منافرت کا ایک امتزاج ہے۔

دونوں کے تہذیبی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی سائنس اور مذہب کی موجودہ صورتوں میں بڑا اختلاف ہے سائنس نے ہمیشہ خیالی اور عملی آزادی کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ذہن کو سوچنے کے لئے آزاد چھوڑا ہے اور اس نے کبھی پرانی روایات کا خواہ مخواہ لحاظ بھی نہیں کیا۔ لیکن مذہبی شعائر اور خصوصاً وہ جہتج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں رسم و رواج کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ان میں مایوسانہ حد تک قدامت کی بو آتی ہے۔ انہوں نے اس حقیقت سے بالکل چشم پوشی کر لی ہے کہ پچھلی صدیوں میں انسان حیرت انگیز طور پر ترقی کو چکا ہے اور اس کے ذہنی مطالبات کو صرف حکیمانہ قول و عقیدہ اور دعا کے خیر زیادہ دنوں تک یہ تو فائدہ نہیں بنا سکتے مختلف زمانوں میں مصلحین نے قدیم اور جدید ذہنی سیلانوں کا اختلاف مٹانے کی کوشش کی مگر محض ایسی مادیوں سے کب کام چلا ہے؟ اگر مذہب انسانیت کی تلاش ہے تو ہمیں ”طرح نو“ ڈالنا ہوگی۔

ہم غیر محسوس طور پر مذہب انسانیت کے لئے بے چین ہیں۔ مگر ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور اور دشمنوں کے پھیلے ہوئے جال نے ہماری اجتماعی زندگی کی قیمتوں میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ دنیا کی تہذیب اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں روایت اور عقیدہ کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ اور اس تدال کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری زندگی کی تغیروں کو اب شاید آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اثرات مادہ فاسد کی طرح خطرناک حد تک پھیل چکے ہیں۔ اس دور میں ایسے مذہبی نظام کی ضرورت ہے جو حالات کی ان پیچیدگیوں میں روحانی اور ذہنی اضطراب کی تسکین کر سکے۔ اس کو بالکل استدلالی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد ان تمام شدید اختلافات کی تیج کنی کرنا ہوگا

جس سے متاثر ہو کر آج ایک مذہب دوسرے مذہب کا اور ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اس کو کسر لکچدار ہونا چاہئے تاکہ وہ نئے خیالات اور نئے نظریوں کو اپنے اندر سمو سکے۔ اپنی روحانی حیثیت میں دلچسپی رجحانات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ تاکہ انسانی ذہن اور انسانی آرزو مند یوں کی پوری طرح امداد کر سکے مگر اخلاقی نقطہ خیال سے چوں کہ اس کا فرض سماج کی اخلاقی اور مادی صلاح کی پوری پوری نگرانی ہو گا اس لئے اس کا حکم ہو گا کہ اس کے قوانین کی سختی سے پابندی کی جائے۔ اس نظام کے ماتحت خداوندی تصور کے بارے میں ہر شخص کو پوری پوری فکری آزادی دی جائے گی مگر اس کا واحد اور اساسی مقصد انسانیت کی خدمت ہو گا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اب اس صورت میں جس میں وہ جلوہ فرما رہے ہیں عیسائی حیثیت کو نہیں پہنچتا۔ مگر اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام نمایاں مذاہب سے قطع تعلق کر لیا جائے ضرورت اس کی ہے کہ ان کے روشن پہلوؤں کی نئی تشکیل کر کے ان میں ہمہ گیر اثریت پیدا کی جائے جو پوری انسانیت کو متاثر کر سکے ممکن ہے کہ اس کو خیال پر تائید منسوب سمجھا جائے مگر اب یہ ایک بے بنیاد خواب نہیں ہمارے نقطہ نظریں پوری تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ ظاہر داری اور مصیبت کی اس فضا کو پاک کیا جائے۔

بہت سے شعراء و فنکارین نے آنے والے انسانی مذہب کا رنگین خواب دیکھا ہے بعضوں کے نزدیک مستقبل ایک "بین الاقوامی جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو اس میں آنے والے "ممد سعادت" کی ہمک اپنی دلچسپیاں دکھاتی ہے پس کوئی تعجب کی بات نہیں اگر بہت سے حلقوں میں مالگیر مذہب "کے تصور کو محکمہ فیز سمجھا گیا اور دوسری طرف کچھ لوگوں کو مستقبل کی بنیادوں میں اس روشنی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ مذہبی اور انسانی معتقدات کے امین مستقبل قریب میں پھر جنگ آدائیاں شروع ہو جائیں۔ مگر یہی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ انسان جتنا زیادہ تمدن ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی حقیقت اور سکون کی تلاش بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتوں اور سماجی بلندیوں کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی تصورات کو حقیقی اور بہتر صورتوں میں دیکھے جس کا مطمح نظر ایک ایسے مالگیر مذہبی نظام تک پہنچنا ہے جو روحانی توقعات اور انسانی فکریات کو ابھی استواری اور ہم آہنگی کے رشتہ میں جوڑ دے۔

مقبول الرحمن صاحب بی۔ اے (آنر)



# مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

(گزشتہ سے پیوستہ)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری پر مجموعی نظر [تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع مطالعہ گہرا اور نظر دور ہیں جو جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادب کا شناور بھی ہو جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشیں کر سکتا ہے۔] تنقیدات عبدالحق صفحہ ۹۹،

ان تمام شرائط پر مولوی صاحب کے خیال میں صرف مولانا مآلی کی ذات پوری اترتی ہے ان کی اس رائے سے تمام دکال اتفاق کرنے کے بعد ہم ذوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مآلی کے بعد جس شخص نے صحیح معنوں میں ان کی تنقیدی روایات کو قائم رکھا اور اعلیٰ تنقید نگاری کو جس شخص نے اردو میں رائج کیا وہ خود مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔

ایک خط میں مولانا مآلی بھی ہمارے خط کی تائید کرتے ہیں اور مولانا کی تنقید نگاری کی داد دیتے ہیں مضمت حیات النعیمی نے اپنی کتاب یہ مولانا مآلی سے ریویو لکھایا تھا لیکن اس کے شائع ہونے سے قبل مولوی عبدالحق صاحب کی تنقید شائع ہو گئی اس پر مولانا نے مولوی صاحب کو لکھا۔

”اب آپ کے ریویو کے بعد اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں ہے مضمون کے لحاظ

سے میرے اور آپ کے ریویو میں اختصار و اشباع یا ناقص و کامل کے سوا کچھ فرق نہیں“

(رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۷ء صفحہ ۱۹)

مولانا عبدالحق انگریزی دانی اور جدید علوم خصوصاً فلسفہ اور تاریخ سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے نئے خیالات اور ترقی یافتہ زبانوں کے جدید ادب سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں خصوصاً اصناف ادب کے متعلق وہ بہت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور تنقید نگاری کے جدید ترین اصولوں کے علاوہ اس

فن کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں۔ مولوی صاحب کی نظریں جب کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کے سنجیدہ اور علمی پہلو پر پڑتی ہیں۔ وہ جب کسی چیز پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو اس مضمون کی ساری وسعت اور پورے ماحول پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے آپ کی تنقیدیں بہت مکمل ہوتی ہیں۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدیں نہایت محققانہ اور مبہرانہ ہوتی ہیں۔ ان میں ان کی ذاتی تحقیقوں کو بھی جو کہ محنت و سچائی میں مسلک ہوئی ہیں بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ریسرچ کی مشائے نثر سے مزین ہو جاتی ہیں۔ وہ خود ادبی نکات اور معلومات کا مخزن ہوتی ہیں۔ اور اس طرح دنیا کی بلند ترین تنقیدوں کے میاں پر کامیابی سے پرکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے تعصب اور رنگ نظری سے بہت بلند ہیں۔ وہ تنقیدی مسالمت میں صرف مطالبات ادب کا خیال رکھتے ہیں اور علم سے علم کی خاطر بحث کرتے ہیں اس لئے ان کی رائے غیر جانبدارانہ ہوتی ہے اور اسی لئے ان کی تنقیدیں قابل وقت و قابل قدر اور مقبول ہوتی ہیں۔

چونکہ مولانا ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں جو کہ انتہائی سادہ اور ساتھ ہی ساتھ شگفتہ بھی ہے۔ اور اپنے قلم کو خیالات سے منسوب نہیں ہونے دیتے اس لئے وہ اپنی وقعہ رایوں کو بہت اچھے اسلوب میں لوگوں کے سامنے پیش بھی کر سکتے ہیں جو اپنی جگہ نہایت ہی دلکش اور موثر ہوتا ہے۔

مولوی صاحب میں بزرگی اور خمیدگی فطری ہے یہی خصوصیات ایک فطری نقاد پیدا کرتی ہیں یعنی یہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کو جس طرح تنقید نگاری کے لئے تیج دیا ہے اور اپنی زندگی کا بلند ترین مقصد بنالیا ہے اس طرح اردو زبان کیا ایشیائی زبانوں میں کسی نقاد نے نہیں کیا۔

مولانا کے ادبی کارناموں کو اگر یورپ کی ترقی یافتہ زبان کے نقادوں کے مقابل میں تو لایا جائے تو کبھی کسی حیثیت سے بھی کم نہ نکلیں گے بلکہ ان کی تنقیدوں اور علمی کوششوں کے ساتھ ساتھ اگر ان کی تحقیقی معلومات کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ ان میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب ایسے ملک اور ایسی قوم میں پیدا ہوئے ہیں جو اپنے خادموں اور رہنماؤں کی صحیح قدر نہیں کرتی اور نہ ہی صلاحیتوں

سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے نہیں چاہئے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ قدر کریں اور ان کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

اردو زبان و ادب پر مولانا کی جس طرح جاتی نے اردو ادب میں تنقید نگاری کی بنیاد ڈال کر ہماری زبان کی تعقیدات کا اثر اور ان کی اہمیت بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح مولوی عبدالحی صاحب نے تنقید نگاری کو کمال و عروج تک پہنچا کر نہ صرف اردو تنقید نگاری کو سہی دنیا کی بلند ترین زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا ہے بلکہ ہماری زبان و ادب کا معیار بلند کر کے اس کو دنیا کی صف اول کی زبانوں کے مقابلے میں ترقی دینے کی کوشش کی ہے اور وہ دن دو نہیں جب آپ کی ان تنقیدی کوششوں سے اردو زبان انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں شامل ہونے لگے گی۔ زبان پر تنقید نگاری کے اثر سے بحث کرتے ہوئے ہمیں اس چیز کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ زبان و ادب کی ترقی میں نقاد کی کوششوں کا اثر زیادہ تر بالواسطہ طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ہم اس کی تنقیدی خدمات کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جب تک کہ زبان و ادب کے موجودہ ماحول اور جدید ترقیوں کو اس کے کارناموں میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبان و ادب کی تمام تر ترقی صرف تنقیدی کوششوں کا ہی نتیجہ ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زبان اور لٹریچر کی اصلاح و ترقی میں تنقید نگاری کے علاوہ دوسرے عاملین بھی اثر رکھتے ہیں اور وہ ماحول تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حالات ہوتے ہیں لیکن ان موافق حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نقاد کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی ادیبوں کو نئی شاہراہیں دکھا کر ترقی کی طرف راہنہ کرتا ہے لہذا زبان و ادب کی ترقی میں نقاد کی کوششوں کو ہی بنیادی کوشش سمجھنا چاہئے۔

اگرچہ عام تنقیدی کوشش نہ کسی ایک فرد کی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ کسی ایک کے بس کی ہوتی ہے لیکن جس طرح سورج کی تمام قوت تمام عالم میں کار فرما ہوتی ہے اور اسی کے گرد تمام سیارے چکر لگاتے ہیں اسی طرح ایک سلسلہ نقاد کی شخصیت ہوتی ہے جس کی روح جس کے خیالات اور جس کا پرتو اس کے دور کے ہر نقاد اور ہر ادیب پر ہوتا ہے اسی کے دم سے ادبی رجحانات قائم و دائم رہتے اور اسی کے اشاروں پر بدلتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان میں عناصر خمسہ کا دور اس کی عین مثال

ہے جس کا مور اس وقت کے سب سے بڑے مصلح مر سید تھے جن کے خیالات و افکار اور جن کی قوت عمل ان کے معاصرین میں کارفرما نظر آتی ہے اور انہیں کے مشوروں سے اس زمانے کا تحقیقی ادب وجود میں آیا لیکن اس دور کے خاتمہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے جدید دور میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوتا ہے جو زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ گذشتہ دور سے قوت عمل میں کی طرح کم نہیں جس کی فطری صلاحیتوں اور نقادوں میں کسی کو کلام نہیں جس کے خیالات طرز تحریر اور تنقید نگاری کا اثر موجود زمانے کے تمام ادیبوں پر نظر آتا ہے۔ اور اس زمانے کے ناقدین بھی انہیں کے پیرو ہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کی شخصیت ہے جو اردو کی عنان قیادت ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اور موجودہ زمانے میں جتنی بھی اصلاح زبان اور ترقی ادب کی کوششیں ہو رہی ہیں ان سب میں بالواسطہ مولانا کی تنقیدات کا زبردست حصہ ہے۔

زبان و ادب کی ترقی۔ مولوی صاحب نے اگر ایک طرف زبان کی اصلاح کی ہے اور اسے سنوارا ہے تو دوسری طرف اس کی استعداد کو موجودہ حالات اور علوم جدیدہ کی ضروریات کے مطابق بہت وسعت دی ہے۔ بہت سے متروک الفاظ رائج کئے۔ جہاں ضرورت ہوئی نئے الفاظ کی تشکیل کی اور زبان و ادب کی کسوٹی پر تنقیدی نگاہوں سے پرکھ کر رائج کیا اور اس طرح اسے ایک علمی زبان بنادیا۔

مولانا کی ایک بہت بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ آپ نے غیر زبانوں کے بلند اور بہتر خیالات و افکار کو اپنے قابل قدر مقدموں کے ذریعہ مقبول بنایا جس سے کہ ہماری زبان میں ادب کی نئی شاہراہیں کھلیں علمی مسائل سے بحث اور تحقیقی مسائل کا اظہار اردو زبان میں نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ تنقید نگاری انسانہ نویسی ناول نگاری مضمون نویسی کا نیا طرز ادبی مثالوں کے جدید ترین طرز جو یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں انہیں نئے معیار پر پرکھا جس کی بہترین مثال آپ کے رسالے ہمدرد کے مضامین اور تنقیدیں ہیں۔ یہی مولانا کی سب سے زیادہ قابل قدر خدمت ہے کہ انہوں نے جدید افکار و خیالات سے اردو زبان کے دائرہ ادب میں وسعت پیدا کر دی اور اعلیٰ ادبی ذائقہ پیدا کیا مگر آپ اپنی بلند پایہ اور مقبول تنقید نگاری سے اردو کو محروم رکھتے تو شاید اردو زبان کی موجودہ اصلاح و ترقی کا خواب ہم دیر

میں دیکھ سکتے۔

اردو لٹریچر میں جدید اضافوں کا ذکر مولوی صاحب خود ایک خطبہ صدارت میں کرتے ہیں۔  
 ”اس زمانے میں اردو زبان و ادب کے متعلق ہمارے معلومات میں ایک جدید اضافہ ہوا  
 ہے بعض محققین نے بڑی محنت اور تلاش سے قدیم اردو ادب کا پتہ لگایا ہے اور بہت  
 سی ایسی بے بادل و نایاب کتابیں ڈھونڈ نکالی ہیں جو اب تک گننامی میں پڑی ہوئی تھیں  
 اس کی بدولت اردو زبان کی زندگی میں تقریباً تین سو سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اب  
 اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لئے ایک نیا باب کھل گیا ہے یہ خطبات مبدلہ ص ۱۱۱  
 لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اردو زبان و ادب کی یہ تمام ترقی اور اس کی زندگی میں اضافہ تمام تر آپ  
 کی ہی تنقیدی و تحقیقی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے کوئی تخلیق کام نہیں کیا  
 مجرد قواعد اردو، اور صرف و نحو اردو کے۔ مگر ہم ان لوگوں سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ  
 تنقیدی کاموں کی نوعیت کے قائل نہیں مگر وہ ذرا بھی تخلیق کے لئے تنقید کی ضرورت پر غور کریں تو یہ  
 بات ثابت ہو جائے گی کہ ہر بڑے تخلیقی کام اور تخلیقی دور کے لئے بہت بڑی تنقیدی کوششوں کی ضرورت  
 ہوتی ہے۔ علاوہ بریں کیا باعتبار ضمانت اور کیا باعتبار نوعیت مولانا کے ادبی کارنامے کسی حیثیت سے بھی کم نہیں۔  
 مولانا کی تنقیدات اگر ان کے تخلیقی اثرات اور ان کے بالواسطہ فوائد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی  
 بجائے خود وہ تخلیقی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ جہاں گہرے مطالعے، مشاہدے اور علمی مباحث سے ملو ہوتی ہیں۔  
 وہ ان ادبی صفات اور کمالات سے بھی مزین ہوتی ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حاکمی کی طرح مولوی صاحب کی بھی تنقیدیں جہاں ہماری تاریخ ادب میں بحیثیت  
 صنف ایک بہت بڑا کارنامہ اور اضافہ ہیں وہاں ایک عظیم الشان انقلاب کی یادگار بھی ہیں۔ جنہوں نے  
 ہماری شاعری اور نثر کا رنگ ہی بدل دیا۔ عبارت آرائی اور الفاظ کی صنایع کی جگہ سادگی اور سنجیدگی نے  
 لے لی۔ مولانا کی تنقیدوں نے ہمارے انکار و خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ بے بنیاد قیاس آرائی  
 اور خیالات کی بلند پروازی کی جگہ شوس علمیت، معلومات اور حقیقت نگاری برقی جانے لگی غرض یہ کہ مولانا

کی تنقیدیں ہماری تاریخ ادب میں اس دورِ تنہا کی عظیم الشان یادگار درج ہیں اس کی اصل محرک ہیں جن نے ہمارے ادب کو پستی اور کم مانگی کے ابتدائی دور سے بحال کر موجودہ ادبی اور ملی ترقی کے دور میں داخل کیا۔ یہ تنقیدیں دراصل عروج اور کمال کا ایک زینہ ہیں جن کے ذریعہ اردو زبان اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مولانا عبدالحق ہماری زبان کے ان بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں جن کا احسان ہم بڑی دنیا تک نہیں بھول سکتے۔ اردو زبان و ادب کی موجودہ ترقی ان کی بہت کچھ زیرِ بار منت ہے۔ ان سے قبل نہ ہماری زبان میں وہ خوبیاں تھیں اور نہ اس کا وہ رتبہ جو اسے اس وقت مولوی عبدالحق صاحب کی تنقیدی کوششوں کی بدولت حاصل ہے۔ اگرچہ آپ کی اصلاحات وہی تھیں اور جادو وہی تھا۔ جس کی بنیاد رکھنے کا فخر سرسید اور مآلی کو حاصل ہے لیکن اس کی کامیابی اور تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے اور اس حیثیت سے اردو ادب میں مولوی صاحب اپنی تنقیدوں کے ساتھ موجودہ دور کے ہیرو کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

اخلاق الرحمن صاحب قدوائی بی، اے (جامعہ)

# جان ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر

جان ڈیوی نے طے کیا کہ اپنی تصنیف ”اسکول اور معاشرہ“ میں لکھا ہے کہ اب تعلیمی دنیا میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں وہ مرکز کشش کو منتقل کر رہے ہیں۔ انقلاب و تبدیلی کی نوعیت کو پچھلی کی طرح ہے جس نے علم ہیت کے مرکز کلازین سے آفتاب کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ آج اسی طرح تعلیمی دنیا میں بچہ آفتاب کی پوزیشن اختیار کر رہا ہے جس کے گرد تمام تعلیمی آلات و ذرائع گردش کر رہے ہیں۔ بچہ مرکز ہے اور اسی کے ارد گرد نظام تعلیم کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ باڈی النظر میں یہ الفاظ الہامی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں انقلاب کی ہلک نایاں ہے لیکن یہ حقیقت ہے جو تعلق و مبالغہ سے بالکل متبر ہے ڈیوی کی اس تحریر نے تعلیمی دنیا پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور اس میں اس کے مندرجہ ذیل اصول خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

۱۔ ڈیوی نے بچے کے فطری میلانات، جبلی رجحانات اور طفلانہ ضروریات پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس نے اساتذہ و معلمین کو اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ بچے کی نشو و نما معنایں و نصاب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مدرسوں میں اسی بات کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہئے اور اس کی اشاعت و ترویج کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات کی داغ بیل اٹھا ہویں صدی عیسوی میں ڈالی گئی تھی اور ہر بارٹ کے پیروؤں نے بھی شوق اور دلچسپی کی اہمیت کو سراہا اور اس کی تلقین بھی کی تھی جو مدرسے ان کی تعلیمات کے اثر سے قائم کئے گئے تھے ان میں یہی روح کار فرما تھی یعنی محدود فطرت کی اہمیت لیکن انہوں نے جو معاشرتی و درشت یا ترکہ اور طور و طریقہ پر تاکید اور پابج درجوں کے رسمی اصول (Formalism) پر زور دیا تھا۔ اس نے علمیت کے نظم و نسق کو اور زیادہ محدود اور جکڑ دیا۔ اور اساتذہ

لہ کو پرنسک پریشا کا باشندہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۷ء میں وفات پائی۔ وہ دنیا کا پہلا ہیئت دان بنیم تھا جس نے اجرام فلکی کی حرکت کی واضح تحلیل کی اور ابطلیوس کے خلاف یہ ثابت کیا کہ اس نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے نہ کہ زمین۔

کی پوزیشن کو زیادہ اقتدار اور اہمیت دیدی عملی طور پر اگودیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خاص کر ہمارے ملک ہندوستان میں چند مضامین و نصاب کا طریقے کی طرح رٹ لینا ہی علمیت کے مرادف خیال کیا جاتا ہے اور یہ اسپرٹ عمومیت کے ساتھ تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاری ہے۔ ڈیوی نے اس نظریہ کے خلاف علم بنادوت بلند کیا اور دنیا کو یہ بتایا کہ مضامین، نصاب اور ملی مشاغل کو مہتمائے مقصود تصور کرنا امر غلطی ہے۔ وہ تو ایک ذریعہ اور راستہ ہے جس پر قدم رکھنے کے بعد بچے اپنی فطری جبلتوں کی نشوونما اور قدرتی رجحانات کی افزائش اور تشکیل کر سکتے ہیں۔ اور ان کی جسمانی اور ذہنی قوتیں حساس و بیدار ہو سکتی ہیں۔ ڈیوی کے نقطہ نظر سے مدرسہ کا یہ فرض مہتمم ہے کہ وہ بچے کی بالیدگی اور ترقی کو معاشرتی ماحول اور اجتماعی فضا میں پوری آزادی سے نشوونما پانے اور معاشرہ کے سرچشموں، علوم و فنون، مشاغل اور آرٹ سے پوری طرح سیراب ہونے دے کیونکہ سماج ایک جیتا جاگتا ماحول ہے۔

۲۔ ڈیوی کا اعتقاد ہے کہ تعلیم تجربات کے حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی خیال کو اپنی تصنیف ”بچہ اور نصاب میں یوں ظاہر کیا ہے (الف) مضنون کو خارجی اثر سے بچوں کے اس طرح ذہن نشین کرنا کہ وہ دماغ میں گھر کر جائے ہرگز گہر نہ گھنٹیں۔ لیکن اسنو تھیں (ب) غیر بیرونی اثر کے، اس کی مثال عضوی ہضم کی سی ہے جو اندر سے شروع ہوتا ہے، وہ اپنی تصنیف ”جمہوریت اور تعلیم“ میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا کرتا ہے کہ تعلیم تجربات کی مسلسل تعمیر کو کا نام ہے اور تجربہ ہی کی از سر نو تشکیل و تجدید اجتماعی و معاشرتی آسودگی اور رضا مندی کو وسیع اور عیس کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افراد میں اس کے تجربہ کے (طو و طریقہ پر قابو پانے کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے)۔

اگر یہ تعلیم کر لیا جائے کہ تعلیم تجربہ کے ہم معنی اور مرادف ہے اور جو کچھ ہم سیکھتے ہیں وہ ہماری عملی جدوجہد کا ثمرہ ہے تو مدرسوں کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام مشاغل کو مہیا کریں جن کے بغیر درجہ تعلیمی جھٹان اور چشمہ رواں نہیں بن سکتے۔ مدرسوں کا کام اور ان کی حقیقت اور اہمیت کا اندازہ صرف اس طور پر لگایا جاسکتا ہے کہ طلباء میں یہ استعداد و قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نازک مواقع سے دوچار ہونے اور نئے تجربات کے پیش آنے کے باوجود ثابت قدم اور مستحکم رہیں، اور گذشتہ آزمودہ تجربات کی مدد



زمانے کے جدید مواقع اور پیچیدہ حوادث کو مطیع و منقاد کریں اور نہایت اطمینان، سکون اور خندہ پیشانی سے مشکلات کی گتھیوں کو سلجھائیں۔

(دانی اور غور و فکر انسان کی قابلیت و دیانت کا سنگ بنیاد ہے۔ بغیر اس کے کوئی شخص پیش آنے والے نئے واقعات پر نہ تو قابو پا سکتا ہے نہ گذشتہ تجربات کے نتائج سے کوئی خاص استفادہ کر سکتا ہے اور نہ نئے پیچیدہ مسائل کی گہری کوکھول سکتا ہے۔ بہت کم اسکولوں میں اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ بچوں کی دماغی نشوونما مکمل طور پر ہو سکے اور ان کی قوت فکر پر پوری آزادی کے ساتھ ترقی پذیر ہو کر اعلیٰ درجے تک پہنچ سکے۔)

غور و فکر کا صحیح مقصد انسانی تجربات کی تعمیر و تشکیل ہے اور انسان محض مسائل سے دوچار ہوئے بغیر قوت فکر پر کوئی معرض عمل میں نہیں لاسکتا۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ انسان اسی وقت غور و فکر کرتا ہے جب پیچیدہ حالات اور نئے مسائل و سوالات کا پہاڑ اس کے سامنے حائل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی دشواریاں مہم سے زیادہ مشکل اور فلسفہ سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور ایسی ہی حالت میں کسی عرض اور چارہ کا کی تلاش لازمی ہو جاتی ہے۔ تشویش و پیچیدگی کے علاج کا مطالبہ اس کی قوت فکر پر عزم و استقلال پیدا کرتا ہے اور اس طرح قوت فکر یہ انسان کا ایک فطری جزو بن جاتی ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہر نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے کا حریف سنگ

یہ زور و دست و ضربت کاری کا ہے مقام میدان جنگ میں نہ طلب کر لائے جنگ

خون دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات فطرت کو ترنگ ہے غافل اے بل ترنگ

۳۔ ڈیوی کا عقیدہ اصول شوق و کوشش، یعنی (Interest & Effort) قابلِ توجہ ہے جس کا گراٹر اثر

تعلیمی دنیا میں عملی طور پر پڑا ہے اور جو اس کے نظریہ تعلیم یعنی تجربہ کا نتیجہ و حاصل ہے۔ لفظ "شوق" کا رواج تعلیمی دنیا میں اسی کی کاوش و ذہنی کا نتیجہ ہے اس کے نزدیک شوق و کوشش "میں چولی داس" کا ساتھ ہے۔ وہ اپنی تصنیف "شوق و کوشش" کے صفحہ ۷ میں اسی خیال کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ کسی شے، خیال اور انجام کی خارجیت کو مسخر کرنا خودی (Self)

کا کام ہے۔ کیونکہ شے یا انجام عام طور پر خودی سے جدا اور الگ ہوتا ہے۔ اس کو دلچسپ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مصنوعی ترغیبات و تحریکات سے اپنے احاطہ میں لانے کی حاجت ہوتی ہے۔ اور وہی تحریک سے توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ شے احاطہ خودی سے باہر ہے اس لئے محض قوت عزم و ارادہ سے اپیل کی جائے۔ اور سی و کوشش کو جس میں ”شوق“ کا شائبہ بھی نہ ہو مگر کوشش بنایا جائے۔ تمام علمائے تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ”شوق کا پہلی سرچشمہ یہ ہے کہ جس بات یا واقعہ کو سیکھنا یا جس عمل کو پیش کرنا ہو اس میں اور ترقی پذیر نفس (see) میں تطابق اور ہم آہنگی پائی جائے۔ اس شوق کی ترقی کا دار و مدار اعمال یعنی خود بچہ کی ذاتی بالیدگی پر ہے اور اسی وجہ سے اس کا آمرانہ تقاضا ہوتا ہے۔ اگر عامل (یعنی بچہ) کو اپنی شخصیت کی تکمیل مقصود ہے۔ اگر تطابق (یعنی نفس اور شوق کی غیر شعوری ترقی کا تطابق) کی اس حالت کو ایک مرتبہ حاصل کر لیا جائے تو اس وقت نہ تو ہم کو قوت ارادہ سے اپیل کرنی پڑے گی اور نہ اس بات پر زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا کہ ان اشیاء کو دلچسپ بنائیں۔

ڈاکٹر فرینک میک مرے ڈیوی کے ”شوق و کوشش“ کے متعلق لکھا ہے کہ بہت سے سن رسیدہ لوگ اس کو مجذوب کی ڈس سے زیادہ خیال نہ کریں گے۔ پرانی لکیر کے شیدا ہیوں کا فتویٰ ہو گا کہ یہ خیال محض مذاق و استعزاز ہے۔ کرنل پارک نے ڈیوی کے خیال ”شوق سے بہت متاثر ہو کر غیر معمولی ذہنی ترقی ظاہر کی۔ اس نے اس بات کو محسوس کیا کہ بچے کو بجائے نصاب و مضامین کا ماتحت بنانے کے خود مرکز و محور بنانا ترقی کی ایک نئی شاہراہ ہے اور اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا کامیابی و فلاح کی دلیل ہے۔

۴۔ اڈیوی کا ایمان ہے کہ مدرسہ سماجی ادارہ ہے اور ہماری تمام اجتماعی و عمرانی ترقی کا وراثت ایک حصہ ہے۔ مدرسہ ایک چھوٹی جماعت اور سوسائٹی کا دوسرا نام ہے جس کا طور و طریقہ بعینہ جماعت کا چہرہ اور نمونہ ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح خارجی دنیا کی راہ و روش سے علیحدہ اور متضاد نہیں ہوتا۔ ۱۸۹۹ء میں ڈیوی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں سماج کی زندگی کا بہترین مرقع ہونا چاہئے جس میں سماج کے انواع و اقسام کی حرفت و صنعت کا پورا انعکاس ہو جس میں چھٹان زندگی کے رنگ و رنگ کے پھول اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ ہوں اور جس میں آرٹ، تاریخ، سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ اور

دیگر مفید علوم کی تازہ اور پاکیزہ روح موجود ہو یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مدرسہ کو ساج کا آمینہ اور نقش ثانی ہونا چاہئے۔

جب مدرسہ میں ایسی چیزیں جاری ہوں گی اور بچوں کی ایسی تربیت اور نشوونما ہوگی کہ وہ مدرسہ کی چار دیواری کے اندر معاشرہ کے باکار ممبر بننے کی صلاحیت اور لیاقت پیدا کر سکیں گے اور ان میں ایثار، انکسار، خدمتِ خلق، خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کی استعداد ہوگی اور کشتیِ حیات کے کھینے کی خود مہارت تامہ حاصل کر لیں گے اور بحرِ خار کے تلاطم و موج کی بالکل پروا نہ کریں گے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں شجاعت اور عزم و استقلال سے کام لیں گے، تو ہم سوسائٹی کی خدمت میں ایسے افراد پیش کر سکیں گے جو فخر و تالش کے قابل، احترام و عزت کے لائق اور معاشرہ کی زندہ یادگار ہوں گے۔ مدرسہ کا حقیقی مقصد بچوں میں قوتِ تعمیر و تخلیق کا امداد ہے اور ان کی منفی تخلیقی قوتوں کو پائیدار بنائیں تاکہ پہنچنا اعلیٰ تعلیم اڈا پوی نے اخلاق پر مبنی ضروری ہے اور اس کے خیالات کا اثر اس شعبہ میں بہت گہرا پڑا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تعلیم کا صحیح مقصد ہر فرد میں اتنی قوتِ فکر یہ پیدا کر دینا ہے کہ وہ اپنی کشتیِ حیات کو سابیِ انادہ کے لئے پار لگا سکے۔ اور اس کی شخصیت کا وجود و جاعت و معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہو۔ وہ ہند و نصاع کے وہی لکچروں اور وعظوں کو ناقص سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم و اخلاق کی مغایرت کا باعث علمِ عمل کا نفاق ہے۔ انسان کا اخلاق اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب وہ اس کو ذاتی تجربہ کے ساتھ ساتھ حاصل کرے اور تجربہ و عمل سے وہ (یعنی اخلاق) اس کی فطرتِ ثلاثیہ بن جائے اور وہ لکھتا ہے کہ بعقرب اخلاقی کیفیات کا سماجی تعلق ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان کو اخلاقیات کے نام سے یاد کرتے ہیں جن میں راستہ یا زبانی یا اندازی، تقویٰ، حیا، رواداری اور ہر دلِ عزیزی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ وہ مرکزی فضائل ہیں جن کے گرد دوسری خوبیاں گردش کرتی ہیں۔

اخلاقیات کے دائرے میں نیک کرداری، جھلنت اور سیرت شامل ہے۔ اور سیرت بحیثیت مجموعی انسانیت کے مرادف ہے۔ صفاتِ حمیدہ سے متصف ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ عملی زندگی میں دوسروں سے میل جول، ربط و تعلق اور دین کیا جائے اور فطری قوتوں کو اعلیٰ مدارج تک پہنچانے کی اہمک

کوشش کی جائے امدادوں اور اسکولوں کا نظم و نسق، نصاب اور تعلیم و تدریس سب اسی وقت قابل تدارک ہو سکتے ہیں جب ان میں سماجی و اجتماعی روح کا رفر یا پوتا دیب، فطری ترقی، تمدن و تہذیب، سماجی استعداد و اخلاقی صفات ہیں جن سے ہر انسان کو متصف ہونا چاہئے صرف ذاتی خوبی ایک بے معنی شے ہوگی اگر وہ دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد نہ ثابت ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے کہ خدمت خلق، حسن اخلاق کا بہترین منظر اور کمال تزکیہ نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔

### عبادت بجز خدمت خلق نیست

ذہبی نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی اجزاء قرار دئے ہیں اور بتایا ہے کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر مکمل میں انہیں صفات کو شعوری طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔

۱۔ "وقت عمل یا کارکردگی کی صلاحیت" ہم اکثر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہو یا بہت پختہ ہے۔ اس سے باری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے انجام دینے میں استقلال، محبت، جرات اور جوصلے سے کام لیتا ہے۔ یہ فعلی صفات ہیں جو بحیثیت مجموعی ہماری سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور ایڈیسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کر کے آخر کار کامیابی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل میں نہیں لاسکتا۔ عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ہیں یا برے۔ ہر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حاصل ہوتی ہے جس میں انسان کو کاوش اور جدوجہد سے کام لینا پڑتا ہے۔ وسائل کی تعظیم کر کے اور مادی و انسانی حالات کو قابو میں لاکر اپنے ماحول کو اپنا مددگار بنانا پڑتا ہے۔ پھر شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لے کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔..... ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً ہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کر کے دکھائے کسی طرح اپنے عمل کا سکھانے کا اپنے ماحول پر جائے یہ وہی خواہش ہے جو بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر و تخریب میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو

سمجھنا اس کو ایسے شائل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں اس کو حسب توقع اجمارنا اور راہ پر لگانا کہ بچہ میں مفید عادتیں پیدا ہوں یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے۔  
 "وقت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشرتی نقطہ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو۔ اس کے لئے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ (Judgement)

اور ذکاوت احساس (Delicate personal sensitivity)"

۲۔ "انسانی سیرت کا عقلی اور ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے۔ یہ قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ جب ہمارا علم مربوط اور منظم ہو جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے تکمیل مقاصد میں مدد دے جب اس کی بدولت ہم میں معلومات کی سمجھ، احساس تناسب موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہو جائے۔ اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں۔"

۳۔ تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا۔ لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو معاشرے اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ہوتے ہیں جن میں روح انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی مطلق جس نہیں۔ وہ تالاب کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔..... معلم کا اور مدرسے کی تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ طلباء کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ہو، وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں، جب انہیں کسی اہم معاشرتی تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کی طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض ایسے شخصی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں۔ ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں

کہ اس کا رد عمل دوسروں پر کیا ہوگا اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگیگی جب انسان کے نفس میں دکھوت احساس کی بدولت ہمدردی اور فراعذلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے بھل کر تمدنی اعراض و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب العین اجتماعی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقتضایہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بے جا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری ان مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشرتی لحاظ سے قابل قدر ہو۔

الفرض جن مدرسوں میں علم مسلسل عمل اور پیچ مشاغل کے ساتھ سکھایا جاتا ہے وہاں کے ماحول میں سماجی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے وہ ایک چھوٹا سا معاشرہ ہو جاتا ہے جس میں بیرونی زندگی کے تجربات سر روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس چھوٹے معاشرے میں بچے میل جول اور ارتباط و اختلاط کے باعث زندگی کے نئے نئے تجربات اخذ کرتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ اس سرچشمہ سے سیراب ہو کر ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ سماجی زندگی میں مستعدی سے حصہ لے سکیں۔ وہ اس قابل بن جاتے ہیں کہ دنیا کے تغیرات کے دوش بدوش چل سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنی زندگی میں بھی تغیر و تبدل کر سکیں یہی حسن اخلاق ہے۔ اسی کا نام سماجی افادہ ہے اور یہی علم و عمل کا ارتباط و اتحاد ہے۔ انہی خصائص کو مدرسوں کا مہتمم مقصود ہونا چاہئے تاکہ یہ فرد کی اخلاقی زندگی کے رگ دریشہ میں پوری طرح سرایت کر جائیں اور اس کی سرشت کا ایک جزو لا ینفک بن جائیں۔

سماجی لیاقت و صلاحیت [ڈیوی اور سیکلے، نظریہ سماجی لیاقت (ص ۱۵۵)] کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ ان دونوں امریکی مفکروں نے اس خیال کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پھیلا دیا ہے۔ ان کی تمام تحریروں کا خیال سے لبر نہیں ڈیوی نے خاص طور پر سماجی لیاقت کی بڑی اشاعت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر بچے کو سماجی لیاقت کے لئے تیار کرنا اسکول کا فرض ہے۔ وہی شخص سماجی لیاقت رکھتا ہے جو جنگ کی طرح دوسروں کا خون چوس کر زندہ نہیں رہتا بلکہ خود اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو کر اپنی زندگی کا عاقی ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنی کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کی ترقی میں روٹے نہ اٹکائے۔

بلکہ دوسروں کا ہاتھ بٹائے میں ہر وقت متعذر رہے اور سماج کی ترقی میں ہر ممکن کوشش کرے۔

بقول ڈیوی سماجی لیاقت "دو عناصر کا مجموعہ ہے (۱) معاشی لیاقت (۲) مدنی لیاقت جب تک یہ دونوں اوصاف ایک انسان میں جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کو سماجی لیاقت کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا معاشی لیاقت اسی وقت ممکن ہے جب ہم فطری قوتوں کو سماجی افادہ کے لئے پوری طرح استعمال کریں سماجی لیاقت میں صنعتی و حسرتی آسودہ مالی اور قابلیت شامل ہیں ہر انسان کے لئے ذریعہ معاش حاصل کرنا لازمی ہے اور وہ بغیر اپنے پیٹ کی نگرانی کے سماج کے لائق نہیں بن سکتا جن ذرائع سے روزی کمائی جاتی اور خرچہ کجاتی ہے ان سے باہمی تعاون اور لین دین پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے جو شخص یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنی ذات اپنی اولاد اور متعلقین کے لئے روزی حاصل کر سکے اور دوسروں کے سہارے زندہ رہتا ہے تو وہ نعمت خوار اور طفیلی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اسی لئے وہ تجربات زندگی سے محروم رہتا ہے جو انسان کے بہترین علم اور ہادی ہیں اگر وہ صنعتی پیداوار کے مجموعہ مصرف و استعمال کو نہیں سیکھتا تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنی شخصیت کو ضائع کرنے کے علاوہ دوسروں کی مفید دولت کو برباد نہ کر دے اور ایک مچھلی کی طرح سارے تالاب کو گندہ نہ کر دے۔

جمہوری نقطہ نظر سے ہر انسان کا یہ فرض مین ہے کہ وہ اپنی زندگی اور قسمت کا مختار کل بن جائے اور اپنی زندگی کی ایک منزل مقصد و ٹھکانے سے

کچھ مفصل لے کر آتا ہے اس دنیا میں جو آتا ہے محروم عمل جو رہتا ہے وہ جیتے جی مر جاتا ہے عموماً لوگ اس اصول کے خلاف کسی ایسے بہتر پیشہ اور برتر روزگار کو اختیار کرتے ہیں جس میں فطری رجحانات اور جبلی قوتوں کا طعن لگنا نہیں کیا جاتا بلکہ دولت اور روزی پیشہ کو باجی کا طریقہ ٹھہرایا جاتا ہے۔

مدنی لیاقت کا مجموعہ مفہوم یہ ہے کہ لوگ اس قابل ہو جائیں کہ انسانوں اور مذاہیر کو نہایت عقل مندی سے باجی سکین قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں دانستہ حصہ لے سکیں۔ یہ انسان کی ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اسی ذریعہ سے انسان اپنی فطری قوتوں کو عملی طور پر استعمال کر سکتا ہے یہی انسان میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کی انفرادی اہمیت کو عملی طور پر سمجھتا ہے تجربات کا مبادلہ ہوتا ہے قوم کی سماجی بیداری میں حصہ لینے کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ انسان کو دوسرے انسان کے تجربات سے مستفید ہوتے کارین ہو

منا ہے اور اس طور سے کام بہتر طریقہ پر انجام پاتا ہے۔ اشیاء کا اختراع آرٹ سے خطا ٹھکانہ انہوں لطیفہ سے آراگی حاصل کرنا فرصت کے وقت کو صحیح استعمال کرنا دولت کا موقع محل سے صحیح کرنا ضرورت کے وقت مستعد رہنا اور اپنی تمام قوتوں کا ہیبت جموی بہتر استعمال کرنا نہایت کے مراد وہ معنی ہے۔ ان فرض حقیقی نہایت سے مراد داخلی اشتراکیت عملی اشتراکیت اور وسیع النظری ہے جو سماجی طبقات کی خلیج کو فنا کر دیتا ہے جو تجربات کی آمد و رفت کو نہیں روکتا اور جس میں ہمدردی خوش مزاجی، بھلائی اور نیکی شامل ہیں۔

بچکے کے نقطہ نظر سے سماجی یاقوت و دیار ہے جس سے تعلیمی ذرائع ان تمام تجربات کا انتخاب کر سکیں جو افراد کے ذہن نشیں کرنا ہوں۔ یہی میزان ہونی چاہئے تاکہ جو خصائل و عادات بچے اسکولوں میں یکساں وہ ان کی زندگی میں سماجی لحاظ سے مفید ہوں۔

برٹریڈ رسل جو انگلستان کا بہت بڑا مفکر ہے وہ اپنی تصنیف "جماعتی نظم اور تعلیم" میں تعلیمی نہایت کے پانچ اوصاف بیان کرتا ہے جس سے صنعت ہو کر انسان مکمل شہری کھلانے کا متفق ہو سکتا ہے۔

۱۔ قوت انشا (initiative) یعنی ہر تحریک اور سماجی کام میں پیش قدمی کرنے کی صلاحیت تاکہ ہر اجتماعی افادہ کے لئے ملک کا ہر شہری اپنے فرائض کا احساس کر کے اس پر عملی قدم اٹھائے۔

۲۔ قیادت (leadership) یعنی ملک کی سیاست اور تمدن کو برقرار رکھنے کیلئے دوسروں کا دست و پاؤں ہو بلکہ ہر شہری میں یہ اسپرٹ موجود ہو کہ اگر قوم کے جائزہ کا اندازہ جائے تو وہ اس سے بہتر و لائق شخص کی خدمت کو پیش کر سکے گا۔

۳۔ اولیادینا خلا تمام سبب قول لما قال الکرام قول

۳۔ تادیب و انضباط (discipline) یعنی ایک ایسے اصول و نظم کے تحت کام کرنا جو سماج کے افادہ کے لئے نفع دے اور جس سے اجتماعی شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔

۴۔ اتحاد و اشتراک عمل (cooperation) یعنی سماج و قوم کی خدمت باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے کرنا تاکہ انفرادی نشوونما کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی بھی ترقی ہو اور ہر شہری میں خود غرضی کے بجائے ہمدردی و ایثار کے جذبات پیدا ہوں۔

۵۔ بردباری (Tolerance) یعنی دوسروں کے جذبات و اختلافات کا لحاظ رکھنا اور ان کو آزادی رائے آزادی تقریر اور آزادی عمل دینا تاکہ چشتان قوم کی آبیاری ہو سکے۔

گھلانے رنگ رنگ سے ہے نہایت چمن اے ذوق اس جہان ٹیلے زیب اختلاف سے  
(ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی ایم۔ اے)



## اقبال کا فنی ارتقاء

اقبال عمدہ حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہوا ہے جس کے افکار کے نمبروں نے رنگ و آہ شاعری کے علم کو ایک نئے انداز سے بانٹ دیا اور جس کے خیالات کی بلند پروازی نے ادب کے خزانوں کو بھر پور کر دیا ہے خیالات کی بے قلمونی ہر مرتبہ ایک نئی ادائیگی شان کے ساتھ مختلف پیراؤں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور زمین شعر میں وہ گل کھلاتی ہے جس میں وہی کشش، حسن اور سحر آفرینی کے عناصر ملے جلتے ہوتے ہیں۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا اصول اس کے اشعار میں پڑھ کر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس کے تخلیقی پیکروں میں سچا رنگ روپ ہوتا ہے۔ ان میں توانائی بھی ہوتی ہے صداقت بھی، حسن بھی ہوتا ہے کشش بھی، لطافت بھی ہوتی ہے ہوسیت بھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ اعجاز ہوتا ہے جو اپنے نفس گرم سے ”خاک ہزار سالہ“ میں زندگی کا احساس اور گرمی، حرارت اور گلابی پھونک دیتا ہے اور زندگی کی ایسی لہریں دوڑ جاتی ہیں جن سے دل گرفتہ پیغموں کی گریں کھل جاتی ہیں اور انہوں کے روح پرور ارتعاش سے دروں لالہ بھی تازہ ہو جاتا ہے ان میں ایک المائی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک سرمدی نشہ ہوتا ہے۔ ایک بے پئے کی سستی۔ لیکن اس سے خود فراموشی کی بجائے خود شعوری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ شام پندی کے بجائے تغافل پندی کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے۔ فطرت کے بادل چنٹ جاتے ہیں۔ رجائیت کی سحر طلوع ہونے لگتی ہے سینوں میں تناؤں کی فروزاں آگ مشتعل ہو جاتی ہے۔ زندگی میں حسن اور حسن میں زندگی نظر آنے لگتی ہے۔ آتش نفس تیز تر ہو جاتی ہے ممکنات زندگی کا میدان وسیع ہو جاتا ہے اور دل کیفیت ہستی کی تھاپوں ڈوب کر جب ابھرتا ہے تو قوت، حیات اور امید سے لبریز ہو جاتی ہے۔

اس کے ہر خیال میں ایک نئی شان اور ہر بات میں ایک نیا رنگ ہے۔ اس میں وحدت بھی ہے اور غلاتی بھی، لوح بھی ہے اور تونمندی بھی، خون تازہ بھی اور حقیقت پڑوہی بھی۔ اس کے ہاں محض الفاظ کی صنعت کاری نہیں بلکہ رنگ و آہنگ، کیفیت و کم اور خط و خال کے ایسے ایسے حسین مرتعے ہیں جن میں سے زندگی جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے اور یہی اس کی بلندی کی دلیل ہے۔

اقبال کے ابتدائی اشعار میں داغ کی شورش بانی، جدت اور شیرینی صاف نظر آتی ہے۔ اس کی تصویریں میں وہی باگین، وہی رحنائی اور وہی دلکشی پائی جاتی ہے جن میں داغ کا انداز بیان سمویا ہوا ہے لیکن چونکہ اقبال نے فلسفیانہ طبیعت پائی تھی اس لئے غالب کے کلام کے اثر نے اسے اور چمکادیا اور ان کے ذہنی ارتقار کے ساتھ ساتھ یہ حکیمانہ طریق فکر بڑھتا گیا۔ لیکن شاعر کی روح نے اسے شریعت کے سانچے میں ایسا ڈھالا کہ اس کی شان انوکھی ہو گئی ماحالی کے دردِ دل نے بھی اقبال کی رگ جہاں کو متحرک کیا اور چونکہ اقبال کو بھی ایک سوئی ہوئی قوم کی دامندہ رنگوں میں خونِ حیات دوڑانا تھا اس لئے اس کی لئے نے بھی طرز اختیار کیا مگر اقبال ایک رجائی شاعر ہے۔ اور قوم کے سامنے ایک بلند اور امید افزا سطحِ نظر پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کے اشعار اداوارمی اور خزنِ یاس کے عناصر سے آزاد ہیں بلکہ ان کی بجائے ان میں امید اور زندگی کی حرارت اور سوز ہے لیکن جس طرح ہر بڑا شاعر وقتِ تخلیق کا مالک ہوتا ہے اسی طرح اقبال نے ان تینوں شاعروں کے اثرات کو اپنی فطرت میں اس طرح سمویا۔ اور اپنی انفرادی ذہنی اتباع سے اس طرح چمکایا کہ اس کی راہ سب سے الگ اور سب سے پُر شکرت نظر آتی ہے۔ اسکے ہاں داغ کی زبان و غالب کا فلسفہ اور ماحالی کا درد اور تبشیل ہر کمزوروں غالب میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔

اقبال کے ابتدائی کلام کے مجموعہ ”بانگ درا“ میں داغ، غالب اور ماحالی پر بڑی نظمیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ان تینوں کا کس حد تک رہیں منت ہے اور اس کے قلب کی گہرائیوں میں احترام و عظمت کے کتنے لطیف جذبات ہیں۔ ”بانگ درا“ میں شاعری کے تین دھامے الگ الگ بتے نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر جو بھی پر تول رہا ہے۔ آئندہ کن بلندیوں پر پرواز کر لے والا ہے۔ ان تینوں دردوں کو سامنے رکھنے سے تخلیق کے تدریجی ارتقا کا نقشہ صاف نظر آ جاتا ہے۔ ہر نقش ثانی نقشِ ادل سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے اور ایک دور کی خامیاں دوسرے دور میں رفع ہو جاتی ہیں جو نقشِ پہلے دھندلے اور پھیکے ہوتے ہیں وہ ذہن کی نشوونما کے ساتھ روشن، جاذب اور دل فریب بن جاتے ہیں اور بڑے تہہ بڑے ایک تصویر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اقبال کے پہلے دور کی نظموں میں سب سے پہلی نظم ”ہالہ“ ہے اس میں خیالات اگر نرمی ہیں اور زبان پر فارسی کا رنگ غالب ہے۔ تخلیق بے انتہا حسین ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ رحنائی اور زیبائی کی

جھلیاں شاعر کے مصورانہ کمال کی غازی کردہ ہیں۔ اس کے الفاظ و س قزح کی طرح رنگین اور دلکش ہیں۔ اور خیالات کا تسلسل موسم بہار کی رنگارنگ و لذیذیوں کی طرح دلپذیر ہے شاعر کے دل میں وطن کی محبت کے جذبات بھی موجیں لے رہے ہیں اور اس کی روح اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ نظم پہلے دور کی نظموں کی خصوصیات کا آئینہ ہے منظر کشی جس میں اقبال کو خاص مہارت حاصل ہے اس میں موجود ہے۔ ادبی مصوری کا یہ اچھا نمونہ ہے جس میں شمریت کا عنصر موجود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوتی      کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ ساشا بہ قدرت کو دکھلاتی ہوئی      سنگ روہ سے گاہ بچتی گاہ مگھراتی ہوئی

چھپتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو      اے مسافر! دل بھتا ہے تری آواز کو

ایک نظم ”ماہ نو“ میں تشبیہوں اور استعاروں کی لطافت اپنے انتہائی کمال تک پہنچ گئی ہے ”ماہ نو“ کو خورشید کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ٹکڑا قرار دینا، لکھا خیال ہے۔ اپنے بے مثل تخیل کی صنایع سے اقبال نے جو تصویر پیش کی ہے۔ اس کا ایک پہلو دیکھئے :-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل      ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب      نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے نعد آفتاب

چرخ نے بالی چالی ہے عروسِ شام کی      نیل کے پانی میں یا بھلی ہے سیمِ خام کی

تصویر و درو اس دور کی بہترین نظموں میں ہے جس میں اقبال ایک وطن پرست کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ وہ احساس جس نے ان سے یہ کھلوا یا کہ ”خاکِ وطن کا مجھ کو ہرزہ دیتا ہے“ یہاں بھی موجود ہے ان کا دل ہندوستانیوں کے نفاق پر فخر خانی کر رہا ہے اور اس کے مستقبل کا خیال کر کے ان کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی فیرت قومی کے جذبہ کو متحرک کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ فرقہ آریوں کی زنجیروں کو توڑ کر اور ”انسان نہ اے ماضی“ کو بالائے طاق رکھ کر موجود صورت حالات کا جائزہ لیں اور مستقبل کی تعمیر کی فکر کریں۔ وہ انھیں تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے قومی مصیبت کا احساس نہ کیا اور ماضی کے سیمپائی طلسم کے اسیر رہے۔ وہ ایک دم مغرور ہوتی سے حوت غلطی کی طرح مٹا دے جائیں گے اور تاریخ ان کے قومی تشخص کی کوئی یادگار محفوظ

نہ کہ مکے لگی۔ قوموں کا اجتماعی احساس جب کمزور پڑ جاتا ہے تو دوسری قومی سیرت رکھنے والی قوموں کے اندر  
جذب ہو جاتی ہیں۔ اس نظم میں ایک قومی ہمدرد کی نئی اور مضطرب روح آہ و فغاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور  
اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے درد و زلفے ہر ہندوستانی کے لئے ایک عمومی اپیل رکھتے ہیں۔

رلا آگے ترا نظارہ اے ہندوستان بھوکو کہ عبرت خیر ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں  
دیار و ناجے ایا کہ سب کچھ دے دیا گویا لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں  
نشان برگ گل تک بھی نہ چوڑا باغ میں گلچیں تری قسمت سے زرم آریاں ہیں بانباؤں میں  
وطن کی فکر کرنا داں مصیبت آنے والی ہے تری بربادیوں کے شوق سے ہیں آسانوں میں  
نہ سمجھو گے تو مت جاؤ گے اے ہندوستان دلاؤ تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں  
پریمت ہندوستان کی حالت زار انھیں یاں تک بے چین کرتی ہے کہ بالآخر پکار اٹھتے ہیں  
تمہیں کیا دیدہ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا

وطنیت کے اس شدید احساس کے ساتھ ساتھ شاعر کی عشق پرور روح بھی اپنا مظاہرہ کئے بغیر نہیں  
رہتی۔ اسے فطرت کے ہر منظر اور قدرت کی ہر نیرنگی میں حُسن نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس حُسن  
کو قُصاں دیکھتا ہے۔ ہر طرف اسے اسی کیفیت کی جلوہ سالانیاں نظر آتی ہیں۔ بتان شورش و تنگ کا تو کیا کسانجن کے  
عارض تاباں کی جھلک میں حُسن کی تمام فتنہ زائیاں مرکوز ہو گئی ہیں اور حُسن کی نکیلی ہلکیوں کے ستم کش قیروں  
سے شاعر کا دل غون ہو کر رہ گیا تھا۔ اس چمن کا ذرہ ذرہ عشرہ باماں ہے اور ہر شے سے حُسن کی شامیں پھوٹ  
کر نکل رہی ہیں۔ ماہ و نوکی چاندنی، سورج کی کرن، اشق کے رنگ، چشمہ کی روانی، پہاڑ کی بلندی اور طائر  
خوش الحماں کے نغموں میں اسے حُسن کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ کسی ایسے نظارہ سے ہلکا ہوتا  
ہے تو اس کی روح ادبی مسرت میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کا دل و نور شوق سے تیتاب ہو جاتا ہے اور اسے  
ایک روحانی کیفیت محسوس ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس جذبہ سے بھرپور  
ہے اور اس کی رنگینیاں ہر چیز پر چائی ہوئی ہیں۔

مخل قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حُسن آکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حُسن

حسن کو ہستان کی ہیبت ناک ظلمتوں میں ہے مہر مغسٹری شب کی سیہ پوشی میں ہے  
 آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ شام کی ظلمت اشفاق کی گل فروشی میں ہے یہ  
 غفلت دیرینہ کے ٹٹے ہوئے آثار میں طفلک نا آشنا کی کوشش گفتار میں  
 ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے ننھے ننھے طائروں کی آشتیاں سازی میں ہے  
 چشمہ کوہسار میں دریا کی آزادی میں حسن شہر میں محرمیں، دیرانے میں آبادی میں محسن  
 روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس درندہ اس محرمیں کیوں نالاں ہے یشیل جرس  
 حسن کے اس مام جلوہ میں بھی یہ بے تاب ہے زندگی اس کی مثال ماہی بے آب سے

دور اول کی نظموں میں ہیں دو عنصر کام کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اول وطن سے بے انتہا محبت  
 دوسرے مظاہر فطرت میں زندگی کے راز ہائے سر بسندہ کے انکشاف کی جستجو۔ ان نظموں میں جہاں اقبال فطرت  
 کی مصوری کرتا ہوا نظر آتا ہے وہاں ایک خاص قسم کی جھجک، جستجو اور تلاش کا جذبہ بھی کار فرما ہے۔ وہ حسن میں حقیقت  
 کا متلاشی نظر آتا ہے۔ شاعر فطرت سے درس لینے کی کوشش کرتا ہے اور قدرت کی زیر نگینوں کو دیکھ کر بعض  
 اوقات حیران سا رہ جاتا ہے۔ اس کی حقیقت پر زہی کی صلاحیتیں ہر موقع پر اپنا اظہار کرتی ہیں۔ چاندنی رات  
 آب رواں اور شیش فروزاں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہے اور پھر اپنے ذہنی تاثرات کو صغیر و کلاں  
 پر نقش کر دیتا ہے۔

پروانا اور ذوق تماشائے روشنی، کھڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی  
 نور کا طالب ہوں گھبراہٹوں اس بستی میں میں، طفلک سیاب پاہوں مکتب ہستی میں میں!  
 پھر بھی اسے اہمیت! میں اور ہوں تو اور ہے سینکڑوں منزل ہے ذوق آگے سے دور تو  
 گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سہرا پا نور تو یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہو  
 جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے درندہ اس محرمیں کیوں نالاں ہے یشیل جرس  
 روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس اسی طرح "ایک پوندہ اور جگنہ میں بھی خیال بندی کے بعض نادر نمونے نظر آتے ہیں۔

۹۰۰ء میں ڈاکٹر اقبال یورپ چلے گئے۔ ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک پر انھوں نے جو نظم پڑھی وہ اس دور کی آخری نظم ہے۔ یہیں سے ان کی شاعری میں مغربی علم و حکمت کے اثرات کی ابتدا ہوئی اور دانش کدہ فرنگ سے مستفید ہونے کے بعد انھوں نے جو نظمیں کہیں ان سے ان کی شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نظم میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں ان کی ملت ہستی اور خلوص صاف نظر آتے ہیں اور اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو ہمیشہ انھیں بزرگان دین کے ساتھ رہی۔ اس وقت اقبال نے اپنے لئے جو دعا کی تھی وہ بارگاہِ خداوندی میں قبول ہو گئی۔

چلی ہے لے کے وطن کے بھار خانے سے      شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو  
فلکِ نشیں صفتِ مہربوں زمانے میں      تری دعا سے عطا ہو دو نردباں مجھ کو  
مقامِ ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے      کہ سمجھ منزل مقصود کا رواں مجھ کو  
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے      کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو  
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے      یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کے دوسرے دور کی نظموں میں ہیں شاعر کی روحانی طبیعت کی تصویر بے نقاب نظر آتی ہے۔ فطرت کی منظر کشی جو پہلے دور میں قوی اور وطنی نظموں کے بھرپور میں کبھی کبھی ایک لمحہ کے لئے لمحہ انگن ہوتی تھی اب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ مغیرہ قرطاس پر نظر آتی ہے۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فطرت کے حسین جلوہ کے لئے مثال کی کام دیتی ہے جس میں شاعر خود بھی کبھی کبھی اپنی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ اجزائے کائنات میں جن کی جو بظاہر خاموش قوتیں کام کر رہی ہیں، وہ انھیں نمایاں کرتا ہے اور فطرت کے نرم و نازک باتہ میں ساغرِ حسن کو دیکھ کر بخود دہو جاتا ہے۔ اور اس کی ایک ایک ہونڈ کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک حسن و صداقت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں جن کا نہایت یہ ہے کہ وہ ہیں صداقت کے قریب کر دے اور ہمارے دل میں اعلیٰ مقام کی قدر کا جذبہ پیدا کرے جن، محبت کی فطرت کے لئے جذبہ محرک کا کام کرتا ہے۔ اقبال محبت کو ایک لطیف کیفیت سمجھتا ہے جو زندگی کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ اس کے مناظر عالمِ خاکی سے نہیں بلکہ عالمِ بالا کے موسیقار کے ذروں سے مرکب میں۔ اس میں لرزتے ہوئے تاروں کی چمک، تڑپتی ہوئی بجلی

کی کوک، حور کی پاکیزگی، مشبہم کی اتادگی اور فرشتہ کی معصومیت کے اجڑاٹے ہوئے ہیں۔ اور کائنات کی تمام حسین چیزیں اسی لطیف آمیزش کے خارجی مظاہر ہیں۔ محبت کے عنوان سے پہلی نظم میں لکھتے ہیں:۔  
 چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر باگلا      اٹالی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے  
 تزیں پہلی سے پانی حور سے پاکیزگی پانی      حرارت لی نفسائے مسیح ابن مریم سے  
 ذرا سی پھر رو بہت سے شان بے نیازی لی      ملک سے عاجزی اتادگی تغیر شبنم سے  
 پھر ان اجڑا کو گملا چشمہ حور کے پانی میں      مرکب نے محبت نام پا یا عرش اعظم سے  
 اور پھر اس کا اثر یہ ہوا:۔

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھڑا      گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہدم سے  
 خرم ناز پا پا آفتابوں نے ستاروں نے      چمک غنچوں نے پانی داغ پائے لالہ اڑوں نے

”حقیقت حسن“ کے نام سے جو نظم کہی ہے اسے اس دور کا شاہکار کہا جاسکتا ہے (Symbolism) ورنہ

جو اقبال کے آرٹ کا ایک نمایاں پہلو ہے اس میں بھی موجود ہے۔ اس میں شاعر نے رمز و کنایہ سے حسن کی بے ثباتی پر بڑے لطیف پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور پھر ”حقیقت زوال“ کی توجہ عجیب انداز سے کی ہے۔ اس نظم میں کسی قدر نمطی انداز نمایاں ہے جو اس دور کی ایک خصوصیت ہے اور جو حساس فوجوانوں میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ ان اشعار کی وقعت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک شاعر کا دل اور ایک معصوم کی نگاہ چاہئے:

کیں قریب تھا یہ گفتگو کرنے سنی      فلک پہ نام ہوئی اختر سحر نے سنی  
 سحر نے تارے سے سکر تائی شبنم کو      فلک کی بات بتا دی زمین کے محوم کو  
 بھرائے پھول کے آنسو پیام شبنم سے      کلی کا نسا دل خون ہو گیا غم سے  
 چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا      شباب سیر کو آیا تھا سو گوار گیا

طلبائے علی گڑھ کالج کے نام جو پیام اقبال نے دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نظم مہتی کے ان اجڑا کو کس قدر اہم سمجھتے تھے اور ملت کی زندگی فوجوانوں کے کردار سے کس حد تک وابستہ ہے۔ اقبال پوری قوم کو جو پیام دینا چاہتے تھے وہی پیام انھوں نے اس قوم کے اہل علم و فہم طبقہ کے سامنے پیش کیا۔

مختلہ کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی فحش کا زمانہ تھا اور مسلمان اپنے نصب العین سے ہٹ کر مختلف راستوں کی طرف جھٹک رہے تھے اس وقت اقبال نے نوجوانوں کو ذوقِ عمل اور ذوقِ تپش کا سبق دیا انہیں اپنی زندگی کا ایک جزو بنالینے کا پیام دیا اور ان کی سرورگوں میں احساس اور زندگی کی تازہ لہریں دوڑا دیا اس پیام میں ہمیں بعض وہ چیزیں ملتی ہیں جنہوں نے اقبال کی آئندہ شاعری میں ایک نظمِ فلسفہ زندگی کی صورت اختیار کر لی اور جنہوں نے اقبال کو رومانی شاعری سے اونچا اٹھا کر نثر و جدیدہ کی طلوع ہونے والی سحرِ نقیب اور قوموں کی زندگی کے دھائے کو موڑ دینے والا منکر اور شاعر بنا دیا۔ یہی وہ دہائی ہوئی چنگاریاں تھیں جو بعد میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں اور جنہوں نے اقبال کی شاعری کی پیشانی پر حیاتِ جاوید کا مجسمہ لگا دیا۔

آتی تھی کوہ سے صد ارازیات ہے سکوں      کتنا تماہورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے  
جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمنِ محباز کا      اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے  
موت ہے پیشِ جاوہاں ذوقِ طلبِ اگر بند      گردشِ آدمی ہے اور گردشِ بام اور ہے  
شعِ سحر یہ کہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز      غمکہ نمود میں شرطِ دوام اور ہے  
یورپ کے عیش پرور احوال نے اقبال کے دماغ پر جو تاثرات مرتب کئے ان کا عکس کم و بیش تمام نظموں میں نظر آتا ہے اس وقت اقبال مامِ نوجوان شاعروں کے انداز میں جنِ و شوق کے رمزِ آشکارا کرنے میں منہمک نظر آتا ہے اور بعض وقت ایسا لکھو یا جاتا ہے گویا اس کی روح اس میں ڈوب گئی ہے سخنِ عشق کے عنوان سے ایک نظم میں یہ احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں اقبال محبوبِ مجازی کے جہاں کے شاہدہ میں غرق ہے تاکہ اس جذبہ کی تسکین کر سکے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اقبال کا اندازِ بیان بہت دلکش اور آفریں ہے فراتے ہیں۔

جس طرح ڈوبی ہے کشتیِ بہمنِ قسمر      نورِ خوشید کے طوفاں میں بھگامِ سحر  
جیسے ہو جاتا ہے گم نورِ کالے کے کرا بخل      چاندنی رات میں، متاب کا ہر گنگنل  
جلوہ طور میں جیسے یہ بیٹھنا ہے کیسہم      موہِ نگہت گلزار میں غنچے کی شہسہم

ہے ترے یلِ محبت میں یوسفی دل میرا!

اسی نوع کے چند اشعار اور سنیے۔



شیشہ دہریں مانند نئے ناب ہے مشق      روح خورشید ہے خونِ رگِ متاب ہے مشق  
دل ہرزہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی      فوریہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی  
کس سالنِ مسرت کسین سازِ غم ہے      کسین گوہر ہے کسین اشک کسینِ شبنم ہے  
تیلے کا فلسفہ محبت بھی اسی کے قریب ہے اس کے نزدیک اجزائے عالم کی باہمی وابستگی کا نام محبت  
ہے جس کے بغیر کائنات کا وجود ناممکن ہے اور انسانی زندگی کیفیت سے خالی۔

”چاند اور تارے“ کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے نہایت دلکش انداز میں زندگی اور حرکتِ دوام کے مسئلہ پر اپنا خیال کیا ہے اور علِ پیہم اور ذوقِ طلب کو ترقی اور حیات کے لوازمات قرار دیا ہے قوموں کی زندگی میں جب یہ عنصر کمزور پڑ جاتا ہے تو ان کا اجتماعی احساس ختم ہو جاتا ہے اور وہ بہت جلد اپنی انفرادیت کو ختم کر کے زندگی کے چراغ کو گل کر دیتی ہیں۔ اقبال نے چاند کی زبانی یہ پیام پہنچایا ہے۔ زبانِ سادہ سادہ دلنشین اور سلسل ہے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور داغ کے بعض اجزا لیکر اقبال کے پیکر میں ڈھالے گئے ہیں۔

کنے لگا چاند ہم نشینو!      اسے فرزعِ شب کے خوشہ چینو!

جنبش ہے زندگی جہاں کی      یہ رسمِ قدیم ہے میاں کی

ہے دوڑتا اشتب زمانہ      کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس روہ میں مقامِ بلے محل ہے      پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے بکل گئے ہیں      جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرامِ کا حسن      آغاز ہے عشق، انتہا حسن

یورپین معاشرت کی رنگارنگ بزمِ آرائیوں اور رومانی شعرا کے کلام نے اقبال کے نوجوان اور

شاعرانہ دل پر جو اثرات ڈالے انھیں ایک حد تک ایپیکوریٹ (Epicureanism) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے وہ زندگی سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور غمِ داندوہ کے گرد و خراب سے شیشہ دل کو صاف رکھنے کا خواہشمند ہے۔ اسے ساقیانِ میلِ شرابِ طہور ذکرِ سلسبیل اور جلوہ طور سے کوئی دلچسپی نہیں وہ تخیل کے ان فلسفوں کو توڑ کر اس دنیا میں اپنی روح کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دور کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی

زندگی میں بالیدگی اور فو کا سلسلہ جاری رہے۔ وہ عیش و سرور کے ان رنگین پردوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے۔ تاکہ انسان کسی فریب میں مبتلا نہ رہے۔ ہر مذہبی کیفیت کے یہ حسین جلوے ایک ذوجان شاعر کے دل کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ یہ اس کی بے چین اور نا تنگیا روح کی ایسی آزمائش ہے جس سے وہ داسن بکا کر کھل جاتا ہے۔ وہ افسردہ کو خوب دل کھول کر بنیاد چاہتا ہے۔ وہ خیام کی طرح عشرت امروز کا قائل ہے۔

مقام ان ہے جنت مجھے کلام نہیں	شباب کے لئے موزوں تر پائیم نہیں
شباب آہ کہاں تک امیدوار رہے	وہ عیش و عیش نہیں جس کا انتظار رہے
وہ حسن کیا ہے جو محتاج چشم بنیا ہو	نمرد کے لئے منت پذیر فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگی کا	عقیدہ "عشرت امروز" ہے جوانی کا

لیکن شراب زندگی میں اس قدر منہک ہونے کے باوجود بھی اقبال حقیقت کی جستجو سے غافل نہیں۔ وہ اسرارِ روز کے چہرے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے۔ اس کا ذوق آگے "زندگی کا راز معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو۔ اور وہ ہمہ تن استعجاب بنا ہوا طلسر زبان و مکان کی پنائیوں کو ناپ رہا ہے۔ اپنی نظم "انسان" میں اقبال نے انہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اُن گنت خلوقات کی اس نیرنگی میں اقبال نے انسان کی جو تصویر کشی ہے وہ بہت دلکش ہے۔ اس کے ارد گرد تمام فضا میں ہر چیز کیف آواز نشہ میں چور رہے۔ اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے۔ سورج دریا بادل تارے، خورشید، اپنے اپنے کام میں منہک ہیں۔ اور ان کی طاعت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے مسموں کا محل پائے ہیں لیکن اس "لگا رہا نہ چین" میں انسان یکدہ تنہا کھڑا اپنے تخیل کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ملجی روزگار پر فوہ خوانی کر رہا ہے۔

قدرت کا عجیب یہ قسم ہے

انسان کو راز جو بنایا	لازاس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگے کا	کھٹا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغا زد انتہا ہے	آئینے کے گہریں اور کیا ہے

لذت گیسہ وجود ہر شے سرست مے نمود ہر شے

کوئی نہیں ٹکرا انسان کیا تلخ ہے روزگار انسان

تیسرے دور کی ایک نظم "انسان" میں قنوطیت کا یہ انداز رجائیت سے بدل گیا ہے اس تصویر میں انسان باختیار اور دوسرے موجودات سے برتر نظر آتا ہے اور اس کی ہمتی میں زندگی کے شاندار امکانات مضمر ہیں چنانچہ لکھتے ہیں

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے!

اس ذرہ کو رہتی ہے بعثت کی ہوس ہر دم یہ ذرہ نہیں شاید سنا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیبت چمنستان کی یہ ہستی دانا ہے، مینا ہے، توانا ہے!

ایک شام "اور تنہائی" دو نظمیں دوسرے دور میں امتیازی شان رکھتی ہیں ان دونوں نظموں

میں ورڈز ورتھ (Wordsworth) کا تخیل اقبال کی زبان سے ادا ہو رہا ہے زبان اس قدر پیاری اور دلکش ہے۔ اور شاعر نے انداز بیان سے ایسا سحر بچھکا ہے کہ انھیں ادب العالمیہ کے بہترین نمونوں میں شمار کیا جاسکتا ہے فطرت کی اس سے بہتر تصویر کشی جس میں جذبات، زبان اور تخیل مل جل کر انھوں بن گئے ہیں، خیال میں نہیں آسکتی جس وقت اقبال نے یہ نظم کہی ہوگی تو اس کا تخیل آسمانوں میں پرواز کر رہا ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل فطرت کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس کی انفرادیت غائب ہو گئی ہے۔ چند اشارے ملاحظہ کیجئے

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

دادی کے نوافروش خاموش کسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بیخوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے گھوئی ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت و دیا قدرت مرا تپے میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تنہائی شب میں ہے قوی کیا! انجم نہیں تیرے ہم نفس کیا!

یہ رفعت آسان خاموش      خوابیدہ زمیں، جہاں خاموش  
یہ چاندیہ دشت و دریاہ کسار      فطرت ہے تمام سترن زار  
موتی خوش رنگ پیاے پیاے      یعنی ترے آنسوؤں کے تائے  
کس نئے کی تجھے ہوں بولے دل!      قدرت تری ہم نص بولے دل!

”عبدالغادر کے نام کی نظم میں اقبال کے ارادوں اور دلوں کا خواب صاف نظر آتا ہے۔ یہ نظم دراصل ان کے ذہنی نقوش کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو بعد میں شاعرانہ معجزاتی کے ساتھ زیب ترطاس ہوئے ہیں وہ دہندی سی تصویر ہے جو آئندہ ”مشکوہ“، ”سجواب شکوہ“، ”شیعہ و شاعر“، ”خضر راہ“ اور ”طلوع اسلام“ میں تخیل کی صورت گری سے دلکشی و زیبائی کا جہان بین کر ظاہر ہوئی ہے اور جس کی نقاب کشائی نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا سکھ دلوں پر بٹھا دیا۔

پانچ ستر کی نظم میں جو دوسرے دور کی آخری نظموں میں ہے، اقبال نے اپنے شاعرانہ فنی کے خلاف کھلا ہوا مظاہرہ کیا۔ ہمیں سے اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے رجحان کا آغاز نمایاں ہوتا ہے۔ جو تیسرے دور کی نظموں میں پوری وسعت میں پھیل کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام و دیار یار ہو گا      سکوت تھا پردہ و اجس کا وہ راز اب آشکار ہو گا  
گزر گیا اب وہ دور مائی کہ چپ کے پتے تھے پیٹے داٹے      بنے گھاسا راجھاں میں خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا  
پہلے دور میں شاعر ذوق استغناء کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے دور میں فطرت کے جلوے اس پر راز ہائے سر بستہ کی پردہ دہی کر رہیں اور تیسرے دور میں وہ زندگی کے رازوں سے واقف ہو کر اپنی ملت کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اپنی شاعری کے حمد فطرت میں وہ ایک وطنی شاعر تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ فطرت کا ایک چابک دست منظر کش۔ دوسرے دور میں جذبات حسن و عشق کا تامل فطرت کی حسین صنایع اور زندگی کے رازوں کی آنکھ رانی، اس کے ذہنی نشوونما کی خاڑی کر رہے ہیں بعض نظمیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے جس چیز کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اب اسے پا گیا ہے اور ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ تیسرے دور میں وہ ایک مفکر ملت اور بض شناس

حکیم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اپنی دور رس نگاہوں سے قومی زندگی کے مد و جزر کا جائزہ لیکر حیات قومی کے اصول مرتب کر رہا ہے اور مسلمانوں کی کشتی حیات کو موجوں کے تھپیڑوں سے بچا کر بہنا ر ساطل کر دینا چاہتا ہے۔

قیام ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی یہ بغیر انہ شان کا آواز ہے۔ اس سے پہلے کا اقبال محض شاعر تھا مگر اس کے بعد کا اقبال ایک پیغامبر کی حیثیت رکھتا ہے جو ست عناصر قوم کے جسد خاکی میں حیات نو کا شعراہ پھونک کر اور کمالات زندگی کے شعلہ کو ہر جگہ کا اسے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے مغرب کی معاشرتی زندگی رس بس کر اس تمدن کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور اس دریا کے عین منہ پر اس میں پونچھ کر اس کی انتہائی گہرائیوں کا جائزہ لیا تھا۔ چنانچہ اس کے فیرمولی غور و فکر اور اثر و نفوذ کا ہی نے اسے مغرب کی سرد روحانیت سے ہزار کروڑا دور اس نے کہا ہے

پیر مٹاں فرنگ کی مے کا شاطہ ہے اثر اس میں وہ کیفیت غم نہیں سمجھ کو زمانہ ساز ہے

مغربی تہذیب و تمدن کی رنگارنگ و نفرتیوں نے اقبال کے ذہنی توازن کو بگاڑا نہیں بلکہ اس پر پیچسل کر کے اس میں گہرائی، صداقت اور دور رس پیدا کر دی اور جب اس نے اس کا مقابلہ اسلامی تمدن سے کیا تو حقیقت ظاہر ہو کر سامنے آگئی اور اقبال کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تمدن کی بنیاد کس قدر کمزور اور سست ہے۔ اور ان رنگین پردوں کے پیچھے اوہام کا ایک حسین پیکر ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔ ان دونوں تہذیبوں کے موازنہ نے اقبال کی زندگی کا عظیم اثر ان نصب العین متعین کر دیا۔ اور اس نے اپنے تخیل اور جذبات فکری اور ذہنی استعداد کے انہار کے لئے ایک راہ بکمال لی۔ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ تہذیب کی یہ چمک دمک زوال پذیر ہے اور اس کے ساتھ مغربی قوموں کا غمخیز حیات بھی خاکستر ہو جائے گا۔ انہیں اس تہذیب میں روحانیت کی موت نظر آرہی تھی۔ اور ان کا خیال تھا کہ ادیت کی بنیادوں پر جو فلسفہ حیات مرتب کیا جائے گا وہ انسانیت کی حفاظت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ انہی خیالات کو اقبال نے دوسرے دور کے آخر میں ان الفاظ میں بلند آواز سے منشر کیا ہے

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی ہمتی کہاں نہیں کھرا جے تم مجھ رہے ہو، وہی زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خورسے آپ ہی خود کشتی کر گئی جوشاخ نازک پہ آتشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا اس موضوع پر اقبال نے اپنی آئندہ تصانیف میں متقل طور سے اظہار خیال کیا اور ہندوستانیوں کو اس غریب سے آگاہ کر کے صحیح راہ عمل دکھائی۔

شروع شروع میں اقبال نے سیاسی تحریکات سے متاثر ہو کر وطنیت کی نغمہ سرائی کی تھی لیکن قومیت کے تصور کی تنگ دہنی ان کے بین الاقوامی فلسفہ کا ساتھ کیوں کر دے سکتی؟ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی آڑ میں تو میں کس طرح قوت و اقتدار کی خواہش کو پورا کر کے انسانیت کے زوال کا باعث ہوتی ہیں اور اپنے حوصلہ کو شیریں الفاظ کا جامہ پہنا کر امپریلیزم کے قیام و بقا میں مدد ہوتی ہیں۔ ہر ٹپے شاعر کا پیام عالمگیر ہوتا ہے اور اسکی نگاہ میں خیر فانیی جدیدیاں کوئی وقعت نہیں کہتیں۔ اقبال نے اس بات کو جو تہذیبیہ تہذیب نوی ہے پاش پاش کر دیا اور ان خیالات کی بیج کئی کر کے اسلامی نظریہ قومیت پیش کیا۔ اب اس ترانہ ہندی کی بجائے ترانہ ملی لکھا اور وطنیت کے مذہب اور اوسچے فلسفہ کو اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تہذیب کے ان خوشنما کھلونوں میں کس قدر زہر ملا ہوا ہے۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بھر میں آزاد وطن صورت باہی  
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی تخیل ہے مقصود تجارت تو اسی سے  
اقوام میں محسوس خدا مٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کھٹکتی ہے اس سے

ل "شکوہ" اور جواب شکوہ میں اقبال نے مسلمانوں کے ماضی کی شاندار روایات، حال کی تباہ حالی، مستقبل کی امید اور اجملیوں کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا ہے، "شکوہ" میں ماضی کا گلا گداز اور جواب شکوہ میں حال کی توجیہ جس انداز میں کی گئی ہے وہ خیالی مذہب پرستوں کے نزدیک بیباک نہ ہسی مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھی چیز ہے جس سے اقبال کی گہری نظر اور جدت کا پتہ چلتا ہے۔ "مدرس" بھی اسی قسم کی ایک نظم ہے جسے مسلمانوں کی حیثیت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں گرائمریزی کی واقعیت (Realism) اور ہندی کی گھلاؤ پوری طرح موجود ہیں جس سے مالتی کی اسادی کا پتہ چلتا ہے مگر اس میں گرائی کے ساتھ شگفتگی موجود نہیں اور واقعیت نے شریعت کے چہرہ پر نقاب ڈال دی ہے۔ "شکوہ" میں حقیقت نگاری کے ساتھ جامعیت موجود ہے

اور انداز بیان اس قدر دلکش ہے کہ خود بقول اقبال ”شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے“ مالی نے اپنے پرستو اشعار سے جن میں عرب شاعروں کی سی گرمی ہے ہنید کے متوالوں کو چکھادیا۔ اور ان کے خون میں حرارت اور شہس پیدا کی مگر اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری نمک سے خالی ہے۔ سرس کے دیا چہیں انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس دور کے لوازمات اور تقاضوں کے مطابق اس کی شاعری کا پیکر تیار ہوتا ہے۔ مگر طرز ادایک الگ چیز ہے جو شاعر کی شخصیت اور انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ حالی کے یہاں جو کسک اور کٹھک ہے اقبال نے اسے اور بڑھا دیا ہے۔ حالی کے یہاں قومی احساسات کی وہی وہی آنچ ہے۔ اقبال نے اسے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ فارسی شاعری کے رسیا ہر چیز کو نمٹ، جام، مے، محفل، ساقی اور اسی قسم کے دوسرے اصطلاحات شاعری میں دیکھنے کے مادی ہو گئے تھے اور ان کے دماغوں میں مکلفات اس قدر رچ گئے تھے کہ وہ ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال نے انہی پرانے ساغروں میں تند و تیز شراب ایک نئے انداز سے بھر کر پیش کی اور اپنی غیر معمولی قوت بیان سے کام لے کر اس کام کو پورا جس کی ابتداء حالی نے کی تھی۔ ایک جگہ شکایت کا انداز کس قدر پیارا ہے۔

دوسری بھی وہی، تیس کا پہلو بھی وہی	نجد کے دشت و جبل میں رام آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، جن کا جادو بھی وہی	امت احمد مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
بہرہ آزر دگی غیر سبب کی معنی؟	اپنے شیداؤں پہ پیہ پیہ غضب کیا معنی؟
اور پھر ایک دوسری جگہ یہ طرز کس قدر دلکش ہے۔	
بادہ کش غریب گلشن میں لب جو بیٹھے	سننے ہیں جام بکثرت نمٹے کو کو بیٹھے
دور ہنگامہ گلزار سے یک سو بیٹھے	تیرے دیوانے بھی ہیں متکلم ہر جو بیٹھے
اپنے پر دانوں کو بھر دقت خود دافروزی دے	برق دیرینہ کو فرمان جگہ سوزی دے

قدرت کے مناظر کی دلکشی کے ساتھ ساتھ اپنے پیام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ تیرے دور میں بھی جاری رہا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اہمیت پر اقبال نے جگہ جگہ زور دیا ہے۔ اجرام فلکی کی باہمی آویزش سے

اقبال نے اجتماعی قوت کا اصول مرتب کیا ہے جس کے بغیر افراد کی زندگی میں کوئی زور نہیں ہوتا۔ تنظیم اور اخوت اور اجتماعی احساس ملت کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور باہمی ربط سے وہ چشمے بہوتے ہیں جو کشت زار قوم کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک نظم بزمِ بزم میں اقبال نے تاروں کی زبان سے زندگی کا اصول واضح کیا ہے۔

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین دالے      جو بات پاگئے ہم تھوڑی سی زندگی میں  
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے      پوشیدہ ہے یہ حکمت تاروں کی زندگی میں  
اجتماعی تنظیم کے بغیر انفرادی زندگی بیکار ہے      تظہر دریا میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کو ختم نہیں کر دیتا بلکہ اہل میں  
اس کی زندگی کے سوتے ہیں سے کھلتے ہیں۔ فرد اور ملت کے اس تعلق کو اقبال نے شمع اور شاعر میں اس

اپنی اصلیت پر قائم تھا تو جمعیت بھی تھی      چھوڑ کر گل کو پریشاں کا روان ہو ہوا  
زندگی نظر سے کی مکھلاتی ہے ہمارا حیات      یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا  
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہو یہ      زندگی کیسی جو دل بیگانہ پہلو ہوا  
آہو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی      جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا  
فرد قائم و رابطت سے بے تنہا کچھ نہیں      موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں  
”شمع و شاعر“ میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا ہے جنہیں بُرحانی ہیں سورول  
کو ناز دیا ہے۔ احساسِ کمتری کے افسوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ نظامِ کائنات میں ان کی حیثیت کو نمایاں کیا  
ہے۔ ان کے پیام کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے۔ اور حالات کے چہرے سے  
نقاب اٹھا کر مستقبل کا حین اور تابناک چہرہ دکھایا ہے۔

اپنی اصلیت سے ہوا آگاہ اے غافل کہ تو      قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے  
کیوں گرفتارِ ظلم بیچ مقدار می رہے تو      دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفان بھی ہے  
سینہ ہے تیرا میں اس کے پیامِ ناز کا      جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے



شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے یہ چین مملو ہوگا نغمہ توحید سے  
 "جواب شکوہ" میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی برق طبعی نہ رہی شعلہ قتالی نہ رہی  
 رو گئی رسم اذان روح بلائی نہ رہی فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی  
 مسجدیں مرثیہ خدائیں ہیں کہ نازی نہ ہے یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ ہے

✓ "خضر راہ" میں جو تیسرے دور کی مقبول ترین نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے حالات حاضرہ پر بڑی گہری تنقید کی ہے۔ یہ نظم سنہ ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی اور سوز و گداز سے لبریز ہے۔ جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا نقش اقبال کے دل پر مرتسم ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس میں انسانیت کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ مالک اسلامیہ کہ جو پہلے ہی سے انجمنوں کی گہرائیوں میں ڈوب چکے تھے۔ اس دھچکے کی تاب نہ لائے، انتشار کی قوتیں نشوونما پانچکی تھیں۔ پرانگندگی اور فطری سے حالت پہلے ہی دگرگوں تھی اس پر دوسرا چکر لگا۔ دنیائے اسلام پر کھٹ اوبار کی گھنائیں ہر چار طرف سے چالکی تھیں اور اسلامی سلطنت کا خیال افنا پارہیہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نظم میں اقبال نے صحرا نوردی کی حقیقت بیان کی ہے۔ زندگی کے رموز آشکارا کئے ہیں سلطنت اور حکومت کی ماہیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ سرمایہ و محنت کی آویزش پر نشینی ڈالی ہے۔ ایشیا کی یورپ زدگی پر اظہار خیال کیا ہے۔ مالک اسلامیہ کی سیاسی روش پر تنقید کی ہے اور مسلمانوں کو امید کا درس دیا ہے۔ یہ نظم گوناگوں خیالات سے لبریز ہے اور اس میں زندگی کے بہت سے باریک نکات حل کئے ہیں۔

زندگی کا فلسفہ پیش کرنے میں اقبال نے بڑی قدرت سے کام لیا ہے۔ وہ زندگی عام پیانوں سے ناپنا نہیں چاہتے ان کے خیال میں حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک تخلیقی حرکت ہے جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے سخت کوشی زندگی کا اساسی اصول ہے اور آزادی اس کی نشوونما اور تسلسل کا جزو لاینفک۔ غلامی سے زندگی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں اور انسان زندگی کی حقیقی مسرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ روح کی بالیدگی تخلیقی قوتوں کی نشوونما اور بلند مقاصد کو حاصل کرنے کا جذبہ سرور پڑ جاتا ہے اور انسانی تگ و تاز کا میدان تنگ ہو جاتا ہے۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی  
 ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی  
 تو اسے پیانہ امروز و فردا سے نہ ناپ  
 جاو داں بیم و داں ہر دم جواں ہے زندگی  
 زندگی کی حقیقت کو کہن کے دل سے پوچھ  
 جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی  
 بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہوا کہم آسب  
 اور آزادی میں بحسب بیکراں ہے زندگی

• طلوع اسلام میں اقبال نے اپنا رجائی پیغام بڑے پرشکوہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یاس و امید کی کالی کالی گٹھاؤں میں امیدوں کا چمکتا ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اقبال نے اسلام کی سر بلندی کا جو خواب دیکھا تھا زمانہ نے اس کی تفسیر پیش کر دی اور جنگ عظیم کے بعد کچھ ہی عرصہ میں اسلامی سلطنت کے تن خاکی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں الہامی رنگ ہوتا ہے۔ وہ محض انکار کی مرستی میں محض رہتا بلکہ اس کے ”آئینہ گشتار“ میں مستقبل کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے اور وجدان تیز تر و زائد کا بڑا نبض شناس ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے پیام میں حیات قومی کی تعمیر کے لئے ایک لائحہ عمل موجود ہوتا ہے ”شع و شاعر“ میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا تھا

بے خبر توجہ ہر آئینہ الیام ہے  
 تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

• طلوع اسلام میں ایک نئے انداز سے پھر اسے دہرایا اور کہا

ترمی فطرت میں ہے مکانات زندگی کی  
 جہاں کے جوہر مضر کا گویا امتحان تو ہے

خضر راہ میں شاعر کے جذبات میں ایک ہلکا سا قنوطی انداز ہے لیکن اب اس کا پیام شک اور مذہب اضطراب و بے یقینی کی بجائے یقین و وثوق سکون اور اطمینان کے جذبات سے ملو ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر مسلمان کے ایمان کی چنگاریوں کو مشتعل کیا جائے تو وہ پھر تقدیر کی صورت گری کر سکتا ہے۔

• طلوع اسلام میں وہ امید کے گیت الاپ رہا ہے اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اس کی نئے

میں تونگ ہے اور انداز میں سی ترانوں میں تازگی ہے اور موسیقیت۔ وہ شراب زندگی سے مدہوش کیف و سرور کے عالم میں گائے جا رہا ہے اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے جذبات کو جھپٹ رہا ہے۔ اس کی آواز میں سحر ہے اور انداز بیان میں بے پناہ دلکشی۔ احساسات میں خوشی مکرار ہی ہے

نواؤں میں زندگی ہے اور زندگی میں حسن اس کے ہر لفظ سے امرت کے رس کی بو ذہین ٹپک رہی ہیں۔ اور اس کا دل انبساط کی لہروں کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ یہی کیفیت اس کے ساز کے ہزار سے کھل کر مضمون قسط اس پر نمایاں ہو گئی ہے۔

بیاساقی نوائے مرغزار از شاخار آمد      بہار آمد نگار آمد نگار آمد قسرا آمد  
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و چرا      صدائے آبشاراں از فراز کو بہار آمد  
کنار از زہد اہاں برگیر و بیابانہ ساغر کش      پس از مدت ازین شاخ کن بانگ ہزار آمد  
سر خاک شیدے برگائے لالہ می پاشتم      کہ خوش با نہال ملت ماسا نگار آمد  
”بیاتا گل بر افشانیم دے در ساغر اندازیم      فلک راستفت بشکافتم و طرح دیگر اندازیم“

ادھر تو ”بانگ دراہ کی تیسرے دور کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں اور ادھر ”اسرار خودی“ اور ”مومن خودی“ کا تانا بانا تیار ہو رہا تھا۔ یہی وہ محرکۃ الارشاد تھیں جنہوں نے اقبال کی شہرت کو چار چاند لگا دئے اور ان کے عالمگیر پیام کا شہرہ تمام دنیا میں پھیل گیا۔ جس طرح لندن کی ”گمشدہ فردوس“ نے اس کی شاعرانہ عظمت کا نقشہ دوں پر ثبت کیا۔ اور شہرت عام اور بقائے دوام کا مرصع تاج اس کے سر پر کھدیا۔ اس طرح اقبال سب سے پہلے ان ہی فنویوں کی بدولت ایک مفکر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کی ان دو شمنویوں نے دنیا کے تصوف اور دنیا کے ادب میں تھکے ڈال دیے۔ اور انھوں نے افراد و قوموں اور کائنات کی خودی کا جو نظریہ پیش کیا اس سے انانیت کے تمام پرانے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ڈھکے ہوئے اشارے اور وہیمی آوازیں جو کبھی کبھی ”بانگ درا“ میں ذوقِ عمل اور ذوقِ طلب کی ہبسم اصطلاحوں کے پردوں میں ظاہر ہوتی تھیں اب ایک گرج بنگر گونج اٹھیں۔ شاعری فلسفہ اور تصوف کی جھلکیاں پہلے بھی نظر آتی تھیں۔ اب اقبال نے ایک فلسفی شاعر کی قبا پہن لی اور اس کے فلسفہ نے ایک منظم فلسفہ زندگی کی حیثیت اختیار کر لی۔

اقبال کے فلسفہ کا ننگ بنیاد جو ”اسرار خودی“ کا موضوع ہے۔ اثبات خودی میں مضمر ہے۔ اپنی ہستی کا احساس اور اپنی قوتوں کا ادراک فرد کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس سے انسان میں یقین، ذوق اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس پر زندگی کے راہزماے سربستہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ انسان خدا

کی ہستی کا ایک پرتو ہے۔ اس لئے شعور ذات کے بغیر ہستی مطلق کی معرفت حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اگر خدا کو ایک مجروح تصور کر لیا جائے تو اس میں انسان کی ہستی ایک قطرہ کی مانند ہے شعور ذات سے انسان میں عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ تمنائیں اور دلوں کے تازہ تازہ ہو جاتے ہیں جن سے رزمگاہ خیر و شر میں وہ اپنی دنیا آسانی سے بنا سکتا ہے۔ فرو کا نفس گو ایک فانی ہستی ہے مگر وہ اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ خودی کا استحکام اور نشوونما اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ فیضی یعنی عالم طبی سے مسلسل برسرِ پیکار رہے۔ اس سے نت نئی خواہشات کی تخلیق ہوتی رہتی ہے اور نئے نئے مقاصد کا تعین ہوتا ہے اسی سے ارادے اور انگلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ سوز آرزو پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے ٹرپ اور بے چینی بے قراری اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کا دوسرا نام ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است	اصل اور آرزو پوشیدہ است
آرزو در دل خود زندہ دار	تا فکرو دشت خاک تو مسرار
آرزو جانِ جانِ رنگ و بوست	فطرت ہر شے میں آرزو دست
آرزو ہنگامہ ہائے خودی	موج بے تابے ز دریاے خودی
ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم	از شمع آرزو تا بندہ ایم

خود کی منازل ترقی زمان و مکان کی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتیں بلکہ ان کے طلسم کو توڑ کر عالم ماورائے کی پٹائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور اپنی تلک و تاز کے لئے نئے نئے میدان تلاش کرتی ہیں۔

خود کی ہے یہ منزل لیس	مسافر یہ تیرا نشان نہیں
بڑے جا یہ کوہ گراں توڑ کر	طلسم زمان و مکان توڑ کر

خود کی تقویت اور رہنمائی کے لئے عشق ضروری ہے۔ اقبال نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد وہ جذب اندروں ہے جس کا سرچشمہ وجدان ہے۔ محبت ہی سے خودی معراج کمال تک پہنچتی ہے اور اسی سے اس شرارہ میں سوز، جلا اور تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادیں اسی سے استوار ہوتی ہیں اور وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو روحانیت کا جوہر ہے عشق ہی کا اثبات

کی اصل روح ہے اور اسی سے انسان اعلیٰ مراحج تک پہنچتا ہے۔

نقطہ نور کے نام اور خودی است	ذیر خاک ماضی و زندگی است
از صحبت می شود پائندہ تر	زندہ تر و سوزندہ تر با بندہ تر
عشق را از تیغ و خنجر پاک نیست	اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
دل ز عشق او توانا می شود	خاک بہر دوشش نریا می شود

احساس خودی کی اہمیت کو اقبال نے جگہ جگہ دہرایا ہے اور اس کی لازوال قوتوں کی مدح سرائی میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی ہے۔

بیکہ بستی ز آمار و غم و سیاهی	ہر چہ می بینی ز مہر و غم و سیاهی است
خوشن را چوں خودی بیدار کرد	آتشکارا عالم پسندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندرزوات او	غیر او پیدا است از اثبات او

اقبال کا فلسفہ انفرادیت جس میں زندگی اور کائنات کی وحدت کا تصور پیش کیا گیا ہے ہیگل کے فلسفہ سے بالکل مطابقت نہیں کرتا۔ اس کے خیال کے مطابق انسان کا مہمناہ مقصود یہ ہے کہ وہ حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کر دے۔ اقبال خودی کی ابھار اور نشوونما کے قائل ہیں جس سے انسان میں تسخیر نفس و آفاق کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خدا کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ کمال تک پہنچتا ہے اور اس کے حرائم کا یہ حال ہو جاتا ہے۔

در دشت جنون من جبرئیل زبوں میدک  
یزداں بہ کند آور اسے ہمت مردانہ!

اقبال کی رائے میں مصائب و آلام خودی کی تربیت اور ملاح کا موجب ہیں۔ خود پناہ کے نزدیک یہ چیز فوگشی کے جواز میں پیش کی جاسکتی ہے۔ فقر و استغنا، خودی کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیازی، فوایں فطرت کی تسخیر اور دنیا میں انسانیت کے نصب العین کو فروغ دینے کا نام ہے۔ جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے بے نیازی حاصل کر لیتی ہے تو اس میں زندگی کی لازوال قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں اور کائنات میں اپنی برتری کا سکھ جادیتی ہیں۔ اس وقت اس کی

برائی کے خلاف کوئی رک نہیں کی جاسکتی اور انسان اپنی اس حیثیت سے بہت بلند ہو جاتا ہے اسی سے اس میں روحانیت کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے اور احساس نفس کے کل نشو و نما کے بعد وہ قرب الہی حاصل کر سکتا ہے اور یہی ارتقائے خودی کا انتہائی نصب العین ہے جو اقبال پیش کرتے ہیں۔

فرد اور ملت کے قانون کو اقبال نے خودی سے تعبیر کیا ہے جس سے انسان کی انفرادی قوتیں زیادہ منظم اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی خودی کا احساس فرو کی خودی کے احساس کو تقویت پہنچاتا ہے اور اسے وسیع تر اور محکم تر کر دیتا ہے۔ اس سے اس کی تیغ خودی آبدار ہو جاتی ہے اور اس کی فطرت کا جوہر اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ اسلام کے تمام ارکان میں اجتماعی احساس کی یہی روح کام کر رہی ہے اور اسی نے ابھی تک مسلمانوں کو ایک مضبوط معاشرتی نظام میں باندھ رکھا ہے۔ ملت میں گم ہو کر انفرادی ہستی گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ زیادہ موثر اور مہذب خیز بن جاتی ہے۔ افکار اور کردار کی وحدت جو اسلامی تعلیمات کا اساسی اصول ہے۔ انہیں ملت کو سامنے رکھتے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اسی سے کسی قوم میں سر بلندی پیدا ہو سکتی ہے۔ اقبال نے اس موضوع پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے۔

فرد را ربط جماعت رحمت است	جوہر اور اکمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش	روئی ہنگامہ احرار باش
غور سے فی گیر و ملت احترام	ملت اذا فردی یا بد نظام
فرو تا اندر جماعت گم شود	قطرہ وسعت طلب قلوب شود

خلافت راشدہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے بنیادی تصورات بھی متزلزل ہونے لگے۔ عباسیوں کے عہد حکومت میں جب عجمیت کا عنصر اپنے شباب پر تھا اور مسلمانوں کی ذہنی زندگی اس سے پورے طور پر مرعوب ہو چکی تھی۔ اسلامی نظریوں کی گرفت و مہمی پڑ گئی۔ یونانی اور ہندی فلسفہ جب مسلمانوں کے ہاں منتقل ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں پر بہت گہرے پڑے۔ افلاطون کے فلسفہ نے مسلمانوں کی زندگی میں جمود پیدا کر دیا اور ان کے قوائے عملیہ شل ہو گئے جن کا نتیجہ رہبانیت اور تباہی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ ویدانت کے فلسفہ نے اسلامی فلسفہ کی صورت مسخ کر دی۔

اور مسلمانوں پر تصرف کا رنگ غالب آگیا۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد ہمہ اوست کے نظریہ پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ہمہ اوست منفی، صوفیوں کا رقص متاثر افلاطونی روح کا عکس ہے۔ جس نے زندگی کی عملی قوتوں کو معطل کر دیا ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ اسلامی شائے اور عقائد کو ان تاثرات سے آزاد کر دے اور مسلمان پھر مادہ عمل پر گامزن ہو کر زندگی کی نبرد آزما یوں میں شریک ہوں اور اس جہان رنگ و بو کی تزئین و آرائش کریں فلسفہ عمل کے متعلق مدد روز بخود دی، میں لکھتے ہیں ۛ

در عمل پوشیدہ مضمون حیات	لذتِ تخلیق قانون حیات
باجہانِ نامساعد ساختن	ہست در میداں سپر انداختن
گرنہ سازد با مزاج او جہان	می شود جنگ آزاخو با جہاں
بر کند بنیاد موجودات را	می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند او قوت خود آشکار	روزگار تو کہ باشد سازگار
در جہاں نتوان اگر مردانہ زلیبت	بجو مرداں جاں سپردن زندگی است
زندگانی قوت پیدا است	اجل او از فروق استیلا است
عصر بے جا سردی خون حیات	سکتہ در سیت موزون حیات
نا توانی زندگی را درین است	بطنش از خوف و روع آبتن است

اقبال کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے انحطاط کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عمل کی زندگی کی بجائے افلاطونی بے عملی اختیار کر لی ہے۔ وہ انھیں افلاطون کی متائم پندی کے خلاف خبردار کرتا ہے اور اس سے بہت بیزار ہے ۛ

راہب دیرینہ افلاطون حکیم	از گروہ گو سفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است	شمع را صد جلوه از افسردن است
گو سفندے در لباس آدم است	حکم و بر جان صوفی حکم است
بکد از ذوق عمل محسوس بود	جان او دارفتہ و محسوس بود

منکر ہنگامہ موجود گشت      فاق اعیان نامشود گشت  
 آہوش بے بہرہ از لطف خرام      لذت رفت از بکبکش حرام  
 شبنش از طاق رم بے نصیب      طائرش را سینہ از دم بے نصیب  
 ذوق رو سیدن ندارد دانہ اش      از تپیدن بے خبر پر دانہ اش  
 و ہما از سکر اسوم گشت      خفت و از ذوق حل محروم گشت "امرا بخودی"

اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں موجود تعلیم یافتہ طبقہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی پروردہ و ساختہ نسل سے ان کی بیزاری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان کے دماغوں سے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت کو زائل کر دیا۔ مادی فلسفہ و سائنس سے اکتساب نو کئے والوں کا ذوق و شوق سرد ہو گیا۔ ان کے دماغ تو روشن ہیں مگر دل تیرہ اور نگاہیں بیاک ہیں نفور و استغنا جو اقبال کے آئیدیل انسان کی لازمی صفات ہیں ان میں منقوہ ہیں کیونکہ موجودہ تن آسانیوں کے ساتھ ان چیزوں کا تطابق نہیں ہو سکتا۔ قومیت اور وطنیت کے خیالات ان کے دماغوں میں اس طرح رچی چکے ہیں کہ اب انسانیت کی کوئی قدر ان کی نگاہوں میں نہیں رہی۔ اقبال کے نزدیک عورت کا سب سے بڑا جوہر عصمت و عفت ہے جو یورپین معاشرت کے اثرات کی وجہ سے رنگ آلودہ ہو گیا ہے۔ اقبال اس کی نظر میں دست پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنی نسایت کو برقرار رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔

آلہی آغوش نازک بیکرے      خانہ پرورد و نگاہش محشرے  
 فکر او از تاب مغرب روشن است      ظاہرش زن، باطن او ازان است  
 بندہائے ملت بیضا گنخت      تاز چشیش عشوہ ہامل کردہ نخت  
 شوخ چشم و منتہ ز آراویش      از حیا نا آشنا آراویش  
 علم او باراموت بزرگست      بر سر شامش یکے اختر تنافت

این گل از زبان ما نارسد بہ      دافش از دامن ملت شستہ بہ "رموز بخودی"  
 وطنیت کے مغربی نظریہ پر بھی اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا ہے۔



یورپ میں سب سے پہلے اس ذلیل فلسفہ کو رواج دینے والا میکا دلی تھا جس نے مادیت کی بنیادوں پر یہ عمارت اٹھائی۔ وہ فلازنس کا رہنے والا تھا۔ اور اس نے "الملوک" ایک کتاب لکھی جو بعد میں شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی مگر قبائل کی برہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے حب وطن کو جزا نیائی عہد بندیوں میں مقید کر دیا۔ وطن یا وطنیت محض ایک ماضی چیز ہے۔ تاریخی حوادث اس کی حدود میں ہمیشہ تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی میکا دلی کے اس فلسفہ نے یورپ میں اس قدر رواج پکڑا کہ اس کی ایک مستقل حیثیت قائم ہو گئی۔ آج بھی وہ یورپ کے مفکرین اور سیاستدانوں کے دماغ پر مسلط ہے اور اسی کی بنا پر اقوام یورپ مناقشات کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہر ملک کے لئے اس کی متعینہ حدود کی انسانی آباہی سر بلندی اور سرفروزی کے قابل ہے اور افراد کا انتہائی نصب العین وطنیت پرستی ہے۔ بین الاقوامی روح کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اقبال نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے ۷

دہریت چوں جامہ مذہب درید	مرے از حضرت شیطان رسید
آں فلازنائی باطل پرست	مرمہ او دید و مردم شکست
تنگری مانند آذر پیشہ اش	بست نقش تازہ اندیشہ اش
ملکت را دین او معبود ساخت	فکر او مذہب را محمود ساخت
بوسہ تا بر سر پائے این معبود زد	نقد حق را بر عیار سود زد
طرح تدبیر زبوں فرجام رنجیت	این خنک در جادۂ ایام رنجیت
شب بے چشم اہل عالم چیدہ است	مصطوت تزدیر را امیدہ است (رموزِ خودی)

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ خودی" کے کچھ ہی عرصہ بعد "پیامِ مشرق" منظرِ عام پر نمایاں ہوئی۔ "اسرارِ خودی" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں حقیقت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اور "رموزِ خودی" میں تخیلی عنصر غالب ہے۔ "پیامِ مشرق" میں شاعر نے حقیقت اور تخیل کا بڑا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ اس پر فارسی کی شیرینی نے وہ اثر کیا ہے کہ "پیامِ مشرق" کو بجا طور پر دنیا کے بہترین ادبی شاہکاروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ شمریت قدم قدم پر ہوتی لٹائی ہے اور زبان کی سلاست اور نرم ریزی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلکش نغمے الفاظ کے

پیکروں میں ڈھل گئے ہیں تخیل کے آبدار موتیوں سے تمام کلام مرصع ہے اور زبان کے سحر نے ان کی شان کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ اس لالہ زار کی نچھت آنی جانی نہیں بلکہ دائم و قائم رہنے والی ہے۔ کیونکہ شاعر نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر اس میں رنگ و بو پیدا کیا ہے۔ یہ کتاب گوشتے کی مشہور کتاب ”سلام مغرب“ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اقبال نے شروع کے اشعار میں خود کہا ہے۔

پر مغرب استعار المانوی      آن قیل شیروہ ہائے پہلوی  
بست نقش شادمان شیخ و شنگ      داد مشرق را سلا سے از فرنگ  
در جوابش گفتہ ام پیغام مشرق      ماہ تاباں رنجیم بوشام مشرق

اس مجموعہ کی تمام تصویریں بڑی پیاری ہیں جن میں اقبال نے اپنے موطن سے بڑی شوق منگھلاریاں کی ہیں۔ اور ہر چند وہ ”آرٹ برائے آرٹ“ کے نظریہ کا قائل نہیں مگر اس کو کیا کیا جانے کے خدا نے اسے شاعر پیدا کیا ہے۔ اس کے افکار کی صورت نگری میں شعریت کا دامن کہیں بھی اس کے اتم سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور شاعر کا جالیاتی ذوق ہر تصویر میں جھلکتا ہے۔ پیغام مشرق میں یہ رنگ اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ اسے رنگ اور لطافت کا دلپذیر مجموعہ کہا جاسکتا ہے جس نے اپنے اظہار کے لئے الفاظ کی شکل اختیار کر لی۔ صوری اور معنوی حثیت سے اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کا صحیح ادراک کرنے کے لئے روح ادب سے واقف ہونا ضروری ہے کتاب کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”کلمتہ دان المانوی“ اور ”مبل شیرازہ“ کی دور درجوں نے اقبال کے قلوب میں جنم لیا ہے۔

کتاب ”پیش کش“ سے شروع ہوتی ہے جس کے بعد ربامیات ہیں جن میں اقبال نے زندگی، نعت، کوشی، خودداری، عقل و عشق اور خودی پر بعض نہایت بلند و بالا اشعار طبع کئے ہیں۔ اور زبان کی نزاکت کے ساتھ عقل اور حکمت کے ایسے ایسے رموز آشکارائے ہیں جن سے ان کی دست فکر تاریکی تخیل کا چہرہ چلنا ہے ان انمول موتیوں میں سے اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے چند گہرے ہبا کو پیش کرتا ہوں۔

و دامد نقشبائے تازه ریزد      بیک صورت قرار زندگی نیست  
اگر امروز تو تصویر بدوش است      بھاک تو شہرہ از زندگی نیست

سکندر با خضر خوش بکشتہ گفت      شرک سوز و ساز بحر و بر شو  
 تو این جنگ از کنارِ مرصہ بینی      بمیر اندر بسر دوزندہ تر شو  
 زمین خاک درے خسانہ ما      فلک یک گردش بیانہ ما  
 حدیث سوز و سازِ دراز است      جہاں و سبب چہ افسانہ ما  
 دوامِ باز سوزِ ناتمام است      جو اہمی جز تپشِ برِ احرام است  
 جو ساحل کہ در آغوشِ ساحل      تپید یک دم و مرگِ دوام است  
 میا را بزمِ بر ساحل کہ انتخاب      نوائے زندگانی نرم خیز است  
 بدریا غلط و با موجش درآویز      حیاتِ جاوداں اندرستیز است  
 اگر آگاہی از کیف و کم خویش      یہ تعمیر کن از شبہم خویش  
 دلا در یوز و مستاب تا کہے      شبِ خودِ برافروز از دم خویش  
 تراش از پیشتر خود بادِ خویش      براہِ دیگران رفتن مذاب است  
 گرازدست تو کارِ بادِ آید      گناہے ہم اگر باشد خواب است  
 سفالم رائے اوجِ جامِ جسمِ کرد      درونِ قطرِ ام پوشیدہ یم کرد  
 خسرو اندر سرمِ تاجانہ ریخت      خلیلِ عشقِ دیرم را خسرِ کم کرد  
 گدائے جلوه رفتی بر سرِ طور      کہ جان تو ز خود نامحسوس است  
 قدم در جستوئے آدمی زن      خدامِ در تلاشِ آدمی است

فطرت کی منظر کشی کے بعض حسین نمونے جو "بانگ درا" میں ملتے ہیں، وہ ہم اس سے پہلے بتی کر چکے ہیں۔ پیامِ شرق میں یہ نمونے اور زیادہ دلکش ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں موسیقیت اور نرم کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے۔ "نصل بہاؤ" "سرودِ انجم" "نوائے وقت" "نغمہ ساربان" اور "ساقی نامہ" اس طرز کے بہترین نمونے ہیں جن میں اقبال نے سبک و شیریں الفاظ کی نشست و ترکیب سے دلِ مود لینے والی راگنیاں پیدا کی ہیں اور انہوں کے نشاۃ الگیزا متناثر سے کیف اور نفا پیدا کر دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

خیز که در کوه و دشت خیمه زد ابر بهار  
 مست ترخم هسزار طوطی و دراج و سار  
 بر طرف جوئے بار کشت گل و لاله زار  
 چشم تماشا بسیار

خیز که در کوه و دشت خیمه زد ابر بهار  
 خیز که در باغ و راغ، قافله گل رسید  
 بادبسا راں وزید مرغ نوا آنسرید  
 لاله گریبان درید حسن گل تازه چید  
 عشق غم تو خسرید

خیز که در باغ و راغ قافله گل رسید  
 حجره نشینی گزار گوشت مشحور اگزین  
 بر لب جوئے نشین آب رواں را ببین  
 ز گس باز آنسریں لخت دل فردین  
 بوسه ز نشن بر جبین

رفصل بہار

حجره نشینی گزار گوشت مشحور اگزین  
 ہستی ما، نظام ما مستی ما، خسران ما  
 گردش بے مقام ما زندگی دوام ما  
 دور فلک بجام ما می نگیم دی رویم  
 تواجہ ز سروری گزشت بنده ز چاکری گزشت  
 ناز می و قیصری گزشت دور سکندری گزشت  
 شیدہ بت گری گزشت، می نگیم دی رویم

پردہ چراغ طور عبیت؛ اصل نظام و فوجیت؛

چشم دولتشور عبیت؛ فطرت نامور عبیت؛

این ہمہ نزد و دور عبیت؟ می نگریم وی رویم "سرود نهم"

خورشید بہ دامنم انجم بہ گریانم درین نگری پیچ، در خود نگری جانم

در شہر و بیابانم، در کاخ و شہنم من در دم و دمانم، من ہمیش فراوانم

من تیغ جاں سوزم من چشمہ جوانم

چنگیزی و تیموری شتے ز فبارین ہنگامہ افزگی یک جہتہ شرارین

انسان جہان یک نقش و نگارین خون جگر مردان سالان بہارین

من آتش سوزانم من روضہ رضوانم

آسودہ و سیارم این طرف و تاشاہیں در بادۂ امروزم کیفیت فرداہیں

پناہ بہ ضمیر من، صد عالم و غناہیں صد کرب و غلاں ہیں صد گنبد خضراہیں

من کسوت انسانم، پیراہن یزدانم

"نوائے وقت"

ناقد سیار من آہوئے تاتار من

درہم و دینار من اندک و بسیار من

دولت بیدار من

تیز ترک گام زن، منزل مادور نیست

دلکش و زیبایستی شاہد رعناستی

روکش خوراستی غیرت لیلاستی

دختر صحرایستی

تیز ترک گام زن، منزل مادور نیست

نغمہ من و گلشائے زیر و بوش جانفزائے  
 قافلہ ہارادرائے فتنہ ربا فتنہ زائے

اے بہ حرم چہ و سائے

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

”نغمہ ساربان“

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے نجوم پر نرست از مرغزارے  
 لب جو خود آرائی و منچہ دیدی؟ چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے  
 نواہائے مرغ بلند آشیانے در آئینخت با نغمہ جو بہارے  
 تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را نہاد است در دہان کو بہارے  
 چہ خواہم دریں گلستاں گر خواہم شہرا بے و کتا بے، ربا بے و نگارے  
 بہ ساغر فروزیز آ بے کہ جاں را فردوز چو نورے، بسوزد چو نالے

”ساقی نامہ“

باقی آئندہ

”اسلوب احمد صاحب انصاری متعلم مسلم یونیورسٹی“

# انقلاب روس کا تاریخی پس منظر

انقلاب روس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر ایک عظیم و ہمہ گیر اثر پڑا ہے۔ انقلاب صرف سیاسی اور معاشرتی نظام کو دہم برہم نہیں کرتا بلکہ اس سے ذہنی رجحانات بھی یکسر بدل جاتے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ انقلاب فرانس نے فرانس ہی کی شہنشاہیت کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کے اثرات اس قدر دور رس تھے کہ اس نے تمام یورپ کو آزادی مساوات اور اخوت کا سبق دیا۔ اگر آپ یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے انقلاب کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ یہاں صورت میں ہم انقلاب کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں کسی ملک میں انقلاب خود بخود نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے پس پشت ایک زبردست تاریخ ہوتی ہے۔ اس تاریخ کو بنانے والے ایک یا دو افراد نہیں ہوتے بلکہ ایک انقلابی جماعت ہوتی ہے جس کے افراد اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ وہ گناہی کی حالت میں قہر کی قربانیاں کرتے ہیں۔ انقلابی تحریک کا ابتدائی دور ہمیشہ ہنگامی ہوتا ہے جس میں بعض عجیب غریب باتیں رونما ہوتی ہیں مگر یہ خاص حالات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ اس طرح انقلابی تحریک سلاج کی گود میں پرورش پاتی رہتی ہے۔

روس کے انقلاب کو اکثر لوگ ایک معجزہ سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ دوسری تاریخ کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے روس دیگر مغربی اقوام کے مقابلہ میں بہت پیچھے تھا۔ روس کی سیاسی جدوجہد ایک عجیب کشمکش کی تاریخ ہے۔ ایک طرف تو ہم قرون وسطیٰ کے گرجا اور ایٹائی مطلق العنان بادشاہت کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف نراجی اور عدلیت پسند تحریکیں بردے کا رنظر آتی ہیں۔

روس کے دو بڑے تاریخی ادارے تزار اور بڑے زمیندار تھے۔ تزار کی اہمیت سیاسی تھی اور زمیندار

کی سماجی۔ زار کی شخصیت کی وجہ سے روس کے لوگوں میں اتحاد اور وہ آاریوں، ترکوں، پولینڈ اور سوئیڈن کے رہنے والوں کے مقابل میں لڑائیوں میں کامیاب رہے۔ اس کے علاوہ امراد اور جاگیرداروں کی سرکوبی ہوتی رہی اور انھیں سرانجامے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اسی طرح پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کو بھی آزاد کے خلاف کبھی دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح سے یہ لوگ زار کے سینہ حلیف رہے اسی طرح حالات نے روس میں ایک شخصی حکومت کو برقرار رکھا۔ اور زار کی شخصی قوت یورپ کی دیگر شخصی حکومتوں کے مقابل میں کمینڈا رہی۔ روس ایک زری ملک رہا ہے۔ وہاں صنعتی اور شہری زندگی تقریباً مفقود تھی۔ وہاں کی زیادہ تر آبادی مزدور کاشتکاروں کی جماعتوں میں مشغول تھی۔ وہ لوگ معیص معنوں میں کاشتکار بھی نہیں تھے بلکہ زمینداروں کے غلام تھے جو قلیل اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے تھے اس نظام کی وجہ سے زمینداروں اور زار میں یکجہت تھی۔ اس طرح حکومت کو انگن وصول کرنے اور فوج میں رگروڈوں کو بھرتی کرنے میں آسانی رہتی تھی۔

اسی وجہ سے تمام ملک پر جالت اور افلاس کی بلا مسلط رہی، حکومت کی مختلفوں سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہوتی رہتی تھی جو اکثر اوقات بغاوتوں کی شکل میں نمودار ہوتی۔ ان حالات نے اس سوئی ہوئی قوم میں اتنا پسند انقلابی جوش پیدا کر دے۔

کمیتراں اور الگنڈا راول کے زمانے میں انتہائی قسم کے برہن خیالات اعلیٰ طبقہ کے لوگ صرف نیشن کی خاطر رکھتے تھے چنانچہ نکوس کے مد کے شروع میں پٹرس برگ کے سترہ یوں نے جن میں بہت سے لوگ خاندان کے افسران بھی شامل تھے بغاوت کرنا چاہی مگر انھیں سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ الگنڈا راول دوم کے مد میں مختلف حالات نے روس کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

جنگ کریمیا کی فکنتوں کی وجہ سے اس وقت کی طرز حکومت کو غیر مفید خیال کیا جانے لگا۔ عام طور سے مغربی طرز حکومت کو ترجیح دی گئی۔ فوجان زار نے اس ضرورت کو محسوس کیا چنانچہ اس نے غلام کاشتکاروں کی نجات کے لئے قانون بنائے نئی عدالتیں قائم کیں اور تعلیم عام کرنا چاہی مگر ان اصلاحات کی روس کے حجت پسند طبقہ نے مخالفت کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح حجت پسندوں اور اتما پسندوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات نے ان دونوں جماعتوں میں بڑی کشمکش پیدا کر دی۔ کیونکہ اتما پسند جماعت سے زمر



سیاسی اداروں کو خطرہ تھا بلکہ وہ سماج کے پرانے اور بوسیدہ اداروں یعنی ملکیت، مذہب اور خاندان کے بھی ورپے تھے۔

ان حالات میں روس کی انقلابی تحریک کی بنیاد پڑی۔ آسانی کے لئے ہم اس تحریک کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا دور ۱۸۵۵ء (جو ایگزیزٹو دیم کے عہد سے شروع ہوتا ہے) سے ۱۸۸۱ء تک ہے۔ اس دور کی خصوصیت منفی اور تخریبی ہے جو مذہبیت (Nihilism) کی صورت میں نمودار ہوئی مختصر الفاظ میں اس تحریک کا مقصد سوسائٹی کے تمام فرسودہ اداروں کو مٹانا ہے تاکہ پھر نئے سرے سے سماج کی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ نظریہ محض سیاسی نہیں تھا بلکہ نیگیل فلسفہ کے بانی بازو کی روح تھی۔ اور اس کی بنیاد Moloch Buchner کے فلسفہ مادیت پر تھی۔ اس ملک میں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ پر مذہب کا اثر کم ہوا اور عوام کے دماغ فلسفہ کی ذہنی عیاشیوں سے پاک ہوں وہاں فلسفہ مادیت کو قبول کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں یہی وجہ ہے کہ روس کے اس زمانے کے بڑے بڑے مفکر فلسفہ مادیت کے ملبر داتھے۔

ٹورگنیف نے اس تحریک کا نقشہ اپنے مشہور ناول "باپ اور بیٹے" میں اس طرح کھینچا ہے کہ نہایت دلگتھے جو — کسی قسم کی طاقت یا حاکم کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے اور کسی اصول کو خواہ وہ کتنا ہی قابل تنظیم و عقیدہ کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ وہ لوگ سیاسی اور سماجی اداروں، مذہب اور خاندان پر منفی نقطہ نظر سے تنقید کرتے تھے۔ وہ ان نام باتوں کو جو پرانی ہیں (خواہ وہ اچھی ہوں یا بری) ٹھکراتے تھے۔ ان کے لئے آرٹ، شاعری یا رومان کی کوئی وقعت نہیں تھی ان کے خیال میں ایک نیا تجربہ جو مینڈک چیر کر کیا جائے اور ہمارے انسانی علم میں اضافہ کرے زیادہ اہم تھا۔ بہ نسبت گوئٹے کی شاعری یا بونیل کی مصوری کے۔

ٹورگنیف کے ناول کا ہیرو نیزوف نہایت تحریک کا ملبر دار ہے۔ لیکن یہ کہ بعض لوگوں کو اس کے کردار میں جاذیبیت نہ محسوس ہو کیونکہ وہ بہت خشک مزاج ہے اور اپنے خاندان کے بے تعلقی نظر آتا ہے۔ مگر ہم اس کی جرات، ایماندارمی، صاف گوئی اور انانیت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کی قبل از وقت موت کی وجہ سے ہم اس کے متعلق اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ آئندہ کیا ہوتا لیکن اگر قصہ جاری رہتا تو ہم دیکھتے

کہ تعمیری خیالات اس کے تخریبی خیالات کی جگہ لے لیتے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کوئی تخریبی تحریک مستقل نہیں ہوتی بلکہ وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ نیلٹن تحریک کے علمبرداروں نے ڈاؤن ہاربرٹ اسپیر اور رن کی تحریروں میں ایک وسیع دنیا پائی اور بعد میں سین سائمن، فوریئر، رابرٹ اوون اور مارکس کے نظریوں کے متاثر ہوئے، انھوں نے لوگوں کی توجہ آرٹ اور شاعری کی جذباتی دنیا سے ہٹا کر روٹی، ابتدائی تعلیم اور عورتوں کے حقوق کی مبذول کرائی۔ یہ صرف اس لئے کہ انھیں مظلوم طبقہ سے ہمدردی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے فلسفہ حیات کی روس کے افکار کی تاریخ میں ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سے باوجود اس کے انتہائی تخریبی ہونے کے منفید نتائج مرتب ہوئے، اُس ملک میں جو توہمات اور تعصبات کے وجہ سے پسا پسا رہا، اس قسم کی تخریبی تحریک کی اشد ضرورت تھی۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، روس میں انقلابی تحریک نے ایک تعمیری اور انسانی شکل اختیار کرنا شروع کی۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا غالب

اس کے بعد انقلابی تحریک کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جبکہ اس تحریک پر اشتراکی خیالات کا عنصر غالب تھا۔ اشتراکیت کی تعلیم و پرچار اس دور کی خصوصیت ہے۔ انٹرنیشنل کا بڑھتا ہوا اثر اشتالیوں کی پیرس کی جدوجہد اور جرمنی کی شوشل ڈیموکریسی یورپ کے ان تمام تاریخی واقعات نے روس کی آزادی کے علمبرداروں و نوجوانوں میں ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ ان کے سامنے اب ایک نصب العین تھا اور وہ روس کی پرولتاریہ کی نجات و سہنگی تھا۔ ابتدا میں اس نئی تحریک پر باکونین کی اشتراکی مزاحمت (Anarchic Socialism) کا کافی اثر تھا۔ باکونین کی تعلیم کے مطابق اس جماعت کے افراد نے "عوام سے ملاپ" اور ان نئے خیالات کی عوام میں اشاعت شروع کی۔ حکومت کی سخت گیر پالیسی نے اس تحریک کو اور ابھارا۔ انیسویں صدی کے آخر میں روس کے کئی ملحد یورپ خاص کر سوئٹزرلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ وہاں انھیں روسی جلاوطن سے ملنے ملتے اور تبادلہ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ ان کی محبت میں رہ کر یہ ملحد بھی انقلابی خیالات کے حامی بن جاتے تھے۔ جب یہ اپنے وطن واپس لوٹتے تو اپنے ساتھ نئے نئے خیالات لاتے۔ ان کی کوئی باقاعدہ جماعت تھی اور نہ کوئی لائحہ عمل صرف ایک اصولی

تھا اور وہ یہ کہ عوام میں جا کر نئے خیالات کا پرچار کیا جائے ان میں سے اکثر اس مقصد کے لئے استاد نہیں اور ڈاکٹر بن گئے اور مراضعات میں بود و باش اختیار کر لی کئی لوگوں نے محض اس وجہ سے کہ وہ عوام سے متاثر نہ رہیں نہایت ہی ادنیٰ قسم کے پیشے اختیار کئے بخاری اور جوتے سینے کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر انھیں پیشوں کو ترجیح دیکھتی تھی بعض لوگ کارخانوں میں پندرہ پندرہ گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے تاکہ انھیں مزدوروں میں اپنے خیالات کے پھیلائے کا موقع مل سکے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کا تعلق بڑے خاندانوں سے تھا اور جو بڑے ناز و نعم میں پرورش کئے گئے تھے کسانوں میں رو کر گنہامی میں اپنی زندگیاں گزار دیتے تھے وہ اپنے ہاتھوں اور چہروں کو کھردرا بنا لیتے اور معمولی کسانوں کا لباس پہنتے تھے۔ صرف اس لئے کہ ان میں اور کسانوں میں جو فرق ہے وہ مٹ جائے۔

شروع شروع میں ان بے لوث کام کرنے والوں کی کوششیں زیادہ بار آور نہ ہو سکیں کسانوں میں توہمات اور تعصبات زیادہ تر پائے جاتے ہیں اس لئے ابتدا میں یہ لوگ ان نئے خیالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ اس کے علاوہ ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ اس انقلابی جامعیت کے بہت سے افراد ان نئے خیالات کو مدلل اور عام فہم طریقہ پر لوگوں کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔ یہ لوگ دوسرے مغربی ممالک کی مثالیں دیتے تھے جنہیں روس کے مخصوص حالات اور احوال سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

یہ تحریک حکومت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکی ان خیالات کے پھیلانے والے افراد نہایت جوشیلے تھے وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت میں مطلق احتیاط نہیں کرتے تھے اور کھلے بندوں کام کرتے تھے حکومت کو اس تحریک کے علمبرداروں کو دھونڈنے میں زیادہ وقت پیش نہ آئی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء کے آخر تک تقریباً تمام انقلابی جیل میں بھر دیے گئے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان دو ہزار سے زیادہ لوگ گرفتار کر لئے گئے بہت سے جیلوں میں مدت تک نظر بند رہے۔ مقصد سے چلانے کے بعد عدالتوں نے زیادہ لوگوں کو بری کر دیا مگر حکومت نے حکمت عملی سے سب کو جلا وطن کر دیا۔

ان تلخ تجربات کے بعد انقلابیوں کو اپنا طرز عمل بدلنا پڑا۔ انھوں نے پُر امن پروپیگنڈے کے بجائے مل کی طرف اپنی توجہ مبذول کی انھوں نے عوام کے ساتھ بود و باش اختیار کی اور انھیں حکومت کے

خلاف کر دے ہونے کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ چونکہ حکومت نے پراسن پر چار کو بھی ممنوع قرار دیا تھا اس لئے انہوں نے تشدد آمیز طریقے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

پچھلے تحریکات نے انقلابیوں کو مفید سبق سکھایا۔ ان پر ان کی کمزوریاں ظاہر ہو گئیں اور وہ یہ اچھی طرح سمجھنے لگے کہ صرف انفرادی کوششوں سے انقلاب پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت کی سختیوں کی وجہ سے تحریک ختم ہوئی جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کی سخت ضرورت محسوس کی کہ ایک منظم جماعت قائم کی جائے۔ یہیں سے انقلابی تحریک کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب انہیں باکونین کے اصولوں کو چھوڑنا پڑا کیونکہ پڑلنے طریقے انقلاب پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہو چکے تھے۔ انہیں اب پورا یقین تھا کہ سوائے مطلق العنان حکومت اور اس کے حامیوں کے خلاف صف آرا ہو جانے اور اپنے مخالفین سے کسی صورت میں بھی صلح نہ کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں ہے چنانچہ انہوں نے زاریت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

اس مقصد کے لئے تمام کارروائیاں پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے کی جاتی تھیں۔ چونکہ یہ جماعت غیر قانونی تھی اس لئے کام خفیہ اور پوشیدہ طریقے سے کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ کا مشہور واقعہ جنرل ٹری پوٹ (Trepot) کا قتل ہے جو پیرس برگ میں ۱۸۷۱ء میں ہوا۔ اس کی قاتل ایک عورت تھی جس کا نام ویرا (Vera) تھا۔ عدالت میں اپنی معافی پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ”میرا مقصد ان مظلوموں کا بدلہ لینا ہے۔ جو مطلق العنانی کے ہاتھوں پس رہے ہیں، ویرا نے جنرل کو صرف اس لئے قتل کیا تھا کہ جنرل نے ایک سیاسی قیدی کے بازار میں کوٹے لگوائے تھے تعجب کی بات یہ ہے کہ ویرا اس قیدی سے بالکل ناواقف تھی جو ریٹے دیرا کو رہا کر دیا۔ لیکن پولیس نے اس کو بھڑکنا کر ناجائز کارروائیوں کو روک دیا۔ سوئٹزرلینڈ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر عوام نے ویرا سے ہمدردی۔ کے کئی ثبوت دئے چنانچہ اس کے تمغے ہی دن بعد پولیس کے متعدد افسران اور بعض صوبوں کے گورنروں و حاکمے قتل کر دئے گئے۔ آخر کار انقلابیوں نے مطلق العنان حکومت کے سرخبرہ یعنی زار کو قتل کرنے کی سازش کی۔ زار کو ختم کرنے کے لئے اس پر کئی مرتبہ گولی چلائی گئی۔ شاہی ٹرین پر ہم پھینکے گئے اور دوطولیں کوڑا لے کر کوشش کی گئی۔ سو، اتفاق سے ہر جگہ ناکامی ہوئی آخر کار ۱۳ مئی ۱۸۸۱ء کو ایگزیکٹو قتل کر دیا گیا۔

اس انقلابی تحریک کے علمبردار روس کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ان میں بعض امرا کے خاندانوں کے اور بعض پادریوں اور افسردہ کی اولاد تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے نوجوان کسان اور مزدور اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ اس تحریک کو فروغ دینے میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھیں چنانچہ سوویتا نامی لڑکی نے جس کا تعلق ایک مغز خاندان سے تھا اپنی نقاب الٹ کر ان آدمیوں کی رہنمائی کی جنہوں نے ہم پھینک کر الیگزینڈر دوم کا خاتمہ کیا تھا۔ اس جماعت کے تقریباً تمام افراد نوجوان تھے۔ ان کی عمریں پچیس برس کی بھی نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں دلولہ تھا اور خود اعتمادی تھی۔ وہ ذہنی گتھیوں کے سلجھانے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے اور نہ بوڑھوں کی طرح خواہ مخواہ خطرات کے پہاڑ کھڑے کرتے تھے جو انہیں کام کرنے سے باز رکھ سکیں۔ انقلابیوں میں انتہا پسندی خود بخود پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ حالات کی وجہ سے مجبور تھے کہ اپنا طرز عمل اس قسم کا رکھیں سخت گیر حکومت کے ظلم و تشدد بے انتہا تھے۔ یونیورسٹی میں اگر طلباء کچھ گڑبگڑ پیدا کرنا چاہتے تو انہیں دبانے کے لئے انسانیت سوز طریقے استعمال کئے جاتے تھے بعض شبہ پرہیزاروں نوجوان بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں مٹرتے رہتے تھے۔ روس میں ہر قسم کا پروپیگنڈہ خلاف قانون تھا۔ انقلابیوں کو جیلے منعقد کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ اخبارات پر سخت پابندیاں عام تھیں۔ وہ ہر وقت جا سوسوں سے گھرے رہتے تھے اگر اُس وقت روس کی حکومت دیگر حکومتوں کی طرح آئینی ہوتی تو عوام کے حقوق کا خیال رکھتی اور ان کے مطالبات کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتی اور انقلابی جماعت میں اتنی انتہا پسندی پیدا نہ ہوتی۔

اس کا ثبوت ہیں اس بات سے ملتا ہے کہ اس پارٹی کی مجلس عاملہ نے جو سپاس نامہ الیگزینڈر دوم کو ۱۸۸۱ء میں پیش کیا اس میں انہوں نے وعدہ کیا کہ ہر قسم کی دہشت انگیزی کو ختم کر دیں گے اگر ان کے منہ اس مطالبے کو مان لیا جائے کہ قومی اسمبلی منعقد کی جائے جس کے تمام ممبران عوام آزادانہ طور پر منتخب کریں اسی طرح انقلابی کچھ عرصہ تک حکومت کی سخت گیر پالیسی کے شکار رہے۔ اسی آئنامیں روس میں صنعت پھیلتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ایکساکثیر تعداد میں مزدور طبقہ پیدا ہوا اور جلد ہی روسی سماج کا ایک اہم جز بن گیا اب اشتراکیوں کو اپنے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔ پیرس برگ کا مشہور اسٹراٹگ جو ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا

انقلابی تحریک میں ایک عظیم تبدیلی کا باعث ہوا۔ اس کے کچھ روز بعد ہی ایک سماجی اشتراکی پارٹی کی بنیاد پڑی جو راکس کے اصولوں کی حامی تھی چنانچہ ۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ روسی اشتراکی بحیثیت نمائندوں کے انٹرنیشنل کانگریس میں شریک ہوئے جو لندن میں منعقد ہوئی تھی۔

اشتراکیوں کی بعد میں دو جاعتیں بن گئیں کچھ پرانے پیانڈہ انتہا پسند اشتراکیوں نے اپنی ایک جماعت اشتراکی انقلابی پارٹی کے نام سے ۱۹۰۶ء میں قائم کی یہ پارٹی اس کی حامل تھی کہ کانوں میں زور شور سے پروپیگنڈہ کیا جائے اور ساتھ ہی زاریت کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا جائے۔ دوسری پارٹی اشتراکی جمہوریوں کی تھی یہ لوگ روس میں اس وقت تک انقلاب کرنا نہیں چاہتے تھے جب تک کہ وہاں کے انقلابی حالات اجازت نہ دیں اور مزدور طبقہ اچھی طرح پیدا نہ ہو جائے لیکن پہلی پارٹی کا اثر عوام پر زیادہ تھا۔

۱۹۰۶ء میں طلباء نے بڑا ہنگامہ کیا انھوں نے حکومت کے احکام کی مخالفت کی جن کی روس سے طلباء زبردستی فوج میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ اس میں پیٹرس برگ اور ماسکو کے مزدوروں نے طلباء کا ساتھ دیا۔ چنانچہ حکومت کو مجبوراً ہول ناخواستہ ان احکام کو واپس لینا پڑا۔

لیکن زار کسی قسم کی آئینی ترقی بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کاؤنٹ ڈی جس نے کچھ اصلاحات کرنے کی کوشش کی علیحدہ کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ فان پلہو (Van Plehoe) مقرر کیا گیا جو بعد میں کسی انقلابی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

جنوری ۱۹۰۷ء میں ایک پارلیمینٹ نے تقریباً ایک لاکھ مزدوروں کے ساتھ جو بالکل نئے تھے جلوس کی صورت میں دنٹرپلیس کے سامنے مظاہرہ کیا اور ان کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ اس پر اس مجمع پر گولی چلائی گئی جس میں ہزاروں عورتیں بچے اور ضعیف شامل تھے۔ چنانچہ تقریباً دس ہزار آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے گئیں وہاں سے کسی طرح بچ نکلا مگر بعد میں اسے کبھی غیر معروف شخص نے ہلاک کر دیا۔ یہ نامبارک دن اتوار کا تھا جسے لوگ "خونی اتوار" کہتے ہیں۔

اس کے بعد ہی وارسا اور تمام پولینڈ میں اسٹراک ہوا۔ اڈلبیہ میں فوجیوں نے بغاوت کر دی بجوہ اسود کے بیڑے میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ مجبوراً زار نے اگست ۱۹۰۷ء میں آئینی دستور دیا جس میں

مزدوروں اور غریبوں کو رائے دینے کے حق سے محروم رکھا گیا۔ اس سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوا۔ چنانچہ ماسکوی مشہور "عام اسٹراٹک" ہوا جو تمام روس میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ تمام ٹرینوں کی آمد و رفت بند ہو گئی یاں تک کہ اس اسٹراٹک میں عدالتوں کے بہت سے ججوں نے بھی حصہ لیا۔ زار نے کانٹ وئی کو واپس بلا لیا۔ اور ۲۰ اکتوبر کو اعلان کیا کہ ڈومائی روسی پارلیمنٹ منعقد کی جائے گی اس کے دور و ز بعد تمام سیاسی اسیروں کی معافی کا اعلان کیا گیا۔ لیکن اب اس کی مراعات عوام کو مطمئن نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے اپنی ضرورتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ پرانے نظام کو اسٹے بغیر انھیں بچا اطمینان میسر نہیں آ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اسکو میں جنوری ۱۹۰۵ء میں جلسے ہوئے اور ہزاروں جگہ کسانوں نے ہٹاوتیں کیں۔

مئی ۱۹۰۵ء میں پہلی ڈوماس منعقد ہوئی۔ اشتراکی پارٹیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ ۱۹۰۵ء میں دوسری رتبہ ڈوما کے انتخابات میں دونوں اشتراکی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ اس میں ۵۲۴ ممبران میں سے ۱۳۲ اشتراکی تھے یہ تعداد ایس کن نہیں تھی کیونکہ اس وقت اشتراکی خیالات رکھنے والوں پر بڑی سختیاں کی جاتی تھیں۔ دوسری ڈوما جوں میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ہی سولہ اشتراکی ممبر گرفتار کر لئے گئے اور ۱۵۵ اشتراکی ممبران نظر بند کر دئے گئے۔ اس کے بعد ہی بغیر ممبران کی رائے کے ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے ملے ہندگی کا حق زیادہ تر زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود رکھا گیا۔ جب اس کی مخالفت کی گئی تو پھر سختیاں شروع ہو گئیں بہت سے اخباروں کے اڈیٹروں کو سائبیریا بلا وطن کر دیا گیا۔ ڈوما کے بعض اشتراکی ممبروں کو قید باشتقت کی سزا دی گئی اور کئی کے سیاسی حقوق سلب کر لئے گئے۔ صرف ۱۹۰۵ء میں ستر ہزار افراد بلا وطن کئے گئے اور سات سو بیسی آدمی پھانسی پر چڑھائے گئے۔

ان تجربات نے روس کے انقلابیوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔ ان میں آپس میں اختلافات رہے لیکن ان کی نوعیت مختلف تھی۔ زاریت کے مظالم اور سختیوں کا یہی نتیجہ نکلا کہ ان کے ارادے مضبوط ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے اپنی قربانیوں اور ان تھک کوششوں سے مزدوروں۔ کسانوں اور سپاہیوں میں ایک احساس پیدا کر دیا تھا۔ عوام پرانے نظام کی خامیوں کو سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کے خطرے کو محسوس کر رہے تھے۔ مزدور۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر قابض ہو جائیں۔ انقلابی جماعت کے رہنماؤں کی دانشمندی

کی وجہ سے تحریک ہمیشہ صحیح راستہ پر رہی۔ انہیں حالات کا صحیح اندازہ تھا چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں جب زار کی فوجوں کو پے درپے شکستیں ہوئیں تو وہ حکومت کے رویہ سے بد دل ہو گئے۔ ادھر ملک میں ابتری بڑھتی گئی تاہم کساؤں میں عام بے چینی پھیل گئی غرض کہ مواد اندر ہی اندر تانک پکھتا کہ زخم کا پھٹنا ضروری ہو گیا تا انقلابی پارٹی اور اس کے رہنماؤں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر اس وقت وہ اپنی کمزوری دکھاتے اور صرف اصلاحی اور ملٹی ریمائیو پر ہی اکتفا کرتے تو یورپ کے اور ملکوں کی طرح آج انہیں بھی فاشنزم اور سامراج کی چکی کے دوپاٹوں کے درمیان پناہ پڑتا مگر انہوں نے پرانے نظام کی بوسیدہ عمارت کو انقلاب ۱۹۱۷ء کے ذریعہ بالکل منہدم کیا۔ اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اشتراکیت کی عمارت کی بنیاد ڈالی۔

یہ انقلاب صرف معدوم و سے چند افراد کی مہم پسند طبیعتوں کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی خاموش اور مسلسل قربانیوں کا رہین منت ہے۔ مختلف زمانوں میں حالات کے مطابق مختلف انقلابی تحریکیں انہیں اور انہوں نے اپنے وقت کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ انقلابیوں نے ان تحریکوں کا پہلے سے کوئی خاکہ تیار نہیں کر رکھا تھا۔ وہ صرف زمانہ کی پیداوار تھیں۔ انقلابیوں کا کام یہ تھا کہ انہوں نے حالات سے متاثر ہو کر ان تحریکوں کو قبول کیا اور انہیں آگے بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے آخری مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مرزا اشفاق بیگ صاحب متعلم ایل ایل بی فائنل



# امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر

اگدشتہ سے پیوستہ

امانت کا خاص رنگ | مذکورہ اصدد خصوصیات کفنوں کے دیگر باکمال شعرا کے بیاں بھی کم و بیش موجود ہیں لیکن امانت کے کلام میں بعض ایسے عناصر بھی شامل ہیں جو انہیں سے مخصوص ہیں مثلاً رعایت لفظی یہ کفنوں میں اس کا شوق پہلے سے موجود تھا البتہ اسے فنی حیثیت امانت نے بخوبی اور اس طرح یہ ان ہی کے کلام کا خاصہ بن گیا۔

یاد و روز و زمان میں مری جان گئی رند  
تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا  
دل کی شب پلنگ کے اوپر  
شل پھیتے کے، وہ بچتے ہیں  
جو مٹی میںی نظر دل سے وہ دیکھے  
کوں آنکھوں کو میں بادام شیریں  
مرغ جاں کو توڑے گی بلی ترے دروازہ کی  
رخت تن کو کالے کا جو ہا تمہاری ناک کا  
امانت کے دیوان خزان الفصاحت کے سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو۔

”دیوان امانت، خزان الفصاحت، تاریخی نام ہے، بڑے استاد کا کلام ہے یعنی شاعر شیریں مقال، ساحر بحر محال، ذاکر امام مقبول، نام بخور بے بدل استاد ضرب المثل، موجب رعایت لفظی، جناب سید آغا حسن صاحب کفنوی.....“

اس سلسلہ میں امانت کے کلام میں رعایت لفظی کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ جہاں رنگ صاف ہے وہاں زبان و بیان سے لطف پیدا کر دیا ہے لیکن جہاں اعتدال کو گذر گئے ہیں وہیں عیب پیدا ہو گیا ہے

ہنگام رقص زلف سے نکلی تریپ کے من  
توڑا تمہاری کان کی بھلی نے بال کیسا  
کر خط سے ہوسہ لب شیریں دلا نہ ترک  
قد و نبات میں نہیں ہوتا ہے بال کیسا  
قبر کے اوپر لگا یا نیم کا اس نے درخت  
بدمر نے کے مری تو قیر آدمی رو گئی

اُگیا اس شعلہ رو کے دھانی جوڑے کا خیال      خانہ دل میں کنول اک سبز روشن ہو گیا  
تو ہے وہ صیدنگن دشت میں رکھے جوتہم      آنکلیں آآ کے لکیں بھیرے گرگابی پر  
بند و پیر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں      الا کے پھول رکھنا امانت کی گور پر  
گرہین و مدھدھد کسی روز آئے تو      سو جائیں بھی تو آنکھ ہاری کلی رہے  
اثر ہے گنغہ میں بھی سیاہ بجتی کا      باری بازی میں کب آفتاب نکلا ہے  
اس قسم کی مثالیں امانت کے کلام میں بہت ہیں اور ان کی کثرت نے ہی امانت کو بدنام کر رکھا ہے۔ ورنہ ان کے کلام میں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہیں۔

سب سے اہم پہلو زبان کا ہے مضمون کے اعتبار سے لکھنؤ کے سرآمد شعرا کا بیشتر کلام ادنیٰ درجے کا ہے لیکن ان کے کمال کا اصلی جوہر ان کی زبان ہے۔ غالب نے ایک موقع پر یہ مصرع پڑھا کر چلا۔

نما ہے وہ مدہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

کما تھا کہ مضمون دلی کا اور زبان لکھنؤ کی خوب ہے۔ زبان کی خدمت شعرائے لکھنؤ میں ناخ نے سب سے زیادہ کی اور فی الحقیقت زبان کے امام ناخ قرار پائے۔ الفاظ کی صحت و عدم صحت کے اصول مقرر کر کے بہت سے قدیم و تخیل الفاظ و محاورات کو ترک کر دیا اور ان کی جگہ نئی ایجادات سے زبان کو فروغ بخشا۔ زبان کی خوبی کے اس عام اصول پر لکھنؤ کے تمام شعرا کا رنبد تھے اور معمولی شاعروں کے کلام بھی زبان کی لطافت و خوبی کا بہترین مرتع ہوتا تھا۔ آتش کے یہاں یہ رنگ بہت نمایاں ہے اور ان کے سامرین میں اس وصف خاص میں شاید کوئی ان سے بازی لے جاسکے۔

آات نے بھی زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ محاورہ ہندی کی طرف توجہ کی ہے اور اس فن میں انہیں لکھنؤ میں اگر وہی درجہ دیا جائے جو بعد میں دلی میں دایع کو ملا تو بے جا نہ ہوگا۔ ذیل کی مختصر فہرست سے بھی ان کی اس کوشش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شعر

محاورہ

پتا کھڑکنا۔ آفت کی ہوا لکھ چلی باغ جاں میں      پتا بھی نہ کھڑکا مرے گلشن کے شجر کا

نہ اُدھر کا نہ اُدھر کا رکھنا۔

رکھا مجھے کافر نے اُدھر کا نہ اُدھر کا  
تقصا سے مراعی ادا ہو گیا  
چہرہ کا ڈھو گیا ہے چین میں گلاب کا  
سوا نکلیاں اٹھیں وہ بدر سے نکل گیا

کعبہ کی زبنت خانہ کی دی اس نے اجاڑ  
حق ادا ہونا۔ تپ ہجر سے دم فنا ہو گیا  
آب آب ہونا آمد سے یار کی یہ ہوئے ہیں گل آب آب  
انگلیاں اٹھنا کیا مرتبہ ہوا ہے امانت کو دستیاب  
درد کی ٹھوکریں کھانا۔

بتلا دے اپنا گھر مجھے اے خانہاں خواب

درد کی ٹھوکریں نہ کھلا بہر اہل بیت  
سر پر احسان لینا۔

میں تو لوں گا کبھی قاتل کا نہ احساں سر پر  
فدایوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

آفتیں آئیں دلا اس سے فداں سر پر  
سر پر اٹھانا۔ فصل گل آئی چین میں کہ قیامت آئی  
سزا کھوں پر بٹھانا۔

گہرا کھوں پر بٹھائیں تو مسلاں سر پر

میں وہ ہوں زندہ اگر دیر و حرم میں جاؤں  
سر پر خاک اڑانا۔

خاک اڑائیں گے مرے غم میں بیاباں سر پر

کوہ ٹکرائیں گے آپس میں مروں گا جس دن  
سر پر شیطان چڑھنا، بہوت بن جانا۔

بہوت بن جاتے ہیں جب چڑھتا ڈیٹھیاں سر پر

آدمی کیا وہ فرشتے کی نہیں سنتے ہیں  
گمانس کا ٹھنا۔

گمانس کا ٹی عارض رنگیں کا سنہرہ دیکھ کر  
کیا اس پر لگی ہے چین میں بہار پر

قصہ کہتے ہیں نقطہ جب آگیا مجھ کو وہ گل  
اوس پٹا۔ شبنم کے ہیں گہر نظر آتے نہ گوش پر  
کان رکنا، ناک میں دم ہونا۔

کان رکھتے نہیں عشاق کی فریادوں پر

ناک میں دم بگھل انداموں کی بیدردی ہے

گلی کے چراغ جلنا۔

بدنفا بھی نعمت دنیا کی چاٹ ہے گلی کے چراغ جلتے ہیں زاہد کی گور پر  
گریبان میں منہ ڈالنا۔

دیکھ کر تیغ بگت میں نے یہ دلبر سے کہا (ق)  
بولا وہ غصہ سے منہ ڈال گریبان میں ذرا  
ہاتھوں کے طوطے اڑنا۔

دھانی انگلیا کی دو پھڑکا کے چین میں چڑیا  
دنگ ہونا۔ تصویر کیا ٹھیر سکے اس رخ کے سامنے  
ٹٹکی اوٹ میں ٹسکار کیلنا

کیلا کرتے ہیں سداٹھی کی اوٹ ایدل ٹسکا  
زمین سر پر اٹھانا

بلاتا ہوں ملک کو بعد مردن دل کے نالوں سے  
بنا نا۔ کسا ہے کوئی کالی بلا کوئی شب تار

آنت کے یہاں اس تم کے اشعار رعایت لفظی کے مضامین سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے جہاں  
ان کے میوہ پر روشنی ڈالی جائے وہاں بطور تلافی یہ نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اس سے قطع نظر پورے دیوان میں بہت سی غزلیں ایسی بھی نکل آئیں گی جن میں رعایت لفظی  
صرف پاشنی کی حد تک ہے۔ اصل خوبی زبان کی سادگی اور بندش کی چستی پر مبنی ہے۔ مثلاً حمد میں  
دیوان کی پہلی غزل۔

کیا کیا ہے کرم مجھ پر خداے دو جہاں کا  
تازہ ہے چین خداے دو جہاں کا  
جو آگیا اس راہ میں سالک دہی ٹھیرا  
شکر اس کا ادا کر سکے کیا منہ ہے زبان کا  
کچھ دخل نہیں گلشن قدرت میں غزاں کا  
گمراہ ہوا جو نہ یہاں کا نہ وہاں کا

دیکھے تو کوئی غور سے قدرت کے کرشمے  
شادی کہیں بچے کی کہیں غم ہے جوان کا  
غم اپنا وہیں ہو گیا شادی سے مبدل  
جب نام لیا رنج میں اس راحت جاں کا  
پوشیدہ بھلا کر سکے اس سے کوئی کیا بات  
دائندہ و واقف ہے وہ ہر از نسائ کا  
دم مارنے کی جا نہیں اسے صاحب ادراک  
خاکہ وہاں دخل نہیں دہم و گساں کا  
علامہ بریں ایسے اشعار بھی ناپید نہیں جو مضمون اور بیان دونوں کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔

ہو گئی قطع اسیری میں اسید پرواز  
اڑ گئے ہوش جو پر کاٹنے میا دایا  
جب تنک پر نہیں کئے تھے یہ امید تھی کہ شاید کبھی رہائی ہو اور پرواز نصیب ہو لیکن اب تو رہائی نصیب  
ہونے پر بھی پرواز کی امید باقی نہ رہی۔

وہ بت مجھ سے ناحق خواہ گیا  
خداوند عالم یہ کیا ہو گیا۔

ہمارے زمانہ کے ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ۛ

بعد مدت کے ملے تو مجھ سے پر وہ کس لئے  
کچھ نہ تم ہو گئے یا میں نہ والا ہو گیا  
اس سے بھی بلند مضمون آہانت نے پیدا کیا ہے۔ بجائے بعد مدت کے ”ترک ملاقات کے بدلے کا خیال ہے  
ل جادوگر تو پیر وہی باہم ہوں صحبتیں  
کچھ تم بدل گئے ہو نہ میں کچھ بدل گیا  
تیسرے صاحب امام الشعراء ہیں ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے ۛ

وہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی  
شکستہ پائی نے اپنی ہیں سنبھال لیا  
اسی مضمون کو آہانت نے دو اشعار میں ادا کیا ہے۔

وہ ٹہیل بے برگ و نوا ہوں کہ ہمیشہ  
خالق کے کرم سے رہی آرام کی صورت  
معا جی تقدیر نے آفت سے بچایا  
اس باغ میں دیکھی نہ کبھی دام کی صورت  
عشاق کی بزمی کا مضمون عام ہے۔ آہانت کا ایک شعر ہے ۛ

نیک نامی ہے دلا فرقت عشاق میں عشق  
ہے وہ بزمِ محبت میں جو بزمِ نام نہیں  
اسی غزل میں ایک اور اچھا شعر ہے۔

ہر سخن پر مجھے دیتا ہے وہ بدو و دشنام کو کسی بات مری قابل انعام نہیں  
 غم فراق سے ضبط و تحمل کا ساغر لبریز ہو کر چھلکنا ہی چاہتا ہے اور عاشق ماضی سے توبہ کرتا ہے  
 ایسے مرنے چکائے غم حشر یا رنے واللہ دل لگانے کا اب حوصلہ نہیں  
 الم فیہی کی حد اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اس کا خرگہ ہو جائے اور اگر کسی وقت رنج و محن  
 سے نجات بھی لے تو خود گرفتاری کی دعوت دے ہے

اسیری کے مرنے نے کھو دیا مجھ کو زمانے سے قفس سے چوٹ کر صیاد کے چھپتا ہوں دامن میں  
 اسی غزل میں ایک اور شعر ہے جس کی بندش اور ادا تا بل داد ہے  
 تڑپ اعضا میں ابرو میں کبھی شوخی ہے چٹون میں جوانی میں غضب ہو گا جو آفت ہے لڑکپن میں  
 محبوبوں کی بے نمازی کے مام مضنون کو اس طرح ادا کیا ہے

ہم عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے جان یوں پروانہ وہے اور شمع کو پروانہ ہو  
 اس شعر میں اگرچہ بر مایت لفظی کو ملحوظ رکھا ہے لیکن آدر و کا پتہ نہیں چلتا۔

ایک واقعہ کو کس خوبی سے نظم کیا ہے  
 کسی نے اہلے نسر و زن ہوا کوئی زمانے میں مرنے کی جب خبر پہیلی  
 دبا کے دانتوں میں لگی وہ بے وفا بولا تب فراق نے عاشق کی جاں ابھی لے لی ؟

اپنے دل کے دانشور نہ ہونے پر میر صاحب فرماتے ہیں ہے  
 سب کھلا بانج جہاں آواز حیران و خفا جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنی تھے فقیر کا  
 اسی مضنون کو ذرا اور المیہ رنگ دے کر آہستہ نے پیش کیا ہے

غیر، دل کے مقدر میں نہیں کھلنا لکھا یاں صبا بھی آن کر باد خزاں ہو جائے گی  
 ایک مشکل زمین میں طبع آزمائی کی ہے لیکن عجب آبدار گو ہر نکالے ہیں۔

بھی دل تعلق کر بازیر زمین نہ موئے پر خمی رنج و الم سے چھٹے  
 جنہیں چھوڑتے تھے اکدم نہ کبھی تا حشر غضب ہے وہ ہم سے چھٹے

ہو کیوں نہ ہیں مرنے کی خوشی کہ لمبے فراق کے ختم سے چھٹے  
 آنت سے چھٹے ایذا سے چھٹے ہر وقت کے رنج و الم سے چھٹے  
 سر پھوٹتے تھے دم توڑتے تھے عناقتمی جہاں میں سیرمیں  
 موت آئی نفس میں خوب ہوا میاد کے جو روستم سے چھٹے  
 ہر طرح آنت مشکل ہے کوئی نہیں مشکل رہائی کی  
 ہستی کے دو دام ہیں آ کے پھنسنے جو لوگ کہ قید عدم سے چھٹے  
 مقلع میں وہی مضمون ہے جسے علامہ اقبال نے ایک دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔  
 ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا یاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی  
 حرف و حکایات کے سلسلہ میں ایک شعر ہے۔

بیدار مجھے یاد ہے والدہ تمہاری یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری  
 آانت کے کلام میں بعض اوقات ضمنی طور پر ان کے عقائد، حالات اور واقعات کا بھی سلسلہ جاتا  
 ہے۔ اس قبیل کی غزلوں میں سب سے اہم درج ذیل ہے۔

کیوں نہ ہوں لطافت سے پر آشعار آانت	ماں ہے رعایت پہ دل زار آانت
کی بدلے عبادت کے سدا حسن پرستی	جنت ہو بھلا خاک طلب گار آانت
اخلاق سے پیش آئے شرافت ہے جانا	بتا ہے مروت کے سبب کار آانت
غم دوست ہے دل رنج سے راحت ہو جانیں	فرحت کا سر انجام ہے آزار آانت
کیوں ہوں نہ ریاضت پہ نظر کر کے مدد	رحمت سے تری گرم ہے بازار آانت
لفظوں میں متانت ہے فصاحت ہو زبان میں	کتا ہے ہر اک سن کے یہ اشعار آانت
کاذب ہیں مضامین کی بندش کو کہیں جھوٹ	معمور صداقت سے ہے گفتار آانت
مہتاب کی طلعت ہے کم از کم شب تاب	کس مرتبہ ہے تیرہ شب تار آانت
وعدت کے نظر آتے ہیں کثرت میں کشتے	ہیں دور دل و دیرہ بیدار آانت

رہتا ہے نہیں دردِ محبت سے ہمیشہ      صحت سے بری ہے دل بیمارِ آمانت  
 عشرت کے کتے ہیں شبِ وصلِ کناں کی      فرت ہے سدا درپے آثارِ آمانت  
 صورت میں اصالت میں نہایت میں ہے پیتل      ہر سبیل خوش لمحہ گلزارِ آمانت  
 تحصیلِ رضا میں ہے سدا ملکِ سخن میں      ہے طبعِ رسا ناظمِ سرکارِ آمانت  
 کچھ تھوڑے سے شاگردوں کے ندم ہیں جوئے نظم  
 دیکھو بغراست سوئے اشعارِ آمانت

اسی طرح ایک شعری آتش سے معاشرانہ چٹنگ کی طوفانِ اشارہ کیا ہے اور بعض اشعار میں اپنے  
 آشنا عشری عقائد ظاہر کئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ان کا کلام ان کی قیادِ الکلامی پر دلیل ہے اور اس عہد کی شاعری میں  
 لکھنویت کے عناصر کا پورا پورا رنگ دکھاتی ہے۔ اور اس حیثیت سے ڈرامائی نظموں، داستانوں  
 اور سلام و مرثیہ پر نظر ڈالتے وقت ان کی غزل گوئی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

محمد ابوالیث صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ)



## جامِ صہبائی

- (۱) کوئی مری داستان سے یا نہ سے ہوں گوم بیاں جہاں سے یا نہ سے!
- (۲) مانند جس ہوں اسے اتر دقت خروش دل تیرے خیال سے مزہ پاتا ہے
- (۳) وہ مست ہوں جو بے پئے مست رہے دل شکوہ رنج و غم سے بیگانہ رہے
- (۴) افسردہ نہ ہو کبھی مری آتش شوق دل میرا سیاہ اب بھی ہو جاتا ہے
- (۵) ان ماہِ رخوں پر پڑی جاتی ہے نظر ہے قلب و جگر میں سستی اب تک!
- (۶) ڈالی تھی کبھی نگاہِ الفت تو نے یارب دل گرم و روح مستانہ ملے!
- (۷) سوز غم عشق سے نہ محسوس رہوں ہے صبح کی تازگی ابھی تک معصوم
- (۸) ہر چند ہوئی ہے بزمِ دنیا ناپاک رخ سے ترے کسبِ رنگ و بو کرتا ہوں
- (۹) محفل سے بہت لذتِ تنہائی ہے تنہائی میں تجھ سے گفتگو کرتا ہوں
- (۱۰) (اثر صہبائی)

# انتخاب غزلیات

دل دکھائے ہوئے سے ہیں پیارے  
جسم تو نے روک رکھے ہیں  
جو سر اسر سکون ہیں وہ بھی  
رنگ اُڑنے پہ بھی گل رخسار  
داغ دل کے چرخ ہیں لیکن  
تجھ کو پا کر بھی تیرے غم دل میں  
ہوش والے بھی ان نگاہوں کے  
ترے انسردہ آگ سی ہر سمت  
یوں تو تیرے ہیں پھر بھی عشق سے ہم  
اہل منزل پہنچنے کے بھی کیا کیا  
ہم نے اہل خوشی کو دیکھا ہے

اشک آئے ہوئے سے ہیں پیارے  
وہ بھی ٹھکائے ہوئے سے ہیں پیارے  
تم لائے ہوئے سے ہیں پیارے  
رنگ لائے ہوئے سے ہیں پیارے  
جھللائے ہوئے سے ہیں پیارے  
کیوں سائے ہوئے سے ہیں پیارے  
دہو کے کھائے ہوئے سے ہیں پیارے  
کیوں لگائے ہوئے سے ہیں پیارے  
باز آئے ہوئے سے ہیں پیارے  
پھیر کھائے ہوئے سے ہیں پیارے  
چوٹ کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

کون دیتا ہے یہ صدائیں فراق  
ہم تو آئے ہوئے سے ہیں پیارے

(فراق گورکھپوری)

## میرے لئے

فصل گل میرے لئے، عجز خزاں میرے لئے  
سُئی تسکین ہے امید را نگاہ میرے لئے  
چاک گل ہے حقیقت چاک داماں کا پیام  
جل رہا ہوں ایک مدت سے لبناں حیات

ہر قدم پہ ہے نیا رنگ جہاں میرے لئے  
ہر زمیں ہے آسماں ہی آسماں میرے لئے  
وہ بار آئی لبناں خنزاں میرے لئے  
دقف ہیں سوز دروں کی گرمیاں میرے لئے

(عظیم حمید آبادی دغمانیہ)

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رحمت عالم و ساجد جناب سید سلیمان صاحب ندوی مطبع معارف اعظم لکھنؤ قیمت ۷۷ صفحات ۱۵۵ سال ۱۳۵۱ھ  
کاخذ کتابت طباعت عمدہ۔

سید صاحب نے یہ کتاب مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لئے ترتیب دی ہے۔ ہمارے بچوں اور لڑکیوں کی صحیح دینی تعلیم ہمیشہ سے ہر مسلمان کے پیش نظر رہی ہے لیکن بہت کم مالوں نے خالص تعلیمی نقطہ نظر سے ان کی اس حاجت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر وہ علماء اونچے قسم کی تصانیف و تالیفات میں مشغول و مصروف رہے۔ لڑکیوں اور بچوں کے لئے کتابیں تیار کرنا محض ایک تجارتی سودا سمجھا جاتا اور اس لئے ایک گری ہوئی بات یوں بھی ہمارے ہندوستانی علماء کے لئے چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کے لئے کتابیں تیار کرنا ایک ایسا کام تھا جو بڑے بڑے علماء اپنی نمایاں شان میں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دراصل یہ ہمارے بچوں ہی کی ابتدائی تعلیم جس کی طرف اولین توجہ ہونی چاہئے۔ بنا مضبوط ہوتی ہے تو زبان تک دیوار سیم ہی رہتی ہے لیکن ہمارے یہاں یہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ مذہبی تعلیم لڑکوں کی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے لیکن کوئی باقاعدہ اور سوچا ہوا نظام دینی تعلیم کا نہیں رہا۔ اغلب ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوانوں میں جو عقائد کی کمزوری اور ایمان کی ناستواری نظر آتی ہے وہ بہت کچھ اسی ابتدائی دینی تعلیم کی کمی یا فقدان کے باعث ہو محض تقاضائے زمانہ یا انگریزی تعلیم کی بدولت نہیں سید سلیمان صاحب کی یہ کتاب تعلیمی نقطہ نظر سے ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی مستند کتابیں مختلف اداروں سے نکلتی رہیں۔ ساتھ ہی اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا ایک ایسا مستند نصاب علم تیار کریں جو تعلیمی نقطہ نظر سے مفید بھی ہو اور مستند بھی۔

زیر نظر کتاب میں سید صاحب قبلہ نے عرب، اہل قریش کا حال، پیغمبر معلوم کا گھر، ان پیغمبر معلوم کی حیات مبارک، پھر اسلام کی اشاعت، ہجرت اور لڑائیوں کا حال، آخر میں اسلامی نظام کی تائیس، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کے

اصول اور بغیر معلم کی آخری وصیت سب کا اجالا ذکر دیا ہے۔ زبان دانستہ آسان رکھی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اس کے مطالعہ سے ہرگز محروم نہ رکھیں گے۔

گلابانگ حیات :- مصنفہ امین حنین سیالکوٹی۔ اردو اکیڈمی پنجاب لاہوری گیٹ لاہور قیمت ۲۰ روپے۔  
سائز ۱۱x۷ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ۔

حضرت امین حنین کا کلام غمر سے رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوتا رہا ہے۔ شروع میں سر عبد القدیر کا تعارف نامہ جو جس سے معلوم ہوتا جو اقبال کی طرح آپ نے بھی علامہ شمس العلماء سید میر حسن صاحب مرحوم سے استفادہ کیا ہے اور ادبیات کا ذوق و دین سے ماہل کیا ہے۔ کلام پر اقبال مرحوم کا بہت زیادہ اثر ہے خود کو انھیں کا مثنوی شاعر سمجھتے ہیں۔

آپ کے کلام میں بھی یقین، خودی، زندگی کی اہمیت وغیرہ کے معنائیں ہیں۔ آپ کا کلام گویا اقبال کے کلام کی تفسیر ہے آسان تر الفاظ میں پہلی نظم فاتحہ الکتا ہی ہے آپ کا رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔

اے پڑے ہیں جان کے جیسے اہتمام کر	جن میں ہو کیفیت زندگی بہر خدادہ کام کر
طرحیات سے اڑا جذبہ زلیقن کی آگ	جب کہیں جا کے نیت زندگی و دام کر
پہلے یہ سوچ دام کے توڑ کی سکت بھی ہے	بعد کو دل میں خواہش دانہ زیر دام کر
نقش زوی نہیں ہے تو صغیر و زکا پر	نہنے سے گر نہیں مغرب ہی کے اپنا نام کر
تجربہ کہ تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہو کائنات	بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر
بندہ خواہشات کو کہتا ہے کون عبد مر	پاہے حریت اگر دل کو امین سلام کر

حیات محمد عبدہ :- مترجمہ جناب محمد منظر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے۔ شائع کردہ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور حجم ۸۳ صفحات، سائز ۱۱x۷ قیمت ۱۲ روپے کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔  
محمد عبدہ کا نام دنیا کے اسلام کے ان جلیل القدر فرزندوں میں سے ہے جنہوں نے انیسویں صدی

کے آخر میں مغرب نے بڑھتے ہوئے سیلاب الحاد و عیائیت کو روکنے میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ آخر انیسویں صدی میں تمام مالک اسلامیہ خصوصاً مصر و ہندوستان میں عیائیت اور الحاد اور مغریت کے طوفان پر پا تھے۔ امت اسلامیہ اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایسے وقت میں جمال الدین افغانی کی شخصیت نے اس خطرہ کو شدت سے محسوس کیا اور تمام مالک اسلامیہ میں اس بیدینی اور غیر اسلامی تحریکات کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے ہر جگہ اور ہر ممکن صورتوں سے اس کا استیصال کرنا شروع کیا۔ مصر میں اسی قائد اعظم کے دست راست محمد عبدہ تھے۔

یہ ترجمہ در اہل چارلس ایڈس ایک میانی مشنری کی کتاب ”معاذ و جدیریت“ کے ان چند ابواب کا ہے جو محمد عبدہ کی حیات کے متعلق ہیں۔ باوجود عیائی اور مشنری ہونے کے اس نے محمد عبدہ کے حالات کمال بے قصبی اور غیر جانبداری سے پیش کئے ہیں۔ ترجمہ آزاد، رواں اور بے تکلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اردو تالیفات میں بیش بہا اضافہ ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اگر مرتب صاحب بین الاقوامی اتحاد ملت پر ایک باب کا اضافہ کر دیں تو خوب ہوا۔ امید ہے کہ یہ کتاب ضرور مقبول و معروف ہوگی۔

**اقبال اور قرآن**۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید، حیدر آباد دکن، قیمت: ۱۹۱ صفحات ۱۹۱  
سائز ۱۶ کاغذ، کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

مولوی محمد صلح صاحب عرصہ سے قرآن مجید کی تعلیمات عام کرنے کے سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں۔ خود اقبال مرحوم سے اسی سلسلے میں کئی ملاقاتیں رہیں۔ زیر نظر کتاب کا مقصد اقبال کی تصنیفات میں سے ان حصوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے جو صاف لفظوں میں قرآن مجید سے متعلق ہیں۔ شروع میں مختصر مضامین قرآن کا اثر اقبال پر اقبال کا مقصد شاعری، تشکیل جدید البیات اسلامیہ، ختم نبوت اور تادیبیت کے عنوان سے لکھے ہیں جو برے نہیں اور بہت مختصر ہیں، انتخاب نظم میں جگہ جگہ مختصر تبصرہ اور اشارے بھی دیتے گئے ہیں جو یقیناً مفید ہیں۔ قیمت دو روپے کچھ زیادہ ہے

**مسافر کی ڈائری**۔ از خواجہ احمد عباس صاحب۔ مالی بیلنگ، اوس قیمت ۱۹۲ صفحات ۱۹۲۔ سائز ۲۰×۲۰

کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

خواجہ احمد عباس صاحب نے ابھی جب جنگ شروع ہونے والی تھی دنیا کا سفر کر ڈالا بعض تقریریں دیکھا  
پرایک کتاب اسی سفر پر لکھ ڈالی۔ پہلے انگریزی میں اب اردو میں۔ کتابیں اکثر لوگ اپنے سفر کے بعد لکھ ڈال کر لاتے ہیں  
لیکن وہ اتنا لکھ جاتے ہیں جتنا نہ لکھنا چاہئے اور اس طرح لکھتے ہیں گویا کتابیں پڑھ کر لکھ رہے ہیں دنیا دیکھ کر نہیں۔

خواجہ احمد عباس کی یہ ڈائری اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کو پڑھ کر دنیا کا ہلکا سا نقشہ سامنے آ جاتا ہے دنیا کا جغرافیہ  
نہیں۔ اور یہ بات مصنف نے پہلے ہی سے صاف کر دی ہے۔ ”اگر آپ نے اس کتاب کو اس امید پر خریدیا ہے کہ

اس کو پڑھ کر آپ پر جاپان کی صنعتی ترقی کا راز کھل جائے یا ترکی کے سماجی انقلاب کا پورا حال معلوم ہو جائے.....

تو ممکن ہے آپ کو ایسی ہو۔“ اس کو پڑھ کر تو آپ کو یہ بھی نہ معلوم ہو گا کہ تو دنیا کی آبادی کیا ہے اور کنیڈا کا رتبہ کتنا ہے؟

پھر بھی اگر آپ اس کتاب کو شروع کریں تو بغیر ختم کئے بھی چھوڑنے کو نہ چاہئے گا لطف داستان نہیں اس میں لطف حیات

ہے تمام ممالک کے لوگ اس میں آپ کو جیتے جاگتے نظر آئیں گے۔ حالانکہ آپ ان سے زیادہ واقف نہ ہو سکیں گے

لیکن آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مصنف کے ساتھ آپ نے بھی تیزی سے ایک سفر تمام دنیا کا کر لیا ہے اختصار اور

شفافگی جو ایک کامیاب جرنلٹ کی خصوصیات ہوتی ہیں آپ کو لطف بیان کا کافی مزہ دیگی مختلف قوموں کی تھادیوں کی دیکھی

جدید جغرافیہ پنجاب و سندباد جہازی۔ اردو اکیڈمی پنجاب۔ لاہور گیٹ لاہور قیمت ایک روپیہ

صفحات ۱۴۴۔ ساؤتھ میں کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ

سندباد جہازی صاحب نے اپنے مخصوص مزاحیہ رنگ میں پنجاب کی سیاسیات کو بیان کیا ہے ممکن

ہے پطرس کا لاہور کا جغرافیہ والا مضمون دیکھ کر موصوف کو یہ خیال پیدا ہوا ہو بہر حال ہندوستانیوں کے لئے عموماً

اوپر پنجابیوں کے لئے خصوصاً یہ ایک دلچسپ چیز ہے پنجاب کی قدرتی تقسیم طرح کی ہے (۱) اتحادی سلسلہ کوہ

(۲) اشتر کی جوالا کھی (۳) اجڑاری کا ہستان (۴) گلاس کے میدان (۵) گاگڑیسی سلسلہ کوہ (۵) اکالی جنگلات (۶)

داوی لیک (۷) ہندو ماہی بھاسا کی ترائی۔ اسی طرح ہریادٹی، ہریاسی تحریک اور ہر لیک کو کسی جغرافی نام سے موسوم

کیا ہے اور اس کی خصوصیات کو جغرافیہ کے اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ مقصود و طرافت زیادہ ہے بجا

طرز کے آخر میں اشارات بھی دیئے ہیں تاکہ وہ حضرات جو پنجاب کی سیاسی شخصیتوں سے واقف نہیں ہیں واقف ہو سکیں



# ہماری تعلیم کے دو رخ

ہماری ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم میں ایسے اصولی تقاضے پائے جاتے ہیں جن سے ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر ہلکے اثر پڑ رہا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک ہی چیز کے نہ ہونے سے ہماری ابتدائی تعلیم نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے اور اسی چیز کے ضرورت سے زیادہ ہو جانے کی بنا پر ہماری اعلیٰ تعلیم کشمکش حیات میں بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذیل کی چند سطروں میں پیش کی جاتی ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ ہمارے بزرگ نئی تعلیم سے بھاگتے تھے اور خاتقاہوں اور کیتوں میں ”بغدادی قاعدہ“ سے شروع کر کے میزبان العرن، ”کرپا“ اور ”الوار سیلی“ سے گذرتے ہوئے ”دُرہ نادرہ“ اور ”سبعہ معلقہ“ پر پہنچتے اور پھر فاضل التحصیل ہونے کی سند حاصل کر کے دنا فضیلت سر پر باندھ پھرتے رہتے تھے۔ ان علماء سے مسجدیں تو شاید آباد تھیں لیکن فراہمی روزگار کے جتنے دروازے تھے ان پر بند تھے۔ اس وقت قوم کے رہنماؤں اور زمانہ کے نبض شناسوں نے تاکید کی کہ اگر یہاں زندہ رہنا ہے تو ”لندن جاؤ اور انگریزی پڑھو“ یا لندن نہ جاسکو تو ہر حال انگریزی ضرور پڑھو۔ پھر یہ توانی ہوئی بات ہے کہ ہر جدید شے لذیذ ہوتی ہے یہ نسخہ جو ہمارے ہاتھ لگا تو ہم نے اس کا ایسا استعمال کیا کہ مرض تو شاید گیا ہو یا نہ گیا ہو لیکن مریض تو دین اور دنیا دونوں سے جانا رہا۔ ابتدا کھاتے پیتے گھرانوں سے ہوئی اب ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ اور معمولی خاندانوں میں بھی یہ رواج بڑھتا جاتا ہے۔ بچہ ایک دو سال کا ہوتے ہی اس پر والدین کی حیثیت کے مطابق ”گورنس“ (Governess) نوکریاں ”آیا“ مقرر کر دی جاتی ہیں جو نہ صرف ہمارے مذہبی عقائد اور تمدنی روایات سے بلکہ شریف گھرانوں کے رسم و رواج سے بھی ناواقف ہوتی ہیں یا نادانیت جملانا اپنے پیشہ کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ کیوں کہ ان کا تقرر ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ بچے کے دماغ میں مغربی خیالات بچا دیں اور اس کو سندھ پار کے طرز و بود رہائش کا مادی بنادیں۔ ظاہر ہے کہ ان ”آیا لوگ“ کے ساتھ رات دن گزارتے ہوئے بچے نے خدا اور رسول کا نام کبھی کا ہے کوسنا ہو گا اور اپنی قوم کی قدیم باجدید تاریخ اور تہذیب کی کوئی بات اس کے کانوں تک کبھی



کیوں پہنچی ہوگی۔ ان میں سے اکثر والدین کی تو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا بچہ شکیسپیر نہیں تو کم از کم برنارڈشا ضرور ہو جائے۔ اس لئے گھر کے تمام رہنے والے آپس میں عام طور پر اور بچہ کے سامنے خاص طور پر انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں تاکہ بچہ کی گھٹی میں ہی۔ اے۔ بی۔ سی ڈی پڑ جائے۔ اور بخود وار کی زبان کھلے تو جیٹیر انگریزی بولنے لگیں اور پورسی دادی کی بات کو جانوروں کی بولی کی طرح سمجھ نہ سکیں

بچہ کی عمر دسہ جانے کے قابل ہوئی تو سب سے پہلے کسی "کانٹ" یا مشن سکول کی تلاش ہوتی ہے جہاں کی فضا خالص غربیت سے بھری ہوئی ہو اور جہاں اپنے مذہب، اپنے رواج اور اپنی زبان کی ہوا بھی لگنے نہ پائے۔ لڑکوں کی عمر کاسب سے اثر پذیر حصہ جب اس ماحول میں گذرے گا تو اس میں سے فاسخ ہو کر نکلنے والے لڑکوں سے قوم اور جماعت کو کیا توقع ہو سکتی ہے۔ خاندان والوں کو اس پر غور ہوتا ہے کہ ان کا لڑکا انگریزی میں فصیح گفتگو کر سکتا ہے۔ اس کا لب دلیہ بالکل انگریزوں کا سا ہے

(Scriptures) اسے لفظ بلفظ حفظ ہیں، مسئلہ اے آج ملک کی ساری تاریخ انگلستان پروردہ عبور رکھتا ہے۔ یورپ کے ہر دریا کا طول و عرض اسے معلوم ہے۔ اس کی طرف شاہد والدین کی کبھی نظر نہیں پڑتی کہ صاحبزادہ کو اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ پیغمبر اسلام کس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم کے بنیادی اصول کیا ہیں؛ خلفائے راشدین کون تھے؛ اسلام کہاں کہاں پھیلا اور اس کی ترقی کے اسباب کیا تھے؛ ہماری تاریخ کے اہم دور کیا ہیں۔ اور آج کل کن چیزوں کی کمی نے ہمیں علم دہرا اور مال و دولت کے لحاظ سے ہمسایہ قوموں کی بہ نسبت کمتر کر رکھا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ان "اسکولوں" میں پڑھنے والے صاحبزادوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ بھی کسی قوم کے فرد ہیں اور ان کی قوم کی حالت زار انہیں نہیں ہے۔ ان کی حد نظر صرف خاندان کے ان افراد تک اور اپنے حلقہ کے ان نوجوانوں تک ہوتی ہے جو ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور جو انہیں کی طرح فاسخ البالی اور عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی جماعت کی کمزوری کا علم اس لئے انہیں نہیں ہوتا کہ خدا کے فضل سے ان کے والدین دولت مند ہیں اور اس لئے ان کی ہر حاجت رفع ہو جاتی اور ان کی منہ مانگی مراد برآتی ہے۔ اگر اتنا نا کبھی ان کی نظر اپنی جماعت کی تباہی پر پڑ جاتی ہے تو ان کا دل ٹس سے ٹس

نہیں ہو گا کیونکہ ہر حال وہ اور ان کے خاندان کے لوگ بخیر و عافیت ہیں۔ اب انہیں کون بھائے کہ جب ان کی جماعت کے اکثر افراد تباہ و برباد ہو جائیں گے تو وہ کس کے بن بستر پر عیش و عشرت کریں گے اور پھر انہیں کون چین سے رہنے دے گا۔

یہ تو ہوا ان سکولوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں کا معاشرتی پس منظر اب ذرا اس پر توجہ کیجئے کہ ان کی تعلیمی حالت کیا ہوتی ہے اور ان کی زندگی کے اقدار کیا ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی لکھنا پڑھنا انہیں ایک حد تک آجاتا ہے۔ اور اس زبان میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں جن میں سوائے انہی روزمرہ پیش آنے والے واقعات کے کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کی لذتیں زیادہ تر یہی ہوتی ہیں کہ نفیس لباس پہنیں، جدید ترین ماڈل کی موٹر گاڑیوں میں سواری کریں۔ زیادہ سے زیادہ تھلاؤ میں سینا اور تماشے دیکھیں اور آئے دن ممبئی، کلکتہ یا مدراس کی سیر کریں۔ علمی اور ادبی کتابوں کا لکھنا پڑھنا کوئی معمولی ناول بھی ان کے ہاتھوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ کتابوں سے دلچسپی پیدا کرنے اور لطف اٹھانے کا فن انہیں آتا ہی نہیں اور پھر غیر زبان آخر غیر زبان ہی ہے۔ اس نوعمری میں کسی غیر زبان کی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کا سمجھنا اور ان سے لطف اٹھانا ان کی بساط سے باہر ہے۔ ہر زبان کا ادب اس زبان بولنے والی قوم کے تمدن اور اس کی روایتوں اور تاریخ کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہمارے نونہال انگریزی مصنفوں کی تخلیقیں تمثیلیں اور استعارے کیسے سمجھ سکتے ہیں جو ان کتابوں سے محفوظ ہو سکیں ہیں اگر روزانہ کی سیر و تفریح سے وہ کتابیں تو ان کے مبلغ علم میں کوئی اور ایسی چیز نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی طرف کھینچ سکے کسی انسان کی اوجھڑو کا ایک نام تجربہ کار و عمر غصہ کی زندگی میں یہ نفسیاتی کیفیت کس حد تک خطرناک ہوتی ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اکثر مسجد دارالدين اس کیفیت سے ناواقف نہ رہیں اور صرف حال اور پھر اس پر طرہ یہ کہ خود اپنی زبان سے انہیں عار ہے۔ وہی ٹوٹے پھوٹے دو چار جملے گھر میں یا باہر اٹاٹا ٹکیہ لئے ہوں تو ہوں ورنہ لکھنا پڑھنا تو درکنار وہ چند منٹ مسلسل گفتگو بھی نہیں کر سکتے۔

دوستوں اور ملاقاتیوں سے والدین غریب طور پر کہلاتے ہیں کہ برخواستہ کو اردو نہیں آتی لیکن ماشاء اللہ انگریزی میں طاق ہے کہ اچھے اچھے انگریزوں کو مات کر دے! کوئی ان جملے مانوس اور بان سکولوں میں تعلیم دینے دے

صاحب نام استادوں سے یہ نہیں پوچھا کہ حضرت انگلستان میں اگر کوئی انگریز لڑکا فرینچ زبان اچھی طرح جانتا ہو لیکن انگریزی زبان گنواروں کی طرح بولے تو یہ آپ کے صاحب بہادر اس کو کیا کہیں گے تعلیم یافتہ مذہب تو بہر حال نہیں سمجھیں گے نا؟ پھر آپ نے اپنے صاحب زادوں کا یہ کیا حال کر رکھا ہے کہ کوئی قیمت کا ارا نا واقفیت کی بنا پر ان کے سامنے کبھی غالب یا ماتی کا ایک شعر پڑھے تو یا عسوس کرنے لگتا ہے گویا بھنٹیں کے آگے میں بجا رہا ہے! سچ پوچھئے تو میں نئی نسل کے ان افراد کو بڑا ہمت سمجھتا ہوں کہ وہ اس انتہائی لذت و سرور سے نا آشنا ہیں جو ہمارے ادب کے جواہر پاروں کو چڑھ کر اور سمجھ کر انھیں حاصل ہو سکتی تھی اور جس کو وہ ہوٹلوں اور تماشخانوں میں بے سود تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اسطرحی اور جلد فنا ہو جانے والی لذتوں میں وہ اسی لئے اُلجھے رہتے ہیں کہ ان کے سامنے زندگی کی کوئی اعلیٰ اتدوار نہیں اور وہ کوئی گہری اور دیر پا لذت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اگر ان نوجوانوں میں کچھ بھی سمجھ ہوتی تو وہ اپنے سر پرستوں سے اس کا گلہ کرتے کہ کیوں ان کو اس پیدائشی حق سے محروم کر دیا گیا۔ آپ خود تو فرمائیے کہ علم و ادب کے کیسے انمول خزانے ہیں جو ان پر ہمیشہ کے لئے بند ہیں اور ان کی بدبختی پر آنسو بہائیے کہ وہ لاہوتی کیفیت ان کے تلب پر کبھی طاری نہیں ہوتی جو سعدی یا عارفان کے ایک شعر پڑھنے سے کسی مرد خدا پر طاری ہو جاتی ہے۔

یہ تو ان نوجوانوں کا انفرادی نقصان ہے لیکن اس سے کہیں بڑھ کر وہ اجتماعی نقصان ہے جو قوم اور جماعت پر ان نوجوانوں کی زندگیوں کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے مائد ہوتا ہے۔ ان کی سطحیت پسندی اور قدیم اور جدید علوم سے ناواقفیت انھیں مادیت اور اتحاد کی طرف لے جاتی ہے اور اس طرح ان کے وجود سے جماعت کو تقویت ہونے کی بجائے اس کی جڑیں کمزور ہونے لگتی ہیں۔ اس کے ذمہ دار یہ نوجوان نہیں بلکہ ان کے والدین اور سرپرست ہیں جن کی فرنگیت میں مبتلا ذہنیت ہمیشہ صاحب بہادری کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ اور اولاد کی تعلیم و تربیت میں بھی ان سے غلط اصول کی پابندی کر داتی ہے۔

غیر زبان کے سیکھنے میں معمول سے زیادہ دشواریاں پیش آتی ہیں تو بچہ میں احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے جو نہ صرف اس ابتدائی منزل پر بلکہ اس کی نشرو نمانکے بعد کی منزلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور بچہ کی ذہنی ترقی کو بڑی حد تک روک دیتا ہے۔ ایک عرصہ کے مشاہدہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو لڑکا



ثانوی مدرسوں میں تمام بچوں کو فریج پڑھائی جاتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے موجودہ حالات کے تحت بعض غیر زبانوں کا سیکھنا ناگزیر ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ تعلیم دس بارہ برس کی عمر سے پہلے نہیں شروع کرنی چاہئے اور وہ بھی اس حد تک جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ہمارے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں غیر زبانوں کے سیکھنے پر اور غیر قوموں کی سیاسی اور معاشرتی روایات کے واقف کرانے پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے لڑکوں کی توانائی کا اکثر حصہ ضائع ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ ان کی ذہنیت اور فطرت پر اس کا جواثر پڑتا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے سخت مضرب ہے۔ اس ابتدائی تنزل میں ہمارے معلم اپنی زبان اور ادب سے بڑی حد تک ناواقف ہوتے ہیں یہ تو تھا تفریط کا درجہ۔ اب اس کے دوسرے رخ یعنی تعلیم کے اعلیٰ مدارج پر غور کریں تو ہیں اسی چیز کی افراط نظر آئے گی۔ کالجوں اور جامعات میں ہم اکثر طلباء کو زبان ادب یا تاریخ اور قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ہمارے اکثر نوجوان شاعری مضمون نگاری اور لیڈری کر رہے ہیں اور جسے دیکھو شہرت کا طالب یا رذوق مغل بننے کا آرزو مند نظر آ رہا ہے۔ میں یہاں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ یہ چیزیں بذات خود اچھی ہیں یا نہیں۔ زبان و ادب کے مطلق میں ادب پر کچھ چکا ہوں کہ میرے دل میں ان کی کس قدر وقعت ہے۔ یہاں میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس وقت جامعات میں ہمارے نوجوانوں کی بڑی تعداد زبان اور ادب، تاریخ اور قانون کی تعلیم حاصل کرے یا سائنس، ٹیکنالوجی، طب اور صنعت و حرفت میں ہمارت حاصل کرے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا تاریخ اور ادب وغیرہ میں بی۔ اے، ایم۔ اے کی حد تک معلومات حاصل کرنے کے لئے جامعہ کی تعلیم کے چار پانچ سال وقف کرنا ضروری ہے کیا یہ معلومات ایک اوسط دل و دماغ کے انسان کو خانگی طور پر فرصت کے اوقات میں مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتیں؟ قدیم زمانہ کا تو کیا ذکر ہے کیا موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے ادیب اور دانشور واز سب کے سب یا بڑی تعداد میں جامعات کے ڈگری یافتہ ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ملک کے تمام نہیں تو اکثر ادیبوں، شاعروں اور مضمون نگاروں نے جامعات کے باہر رہ کر ہی بقائے دوام حاصل کی ہے؟ اس بیان سے میرا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ جامعات میں تاریخ ادب اور زبانوں

وغیرہ کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام نہ کیا جائے جیسا کہ میں پہلے بھی کہ چکا ہوں ہر علم دین کے لئے پورا انتظام ہونا چاہئے تاکہ اگر معدودے چند افراد بھی کسی علم سے واقعی ذوق یا شغف رکھتے ہیں تو وہ اپنے شوق کی تکمیل کر سکیں مجھے جو کچھ اختلاف ہے وہ اس امر سے ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد اپنی سائنس اور سائنس کی عمر بچہ پر قابو حاصل کرنے کی ترکیبوں سے واقف ہونے اور ان کو دریافت کرنے کی بجائے سکندر اعظم کی زندگی کے واقعات پڑھنے یا گجرات میں کسی زبان کے ارتقا کا کھوج لگانے میں صرف کر دے۔ بے شک سکندر کی زندگی سے بہت کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں اور گجرات میں زبان کے ارتقا سے واقفیت ہیں اپنی زبان کی اہمیت سکھاتی ہے لیکن کیا گھر میں بیٹھے ہوئے فرصت کے اوقات میں ماہرین کی کتابیں پڑھ کر ہم یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے؟ مدرسہ کی تعلیم کا اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہوتا ہے کہ ہمیں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے قابل بنادے؟ مدرسہ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اگر ایک طالب علم اپنی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ، سیاسیات، ادب اور قانون کی کتابیں خود پڑھ کر سمجھ نہ سکے تو مدرسہ کی ساری تعلیم بے کیا حاصل؟ البتہ چند لوگ جو ان علوم سے حقیقی شوق رکھتے ہیں اور ان میں تحقیق کرنے اور اضافہ کرنے کی خواہش اور صلاحیت رکھتے ہیں وہ جامعات میں ضرور ان چیزوں کی طرف رجوع ہوں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی اور استادوں، والدین، ارباب جامعہ اور حکومت کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ان علوم سے واقعی دلچسپی رکھنے اور ان میں تحقیقی کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں کو پہچاننے کے طریقے معلوم کریں اور سوائے ایسے طالب علموں کے دوسروں کو ان جامعات میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔ کیونکہ ان دوسرے طالب علموں کو ان علوم کا بی اے، ایم اے بنانا نہ صرف ان کا انفرادی نقصان ہے بلکہ قومی نقصان بھی ہے۔ انفرادی نقصان اس طرح کہ جو معلومات وہ خود ذاتی طور پر بھی حاصل کر سکتے تھے وہی معلومات انہوں نے جامعہ میں حاصل کیں حالانکہ اسی زمانہ میں وہ جامعہ میں ایسے ہنر سیکھ سکتے تھے جو کوئی انسان خانگی طور پر نہیں حاصل کر سکتا۔ قومی نقصان اس طرح کہ اگر میری طلب علم جامعہ میں سائنسی اور فنی تعلیم حاصل کرتے جو خانگی طور پر محال ہے تو ان میں سے چند ایک افراد کی ایجادوں اور انکشافوں سے ملک اور قوم کو فائدہ ہوتا۔

اس موقع پر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سر مورس گوانر نے حال میں جامعہ عثمانیہ کے تقسیم اسناد کے موقع پر جو خطبہ دیا ہے اس میں موصوف نے جامعہ میں تاریخ اور سیاسیات کی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے حالانکہ اگر وہ کسی قدر غور فرماتے تو ان پر روشن ہو جاتا کہ وقت اور زمانہ کی ضرورت یہ ہے کہ سائنسی اور فنی تعلیم کی اہمیت جتلائی جائے تاریخ اور ادب، قانون اور سیاسیات کی ان معلومات کو حاصل کرنے کے لئے جو ان علوم کے اوسط درجہ کے گریجویٹ میں پائی جاتی ہیں اچھے کتب خانوں کا وجود کافی ہے جہاں سے وہ میاری کتابیں کافی تعداد میں گھرے جا کر مطالعہ کر سکیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اوسط درجہ کے گریجویٹ کو پڑھانے کے لئے یونیورسٹی کے ہیچ در ہیچ نظام کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہ نظام ناگزیر ہے تو پھر ایچ ایچ ویلیس اور برٹرانڈ رسل جیسے افراد کے لئے کیسے ممکن ہو سکا کہ جامعہ میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم چل کرنے کے بعد تاریخ، معاشیات اور عمرانیات اور طریقہ تعلیم وغیرہ پر میاری کام کرے۔

حاصل کلام یہ کہ میری رائے میں ارباب تعلیم کی یہ پالیسی جس کے تحت جامعہ میں داخلہ کے وقت سائنس پڑھنے والے طلباء کی تعداد محدود کر دی جاتی ہے اور تاریخ و ادب وغیرہ پڑھنے والے طلباء کی تعداد پر کوئی حد بندی مائد نہیں کی جاتی وقت کے متضاد اور ملک و قوم کی ضرورت کے منافی ہے بلکہ حقیقت میں اس کے برعکس ہونا چاہئے یعنی یہ اصول بنانا چاہئے کہ صرف چند طلباء کو جو خاص رجحان اور صلاحیت ثابت کر سکیں جامعہ میں تاریخ و ادب وغیرہ کے شعبوں میں داخلہ کی اجازت دی جائے اور باقی تمام طلباء کو مختلف سائنسوں اور فنون (فن بمبئی مکٹا لوجی) کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا جائے۔ شاعر، مضمون نگار، لیڈر اور سیاسی رہنما ویسے بھی ہماری قوم میں کافی سے زیادہ ہیں ہماری سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ ہم میں سائنس اور فن جاننے والے زیادہ سے تعداد میں موجود ہوں تاکہ ان ہی میں ماہرین کی ایک جماعت شکل سکے ظاہر ہے کہ ابتدا ہی میں سائنس پڑھنے والوں کی تعداد کو محدود کر دیا جائے تو آخری یعنی تحقیقی کام کرنے کی منزل پر پہنچتے پہنچتے طلباء کی تعداد کتنی کم رہ جائے گی پھر کیا تعجب ہے کہ ہمارے ہاں ماہرین سائنس کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر آکا دکا ہیں بھی تو وہ ہماری قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کوئی صاحب اعتراض کریں کہ بہت

سے طلباء میں سائنس پڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ وہ سائنس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میٹرک تک تو سائنس پڑھائی ہی نہیں جاتی یا اگر پڑھائی جاتی ہے تو بالکل ابتدائی چیزیں پھر کیسے تیار کر لیا گیا کہ عام طلباء کو سائنس سے دلچسپی نہیں ہوتی کیا کسی علم کی مبادیات کسی ایک طالب علم کے لئے بھی دلچسپ ہوتی ہیں؟ ہم نے آج تک ایک انسان بھی ایسا نہیں دیکھا جس پر الف بے سیکھتے وقت یا اگر دانیس یاد کرتے وقت ذوق و شوق کے مارے جذب اور وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہو!

جامعات میں سائنس کے پڑھنے والوں کے مقابلے میں تاریخ و ادب وغیرہ پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہونے کے چند اسباب ہیں۔ اول تو ارباب تعلیم کی یہی پالیسی جو ہم نے ادب پر بیان کی ہے اور جس کی بنا پر شروع سے ہی سائنس پڑھنے والوں کی تعداد محدود کر دی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک کی فضا بھی عام طور پر سائنسی نہیں ہوتی ہے جس کی وجہ سے محفلوں میں شاعری اور فاضلی کرنے والوں کی قدر منزلت زیادہ ہوتی ہے۔ حلقہ احباب میں بھی محفل گرامنہ والے دوستوں کی بڑی آؤ بگٹ کی جاتی ہے۔ پھر چونکہ شہرت اور ہر دلعزیزی کی تمنا ہر فرد بشر کے دل میں کم و بیش پائی جاتی ہے اس لئے نوجوان عام طور پر وہی مضمون پڑھا چاہتے ہیں جن سے شہرت اور دلعزیزی حاصل کرنے میں مدد ملے۔ اس عام رجحان پر غالب آنے کے لئے ضروری ہے کہ اہل ملک کی ذہنیت سائنسی یعنی حقیقی مضمون میں چلیا نہ بنائی جائے تاکہ لوگ سطحی باتوں سے مرعوب نہ ہوں اور چرب زبانی کے مظاہرے کرنے کی بجائے قدرت کے اسرار کا کوچ لگانے میں زیادہ محو ہو جائیں

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا این خیر را بینی بیکر

علم اشیا علم الاساتے ہم عصا دمید بیضا تے

علم اشیا داد مغرب را فزع حکمت اداست می بندد روض (اقبال)

ایک تیسری اور اہم وجہ سائنس کے مضامین پر دوسرے مضامین کو ترجیح دینے کی یہ ہوتی ہے کہ سول سروس اور اسی قسم کے دوسرے مقابلے کے امتحانوں میں جو حکومت کی طرف سے لئے جاتے ہیں اور جن میں کامیابی کی بنا پر اعلیٰ ترین مددے سرفراز ہوتے ہیں آئٹس کے طالب علم سائنس کے طالب علموں سے زیادہ نمبر حاصل کرتے ہیں کیونکہ ایسے امتحانوں میں ساری قابلیت کا معیار تقریر اور تحریر کی قوت ہے میری



سمجھ میں اب تک نہیں آسکا کہ محض اردو یا انگریزی میں اچھا لکنا اچھا بولنا حکومت کے کاروبار میں کہاں تک مردو معادن ہو سکتا ہے اور مضمون نگاری اور تعلقاتی (Collectorship) میں کیا رشتہ اور تعلق ہوتا ہے۔ اگر اباب اقتدار چاہتے ہیں کہ ملک کے نوجوانوں میں سائنس کی طرف زیادہ رغبت ہو تو انھیں یہ پالیسی بھی بدلتی چاہئے اور اختیاری مضامین کا یا کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سائنس کے طالب علم کو حکومت کے ہر شعبہ میں داخل ہونے کا زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا ہی موقع ملے جو آرٹس کے طالب علم کو ملتا ہے۔ غور کرنے پر ایسے دوسرے ذرائع بھی معلوم کئے جاسکتے ہیں کہ ملک میں سائنسی اور فنی تعلیم کا رواج بڑھتا جائے اور اب جس طرح سائنس کے گریجویٹوں کے مقابلہ میں آرٹس کے گریجویٹ کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سائنس کے گریجویٹ زیادہ نکلتے لگیں کیونکہ ان ہی گریجویٹوں میں سے سائنس کے ماہرین اور موجد پیدا ہو سکتے ہیں اور معنی زیادہ تعداد میں سائنس کے طالب علم آنے لگیں گے اسی قدر ایسے ماہروں اور موجدوں کے پیدا ہونے کا امکان بڑھتا جائے گا۔ اس واقعہ سے شاید ہی کوئی سمجھدار شخص انکار کر سکے کہ ہماری قوم اور ملک کو اس وقت آرٹس کے مقابلہ میں سائنس کی بے انتہا زیادہ ضرورت ہے پھر میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد آرٹس یعنی تاریخ ادبیات اور اسی قسم کے علوم کی اہمیت کو گھٹانا نہیں ہے بلکہ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو چاہیے وہ سائنس داں یا انجینئر ہی کیوں نہ ہو تاریخ اور ادبیات وغیرہ کی اتنی معلومات ضرور حاصل کرنی چاہئے جتنی ان مضمونوں کے ایک معمولی طلبہ کی گریجویٹ کو حاصل ہوتی ہے۔ اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے اس قدر معلومات اپنی فرصت کے اوقات میں حاصل کرنا اچھی طرح ممکن ہے۔ اس کے برخلاف سائنسی اور فنی تعلیم صرف جامعات یا اسی قسم کے منظم اداروں میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اگر ایک اوسط ذہن اور دماغ کا شخص اپنا یا سرکار کا پیسہ خرچ کر کے اور اپنی عمر کے بہترین سال صرف کر کے جامعہ میں تعلیم حاصل کرے تو ایسے علوم کیوں نہ سیکھے جو ذاتی طور پر یا خانگی طور پر حاصل نہیں ہو سکتے۔

اس مضمون کے پہلے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم کے ابتدائی زمانے میں لڑکوں کو غیر زبانوں اور غیر قوموں کی روایات اور آداب معاشرت کی بجائے اپنی زبان اور اپنی قومی اور مذہبی روایتوں

سے اچھی طرح واقف کرنا چاہئے دوسرے حصہ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کمالجوں اور جامعات میں سوائے چند خاص اہلیت رکھنے والے طلباء کے باقی تمام طلباء کو سائنس اور انجینیری، طب اور صنعت و حرفت کی تعلیم دانی چاہئے۔ اس دوسرے حصہ میں میرا تمام استدلال اس نکتہ پر مبنی ہے کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اکثر اہل ملک اس سے اتفاق کریں گے لیکن اگر بالفرض اہل ملک ایسا نہیں سمجھتے تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں زاناہ خود ان سے سمجھ لے گا۔

### ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

(۱) ادبیات کی تعلیم کے عنوان سے ادبیات کی تعلیم کے نقائص پر جامعہ کے پچھلے پرچوں میں بھی زور دیا جا چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری قوم اور ملک کی بھلائی سائنسی تعلیم میں مضمر ہے لیکن قہرمتی یہ ہے کہ گورنمنٹ کو اچھے ٹیچر کوں کے لئے ادبیات ہی کے طالب علموں کی ضرورت ہوتی ہے اور مغربی ہم ہندوستانیوں کو کلر کی کرنے پر مجبور کئے ہوئے ہے) (مدیر)

# تاریخ کا مادی نظریہ

مختلف زمانوں میں تاریخ کی تعریف اور تشریح کے مختلف نظریات پیش کئے گئے لیکن کچھ عرصہ قبل تک تمام مجوزین اس کو واقعہ جنگاری کے قائم شدہ اصول یا حالات موجودہ کو برقرار رکھنے کے ایک استدلالی فلسفہ سے زیادہ اہمیت نہ دے سکے یہی گئے اس کو سائنس کے مرتبہ تک پہنچایا۔ بقول میگل تاریخ خیالات کی ایک رفتار ہے جو کہ استثناء اور آزادی عمل تک پہنچاتی ہے۔ استغنا خود شعوری سے وابستہ ہے اور خود شعوری خدا سے۔ چنانچہ تاریخ خدا کی آپ بیتی ہے۔ ۱۸۵۰ء میں برنیم نے کہا کہ تاریخ انسان کے ارتقاء اور عمرانیت کی سنس ہے۔ تہیز کے خیال کے مطابق تاریخ ایک سائنس ہے جو ہر روانہ نظر سے زندگی کے مظاہر کی جستجو کرے اور اس کو بیان کرے لیکن ان تمام مجوزین کی تشریحات اور نظریات نہ صحت و صندلی میں۔ بلکہ غیر مکمل بھی سب نے تاریخ کو زندگی کے فلسفہ نمایاتی سے ملانے کی کوشش کی آخر کار اس اور انگیس نے تاریخ کے ادبی نظریہ کو واضح کیا اب یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ نہ تو انسان جنت سے نکالا ہوا ایک گنگا رہے نہ سماج کی ابتدا ایسے متحرک حیاتیات پر ہوئی جو پہلے در پہلے طوفان عظیم کو رخ سکے اور نہ کسی حاکم مطلق نے کائنات کو خوش طبعی کی حالت میں بنایا بلکہ سماج کی ابتدائی تاریخ لائق کے اصول پہلے زمانہ حال کی رائے یہ ہے کہ تاریخ بذات خود نہ کچھ کرنے کی اہل ہے نہ خوشنادر فیروں کی معدن ہو اور نہ وہ جنگ کر سکتی ہے۔ دراصل یہ انسان ہی ہے حقیقی ماندار انسان جو عمل کرتا ہے تاریخ اپنے اغراض کے حصول کے لئے انسان کو کام میں نہیں لاتی گو یا کہ انسان اس سے ایک علیحدہ شے ہے بلکہ تاریخ خود کوئی شے نہیں سوائے انسان کی اپنے اغراض کے حصول کے لئے ایک جستجو۔

انسانی ضروریات ہی قوت عمل کا پیش خیمہ ہیں۔ ضروریات ہی انسان کے لئے دشواریاں پیدا کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے حل کرنے کی طاقت دیتی ہیں۔ وہی انسان کو ہر طرح کا شعور دیتی ہیں۔ بلکہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنی تاریخ خود بناتا ہے لیکن کوئی فرد تاریخ نہیں بنا سکتا بلکہ ایک اتفاق امر ہے کہ ایک غیر معمولی انسان جب اور جہاں چاہتا ہے ظاہر ہوتا ہے لیکن سائنٹفک مورخ اس کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا

کہ ایک غیر معمولی یعنی بڑا شخص خود بخود کسی اعلیٰ طبقہ کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ طبیعتے کسی فرد کو نمائندہ نہیں بناتے ہاں وہ اس کو بڑا بننے کے موقع اور ان موقعوں کو کامیاب بنانے کے ذرائع دیتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان میں فطرتاً موجود ہے اور یقین کرنا انسان کی عادت ہے۔ لیکن یہ کہنا تاریخ کے سخت متضاد ہے۔ انسان فطرتاً غیر متعلقہ ہے اور اس کی عادت یقین کرنا نہیں بلکہ تحقیق کرنا ہے۔ فلسفہ کی پیدائش قدیم انسان کی اسی عادت کی مرہون منت ہے تحقیق اور تدقیق کی اہلیت نے انسان کو دیگر ادنیٰ جانداروں سے افضل کیا ہے۔ اس کا وجود ہی کائنات سے مسلسل کشش کا نتیجہ ہے جب انسان کسی شے کی تشریح اور اس کے اسباب و علل اپنی لامعی کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتا تو اس کو کسی ایسے مافوق الفطرت وسیلہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے جو کہ الجبر کی دلا کے مثل ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد اعتقاد پر ہے جس کا دوسرا نام لامعی ہے۔ اس لئے مذہب اور اعتقاد دنیا کی ہر قوم اور فرقہ میں موجود تھا۔ خواہ وہ گرم ملک ہو خواہ سرد۔ اینگلز نے مذہب کی تعریف یوں کی ہے "مذہب کوئی چیز نہیں، جز ایک خیالی عکس کے جو کہ ان کے داغ پران بیرونی طاقتوں کی وجہ سے پڑتا ہے جو کہ انسان کے روزمرہ کے افعال پر قابض ہیں۔ ایک ایسا عکس جس میں ارضی طاقتیں سماوی طاقتوں کا روپ اختیار کر لیتی ہیں، لیکن بعد سائنس کی مدد سے انسان اس شدید لامعی سے چھپا چڑا سکتا ہے طبیعتیں سائنس اور خصوصاً علم طبیعیات کے ذریعہ وہ بہت سے مظاہر کی تادیل مادی اصطلاح میں کر سکتا ہے

ما کسی فلسفہ کی رو سے انسان خدا کے فرائض انجام دیتا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار اور ارتقاء سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان ان ماحول پر عمل کرتا ہے اور ان کو اپنے موافق بناتا ہے۔ وہ محض ایٹم کا ایک اکیڑ نہیں ہے جو کہ ایٹم سے علیحدہ رہتا ہے بلکہ وہ ایٹم کا ایک اجز ہے۔ اس کے حرکات اس کے ماحول سے اس قدر وابستہ ہیں جس قدر اس کا وجود چنانچہ وہ صرف اپنے ماحول اور وجود کا بنانے والا ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ کا بنانے والا ہے۔

تدوین نتیجہ ہے انسان کی اس جدوجہد کا جو طبیعتیں ( Forces of Nature )

پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ جدوجہد کی یہ اہمیت ہی اس کو دیگر ادنیٰ جانداروں سے علیحدہ کرتی ہے۔ جانور طبعی طاقتوں کے غلام ہوتے ہیں لیکن انسان ان کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور ان پر اپنا قبضہ کر لیتا ہے۔ شروع میں تو وہ محض ماحش ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن جوں جوں وہ ان طاقتوں پر قابض ہوتا جاتا ہے وہ ثقافتی قدر (Cultural value) پیدا کرتا ہے۔ فرصت ثقافت کی پہلی شرط ہے جب تک انسان مذہب نہیں ہو جاتا وہ ثقافت نہیں پیدا کر سکتا پس ثقافت نتیجہ ہے، تمدن سبب ہے یہ کہنا کہ ہندوستان کی ایک روایاتی ثقافت ہے لیکن تمدن نہیں، قطعاً غلط ہے۔ سماجی اور ذہنی ارتقاء کے ایک خاص دور میں جبکہ انسان سوائے مذہبی خیالات کے اور کچھ نہیں سوچ سکتا ثقافتی قدر بھی مذہبیت کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں لیکن جوں جوں طبعی طاقتوں پر انسان قبضہ کرتا جاتا ہے وہ مذہبی خیالات کو چھوڑ کر سائنٹفک استدلالی اور عقلی خیالات قبول کرتا جاتا ہے ثقافتی قدر بھی ایسی حالت میں مذہبی جواز کو چھوڑ دیتی ہے جس طرح سے کہ ایک مذہب شخص کی ثقافت ایک عظیم اثران وحشی کی ثقافت سے برتر ہوگی ایسا طرح دور حاضر کی ایک مذہب قوم کی ثقافت ایک ایسی قوم سے برتر ہوگی جس پر اب تک مذہبی خیالات کا غلبہ ہو۔ سماج کے نشوونما کے کسی خاص وقت میں اس کا قانون اور اخلاقی نظام اپنے زمانہ کے اقتصادی نظام کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ قوانین اور اخلاق نفع اٹھانے والا فرقہ (Exploiting Class) بنایا کرتا ہے اور جس کے ذریعہ وہ اپنی نفع گیری کو روا رکھتا ہے پس معلوم ہوا کہ سیاسی رواج اور قانون جن کے ذریعہ نفع گیری روا رکھی جاتی ہے نہ صرف اقتصادی نظام پر مبنی ہے بلکہ اس کا آئینہ دار ہے یہی اخلاقی شعور کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے۔ غلامی اور رعیت پن (serfdom) اس سماج میں روا رکھا جاتا تھا جہاں اس کی رسم تھی ظاہر ہے کہ جب اقتصادی نظام اس کے موافق تھا تو اخلاقی شعور نے بھی اس کو روا رکھا۔

اس پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مایمچ کے مادی نظریہ کی ابتدا اسی اصول سے ہوتی ہے کہ سماج کی بنیاد پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقہ پر مبنی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اسباب نہ تو انسان کے دماغ میں اور نہ اس کے انصاف

اور حق پسند جذبہ میں ڈھونڈنا چاہئے بلکہ پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں کی تبدیلیوں میں دیکھنا چاہئے تمام گذشتہ تاریخ و معجز تاریخ قدیم کے طبقہ دارانہ کش مکش کی تاریخ ہے جو کہ اُس زمانہ کے اقتصادی نظام پر مبنی ہے۔ سماج کا پورا نظام اسی طور پر گردش کرتا تھا۔

حرارت، غذا، حفاظت اور لباس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انسان نے خام اشیاء کو استعمال کرنا سیکھا چنانچہ انسان اور اشیاء کے درمیان ایک بنیادی تعلق قائم ہو گیا یہی ایک انسان کا دوسرا انسان سے تعلق کا باعث ہوا۔ یہ کیونکر؟ محنت (Labour) کی تقسیم اور تخصیص کی وجہ سے بعض لوگوں کے حقوق اور بعض کے اس کے متعلقہ فرائض قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بعض اشیاء پر بعض لوگوں کی ملکیت ہوگی جبکہ دوسرے اس سے محروم رہیں گے۔ سماج کے نشوونما کے کسی خاص وقت میں افراد کے تعلقات آخر کار ایسے نظام پر مبنی ہوتے ہیں جس میں اشیاء کی ملکیت اور محسوس ہو۔ چنانچہ سماج دو مخالف فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تعلقات یکساں رہتے ہیں لیکن مختلف اوقات میں سماج مختلف چولے بدلتی رہتی ہے مثلاً غلامانہ سماج، جاگیر می سماج اور سرمایہ داری سماج۔ اول الذکر دو سماجوں میں انسانی تعلقات ان دو فرقوں کے درمیان قائم ہو جاتے ہیں جس میں ایک خام اشیاء کا مالک ہونے کی وجہ سے اقتصادی اور سیاسی طاقت رکھتا ہے اور دوسرا خام اشیاء کو مال میں

(Commodity) تبدیل کرتا ہے۔ کام کرنے والا فرقہ اس کام میں تدریجاً (Surplus value)

پیدا کرتا ہے جس کے بدلے میں اس کو معمولی اجرت مل جاتی ہے۔ مومنوالہ ذکر سماج یعنی سرمایہ داری میں حالانکہ تعلقات بدلے نہیں لیکن حالات اور طریقوں میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے اب پیداوار کا منشا استعمال نہیں بلکہ تجارت ہو جاتا ہے اور دلال پیدا کرنے والے اور استعمال کرنے والے کے درمیان کی ایک کڑی ہو جاتا ہے

اگر تاریخ طبقہ دارانہ کش مکش کی تاریخ ہے تو آخر یہ کش مکش ہوتی ہی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان معاش حاصل کرنے کے لئے اپنے اوزاروں کو مہربان بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نئی نئی پیداواری طاقتوں (Productive Powers) اور نو ایجاد اوزاروں کی ملکیت کی وجہ سے

اس کو ان دیگر لوگوں سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جو ابھی تک یہ برائے اوزاروں سے کام کرتے ہیں انہی طاقتوں کا مالک اقتصادی طاقت کا بھی مالک ہو جاتا ہے جب آپس کی مخالفت تیز ہو جاتی ہے تو ایک معاشرتی انقلاب ہوتا ہے جس میں یا تو سماج برباد ہو جاتی ہے یا فتح اُس گروہ کی ہوتی ہے جس کا نظام زیادہ منظم اور مرتب ہوتا ہے۔

اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ سماج کا ارتقاء کیوں کر ہوا یعنی قدیمی اشتتالی سماج سے سرمایہ داری سماج اور پھر اشتراکی سماج کس طرح عمل میں آئے سماج کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جبکہ انسان زراعت کے ذریعہ زمین سے پیدا کرنا سیکھتا ہے۔ گروہ در گروہ انسان زرخیز مقامات پر بس جاتے ہیں اور آپس میں زمین اجما طریقہ پر تقسیم کر لیتے ہیں ملکیت مشترکہ ہوتی ہے اور زیادہ پیدا کرنے کی ہوس نہیں ہوتی ہر شخص اپنی استطاعت کے موافق کام کرتا ہے اور اپنی ضروریات کے بموجب پاتا ہے۔ سکونت حاصل کر لینے کے بعد برادری کے افراد فرصت کے وقت ثقافتی قدر پیدا کرتے ہیں اور ان گلدھ اوزار بناتے ہیں۔ ان اوزاروں کے ذریعہ وہ تنہا کام کرنے لگتے ہیں اور اپنی محنت کے پل آپ ہی کھاتے ہیں۔ پس یہاں سے انفرادی ملکیت کی شروعات ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ برادری میں اجتماعی منافع ختم ہو جاتا ہے اور اس وقت ایسے قانون کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جس کے ذریعہ آپس کے تعلقات اور تصادم خیز منافع کی نگرانی کیجا سکے مذہب پہلے پہل سماج میں داخل ہو کر ایک خدائی قانون پیش کرتا ہے جس کی رو سے کوئی ایک مافوق البشر طاقت انسان کے تعلقات پر حکمرانی کرنے لگتی ہے چنانچہ سورج، چاند اور دوسرے مظاہر ایک مافوق الفطری وسیلہ قرار دے جانے لگتے ہیں۔ قدیمی اشتتالی سماج درہم برہم ہو جانے کے بعد زمین قبیلوں اور خاندانوں کے سرداروں میں منقسم ہو جاتی ہے اور سر قبیل سماج (Patriarchal Society) کہلاتی

سماج کی جگہ لے لیتی ہے۔ سردار قبیلہ آخر کار جاگیر دار بن کر نیابت الہی (Divine Right) کے سایہ میں ایک اعلیٰ اقتدار قائم کر لیتے ہیں چونکہ مذہب، دینیات اور قانون کا کام قائم شدہ نظام کی مخالفت ہوتا ہے اس لئے یہ جاگیر دار استبداد کی انہیں مشینوں کے ذریعہ ہر جمہوری آزادی اور ان کے مرتبہ کے خلاف ہر خطرناک تحریک کو دبا دیتے ہیں۔

نعمات مالک کے زمانہ میں غلامی کا نظام زور پکڑتا جاتا ہے۔ کوڑوں کا ڈر غلاموں کو ہمہ وقت محنت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جس کے بدلے میں ان کو اس قدر خوراک مل جاتی ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں اور افزائش نسل کریں تاکہ غلاموں کی تعداد بڑھے جس طرح سے کہ بھینز اور بکریوں کے بچے گلہ بان کی ملکیت ہوتے ہیں اسی طرح سے غلاموں کے بچے مالکوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ یہ غلام زیادہ تر خانگی کام اور آرائش کے سامان بنانے میں لگائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرتی ضروریات التوا میں پڑ جاتی ہیں اور چونکہ اس زمانے میں زراعت ہی پر سب دار و مدار ہوتا ہے اس لئے یہ زراعت عدم وجہ کی وجہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے اور درہم برہم ہو جاتی ہے۔ سماج میں ایک خطرناک موقع آ جاتا ہے اور غلامانہ نظام کی پیداوار کا طریقہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

غلامانہ سماج کے کھنڈرات پر ایک نئی جاگیر می سماج ( Feudal Society ) قائم ہوا ہے۔ جاگیریت کی بنیاد آزاد کسانوں کو بیدخل کر دینے پر ہے۔ اس نئے نظام میں غلام کے بجائے کسان محنت کرتا ہے۔ جاگیریت کی خصوصیت یہ ہے کہ خود کسان اپنے آلات اور اوزاروں سے محنت کرتا ہے۔ لیکن سوائے معمولی خوراک کے سب کچھ زمیندار کو دیدیتا ہے۔ کسان کو خوراک کے معاملہ میں نیم جان رکھنے سے جاگیریت دوسری صنعتوں کو روکتی ہے لیکن اس کو کامیابی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ انسان کی روز افزوں ضروریات کو ہمیشہ کے لئے روک نہیں سکتا۔ جدید ایجادات، سائنٹفک نظریات، بڑھتی ہوئی صنعت اور مال کے معاملہ میں لوگوں کا ایک دوسرے پر انحصار جاگیریت کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ چنانچہ تجارت کی ترقی جاگیریت کو پیغام اہل ہے۔ جاگیریت میں ایسی طاقت نہیں کہ وہ تجارتی فستقہ کے وجود میں آنے کو روک سکے۔ نئے اوزار اور منظم طریقوں کی وجہ سے استیشیا کی طلب سے زیادہ پیداوار ہوتی ہے اور جو سب کی سب استعمال نہ ہو کر مال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک سرمایہ داری نظام کی بنیاد ڈالتی ہے۔

سرمایہ دار مزدور کی طاقت ( Labour Power ) خریدتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ کارآمد قدر ( Use value ) پیدا کرے۔ لیکن اس عمل میں طلب سے زیادہ پیداوار کی وجہ سے



قدر زائد (Surplus Value) پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول مارکس روپیہ سرمایہ نہیں ہے۔ یہ قدر زائد ہے جو جمع ہو کر سرمایہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سرمایہ دار کا کام قدر زائد پیدا کرنا ہے۔ جو کہ مشین کے استعمال، طلب سے زیادہ پیداوار، کام کے گھنٹوں میں طوالت اور کم اجرت کی وجہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس دور میں روپیہ پیداوار بڑھانا سے استعمال کے لئے نہیں بلکہ فروخت کے لئے پیدا کرنے کے لئے سرمایہ دار کو ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی جو محنت کریں۔ چنانچہ کھیت مزدور اور بیدخل کان اپنی طاقت بیچتے ہیں۔ سرمایہ داری کی خصوصیت یہ ہے کہ دو مخالف فرقے بن جاتے ہیں ایک بورژوا (Bourgeois) جن کے قبضہ میں پیداوار کے ذرائع ہوں اور دو سرمایہ پرور (Proletariat) جو مزدوری کرتا ہے۔ اجرتی مزدور جو اب تک شاذ و نادر تھا بڑھنے لگتا ہے اور سرمایہ داری پیداوار کا وسیلہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اجرت پر کام کرنے والا مزدور اب زندگی بھر کے لئے اجرتی مزدور بن جاتا ہے۔ جاگیریت کا شیرازہ بکھر جانے، تعلقداروں اور روساء کے لوگوں کے برخاست ہو جانے اور کانوں کے بیدخل ہونے کی وجہ سے اجرتی مزدور کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اجتماع کی کثرت اور پیداوار کی طاقت میں زیادتی سرمایہ داری کے ظہور کا باعث ہوتی ہے نہ کہ دنیا کی پیداوار میں کسی منظم طریقے یا ہم آہنگی کی وجہ سے۔ وہ ایک ایسی سماج کا نظام ہے جس میں فرقہ دارانہ کش مکش اور تفاوت بے حد سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہوں جس میں امیرا میر تو رہا ہو اور غریب، غریب تر۔

پیداوار کے ذرائع (جن پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے) اور مزدور (جن کے پاس سوائے اپنی طاقت کے کچھ نہیں ہے) کے درمیان مخالفت پوری طرح حائل ہو جاتی ہے۔ معاشرتی پیداوار اور سرمایہ دار لٹ کسٹ کے تعلقات میں تردید کے عنصر کا اظہار بورژوا اور پرولتاریہ کی دشمنی سے ہوتا ہے۔ پیداوار کی معاشرتی بنظمی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ آدمی پرولتاریہ میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ بازار کی بہتات طلب سے زیادہ پیداوار کا ساتھ قدم بہ قدم نہیں دے سکتی۔ یہ بیحد نازک وقت ہوتا ہے۔ ال کی گردش کم ہو جاتی ہے اور روپیہ مال کی گردش میں حائل ہو جاتا ہے۔

## بامقصد و مفید تعلیم کا نظریہ

ہاں دیوی نے پیشہ کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جو اس کی تحریروں میں جا بجا مذکور ہے لیکن اس نے اس لفظ کو کسی محدود معنی میں نہیں استعمال کیا ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ پیشہ در اور صنعتی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اس کا نظریہ ہمہ گیر ہے جس کی وسعت میں تمام باکار اور بامقصد تعلیم (جس میں نظری و عملی تعلیم بھی شامل ہیں) آجاتی ہے۔ وہ اس نظریہ کا سب سے بڑا علمبردار ہی نہیں بلکہ مخترع اور موجد بھی ہے۔ اس کا نظریہ تعلیمی دنیا میں اپنا سکہ جاچکا ہے اور اس کا اثر اس صدی میں بہت گہرا ہوا ہے۔

یوں تو افلاطون کے زمانہ سے پیشہ کا لفظ رائج ہے لیکن انیسویں صدی میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ کارل مارکس مصنف ”سرمایہ“ کو پائسن مصنف ”کسیت کوئیاں اور کارخانے“ اور جرجن سوشلسٹ ہنریخ شولز مصنف ”اشتر کی جمہوریت کی اسکو لی اصلاح“ وغیرہ مفکرین کی تحریروں نے اسی خیال کی ترویج و تبلیغ کی اور ذہنی و رسمی تعلیم کے خلاف علم بناد و بلند کیا لیکن آج کل جو عموماً اس کو حاصل ہوئی ہے وہ دیوی کا اعجاز ہے۔

پیشہ کا مفہوم آخری تعلیم کا سراغ لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہ خیال مروج تھا کہ ذہنی تعلیم فراغت و فرصت کے ہم معنی ہے۔ علم کو علم ہی کی غرض سے سیکنا تعلیم کا منتائے مقصود ہے۔ اسی پر ذہنی درو کا ترقی کا انحصار ہے۔ اور اس میں جس و حرکت کو بالکل دخل نہیں پکچر کا مفہوم بھی عصر جدید میں ایک خاص معنی رکھتا ہے وہ شخصی تہذیب اور ذاتی شائستگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس میں بعض ایسی کیفیات اور شعور کی شمولیت ہے جو سماجی افادہ سے معرہ ہے۔ دیوی پیشہ و حرفت کی تعریف یوں کرتا ہے: ”وہ مشاغل حیات کی ہدایت کا نام ہے جو انسان کو دوسروں کی عظمت و اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نتائج سے دوسرے متاثر ہوتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔“ پیشہ کی ضد نہ تو فرصت ہے اور نہ کلچر بلکہ تعلیم کا بامقصد اور بالانصب العین کے حامل کرنا و طفلی کی طرح سامان پر آسرا لگانا اس کا ضد ہے۔ پیشہ عملی تسلسل، حرکت کا نام ہے۔

اس کی فرمانروائی میں آرٹ کی فطری قوتوں کی ترقی ہوتی ہے۔ سائنس کی اختراعی قوتیں ابھرتی ہیں منیت کی رنج پائیکھیل تک پہنچتی ہے اور خود حریفہ پیشہ اور کمال حاصل کرتے ہیں۔

پیشہ کو صرف دائرہ معرفت تک محدود رکھنا سخت غلطی ہے، کیونکہ پیشہ و معرفت ہی پیشہ کا متنازعہ مقصود

نہیں ہے۔ پیشہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے احاطہ میں وہ تمام انسانی مشاغل آجاتے ہیں جو انسان کے با مقصد شغل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسان ایک ہی کام کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ مختلف فرائض حیات کا مجموعہ ہے۔ طرح طرح کے مشاغل انواع و اقسام کے فرائض اس کے ذمہ ہیں جن کا انجام دینا اس کے لئے ناگزیر ہو۔ صرف فنانی الحرفہ ہو جانا سماج کے لئے سم قاتل ہے۔ ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے۔ یہاں کی چیل ہیل، رونق و زمیت، گفتار و کردار، دین، آمد و رفت، ہیل و محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ کتنا ہی بڑا صاحب کمال اور اپنے فن میں طاق کیوں نہ ہو لیکن گھربار، خاندان، دوست و احباب، پڑوسی، اقربہ و اقارب کے ربط و تعلقات سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ اور نہ ان فرائض سے منحہ موڑ سکتا ہے۔ جس طرح وہ دوسروں کے سہارے اور مدد پر جیتا ہے۔ دوسرے بھی اس کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اس کے تعلقات دوسروں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی دوسروں کے تعلق سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ فلسفی ہو یا شاعر، مفتی ہو یا مصوّر، انجینئر ہو یا ڈاکٹر، مدبر ہو یا پروفیسر، ملاج ہو یا نجار، کاشتکار ہو یا مزدور، اس کے لئے کسی عورت کا شہرہ کسی باپ کا بیٹا، کسی بیٹے کا باپ کسی معاشرہ کا رکن کسی ریاست کی رعایا ہونا ناگزیر ہے۔ جب تک وہ دوسرے شعبہ ہائے حیات سے تعلقات نہیں رکھتا۔ اپنے شغل زندگی میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ باہمی تعلقات و تعاون سے اسے کسی طرح چھٹکارا نہیں ہمدردی و رواداری کو اس کا مسلک ہونا چاہئے جس کے بغیر زندگی بسر کرنا محال ہے۔

پیشہ کی اہمیت | تعلیم ان ہی لوگوں کا فرض ہے جو انفرادی حیثیت سے کوئی مشکل امتیازی محل کرنا چاہتے ہیں۔ پیشہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کی امتیازی قوتوں اور سماجی خدمات کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ انسان اسی وقت خوش و خرم رہ سکتا ہے جب وہ اپنی فطری قوتوں کے مطابق کسی پیشہ کو اختیار کرنے اور اس کو حسن و خوبی سے انجام دینے کی کوشش کرے جب تک انسان اپنے مقصد حیات کو متعین نہ کرے گا ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صحیح شغل وہی کہا جاسکتا ہے جب انسان کے جلی رجحانات پوری آزادی کے ساتھ نمودار پائیں۔

اس کی ترقی کی راہ میں کم سے کم مشکلات حاصل ہوں اور زیادہ سے زیادہ سرور و بہجت ہو۔ اس سے علی فائدہ یہ ہوگا کہ قوم اور معاشرہ کو اس فرد کی پوری خدمت حاصل ہو سکے گی۔ ازمنہ قدیم میں جب کہ غلامی کا رواج عام تھا، خاص طور پر اس بات کی کمی تھی کہ بہت سے بہترین ذی استعداد اور با مذاق لوگوں کی خدمت سے سماج مستفید نہ ہو سکی۔

افلاطون کے نقطہ خیال سے تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ ہر شخص کی انفرادی قوت و صلاحیت کو جانچے اور ان کو اپنی تکمیل تک پہنچانے میں ہر ممکن کوشش کرے کیونکہ اسی ترقی کی بنیاد پر سماج کی ترقی کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے۔ اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے معاشرہ کی ضروریات کے مطابق جامعیت پیدا ہو سکتی ہے۔ بیان افلاطون نے ایک نفرش کی ہے۔ اس نے پیشہ کے مطیع نظر کو محدود کر دیا ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ پیشہ ایک مسلسل با مقصد شغل کا نام ہے اور جو تعلیم صنعت و حرفت کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے وہ پائدار اور مستحکم ہوتی ہے۔ یہی علم و عمل کا سنگم ہے۔ اسی سے تمام جبلتوں اور خصلتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہی انفعالیات کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس کی ایک ہی منزل مقصود ہوتی ہے۔ وہ بچوں کے قوائے فکر سے اہل کرتی ہے۔ اسی کے سبب تمام کورانہ لائحہ عمل، متحرک اور حیاتی عمل سے تبدیل ہو جاتے ہیں اور افعال اشغال میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ چونکہ مشاغل ترقی پذیر ہیں اور ایک زینے سے دوسرے زینے پر بتدریج پہنچتے ہیں اس لئے تمام رکاوٹوں اور نامساعد حالات کے استیصال کے لئے فطانت اور غور و فکر کو خضر راہ بنانا ہمارا فرض ہے۔

پیشہ و حرفت سے معلومات و خیالات میں اضافہ ہوتا ہے اور علم و ذہن کی ترقی ہوتی ہے۔ وہ ایک مور کی پوزیشن اختیار کرتا ہے جس پر تمام تجربات گردش کرتے ہیں۔ وہ منبج ہے جس سے تمام واقعات و معلومات کے چشمے بہوٹ نکلتے ہیں۔ وہ ایک گوارہ ہے جس کی آغوش میں تجربات کی افزائش ہوتی ہے۔ ایک وکیل ایک طبیب ایک محل کا محنت، ایک سرپرست، ایک شہری جو اپنے مدنی فرائض و حقوق سے دلچسپی لیتا ہے دراپنے منہا سے معبود کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنے شغل و حرفت کی تکمیل کرتا ہے اور ہی شغل و پیشہ اس کا مرکز ثقل بن جاتا ہے۔

کسی پیشہ کے سیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ پیشہ کے ذریعہ سے سیکھا جائے تعلیمی طور و طریقہ کا انجام اور حیاتِ امروزہ کا بہترین استعمال ہی انسان کو کسی پیشہ کا ماہر اور کامل بنا سکتا ہے۔ ہر انسان کا ہر زمانہ میں ایک ہی پیشہ رہا ہے اور وہ یہ کہ زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور اخلاقی ترقی کو پیشِ نظر رکھنا۔ عمدہ فطولیت اور سن بلوغ میں جب کہ انسان آزاد فضا میں رہتا اور معاشی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے اس وقت یہ خیال زیادہ غالب رہتا ہے۔ مگر استبدادی سماج میں دوسری ہی دنیا ہوتی ہے۔ وہاں نئی زمین اور دنیا آسان ہوتا ہے۔ وہاں نہ تو آزادی اس کی ملکیت میں ہوتی ہے اور نہ ذمہ داری اس کی معین و مونس بنتی ہے۔ اس فضا میں جن لوگوں کی پرورش ہوتی ہے وہ ذہنی ترقی کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے۔ طبقہ اعلیٰ اور طبقہ ادنیٰ کے درمیان ایک وسیع خلیج عامل ہوتی ہے اور اس طرح سماجی زندگی کی راہیں سد و دو ہو جاتی ہیں۔ اس لئے لازمی ہے کہ ابتدائی دور میں پیشہ کی تعلیم بلا واسطہ ہونی چاہئے جس میں بچے کے صرف فطری رجحانات اور جبلی خواہشات کا لحاظ رکھا جائے۔ ایسے شامل منتخب کئے جائیں جو اس کے طبعی میلانات کے مطابق اور اس کی مجموعی ترقی میں معین ہوں۔ یہی طریقہ ہے جس سے بچے کا صحیح فطری میلان بتدریج معلوم ہو سکے گا۔ جس کو وہ آئندہ زندگی میں استعمال کرے گا۔ وہی اس کا مخصوص پیشہ بن جائے گا اور ایک مرتبہ انتخاب کرنے کے بعد وہ اس کی زندگی کا رفیق ہو جائے گا۔ لیکن اس بات کو گرہ میں باندھ لینا ہے کہ جو پیشہ انسان اپنے لئے اختیار کرے اس میں امتدادِ زمانہ کے مطابق تغیر و تبدل بھی ضرور ہوتا رہے کیونکہ اس تغیر پذیر عالم میں ہر آن اور ہر لمحہ نئی تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو شخص ہیمن نئی تعمیر کرتا رہے گا وہی فلاح کی راہ پر گامزن ہوگا۔

موجودہ مواقع و خطرات اگر ششہ زمانہ میں حقیقتاً حرفتی تعلیم کا زیادہ چرچا تھا۔ حالانکہ وہ تعلیم پیشہ کے نام سے موسوم نہ تھی۔ عوام کی تعلیم منفعتی تھی جس کو تو آموزی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یا بحسبِ تجربات کے لقب سے پکارتے تھے۔ اسکولوں میں عام طور پر محض لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم مروج تھی۔ جس کی ضرورت ہر پیشہ والے کو پڑتی تھی لیکن کسی مخصوص پیشہ میں تیار ہونے کے لئے دوسروں کے دارالعمل میں جانا پڑتا تھا۔ جو اسکول کی تعلیم سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی تعلیم حرفتی

تھی گو وہ اس کو اس نام سے یاد کرنا میوہ خیال کرتے تھے۔ صرف انھیں پیشوں کو پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ جن میں جسمانی محنت اور عرق ریزی ہوتی تھی جن کا مطلع نظر کسی قسم کا صلہ اور انعام یا کسی بڑے شخص کی خدمت ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جراح اور طبیب کے پیشے کی وقعت حجام کے پیشے سے زیادہ نہ تھی غائبی نمائش شخصی زیائش حلقہ احباب کا جمع کرنا بھی ایک پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ آج کل بھی اعلیٰ تعلیم ایک خاص طبقہ کے لئے محدود ہے جس کا حصول انھیں لوگوں کا اعلیٰ مقصد ہوتا ہے۔ وہ تمام تعلیم جس سے معلم، ادیب لیڈر پیدا ہوتے ہیں غیر حرفتی خیال کی جاتی ہے اور اس کو کلچر کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ ”ادبی تعلیم جس سے ایک مصنف، ایک ایڈیٹر اور ایک صحیفہ نگار کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ پیشہ کے خلاف کلچر کی آواز بلند کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ وہ جس تعلیم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اس میں وہ خود بھی گرفتار ہیں جس تعلیم کو وہ ذہنی و تمدنی تعلیم کے نام سے پکارتے ہیں وہ خود ایک مخصوص پیشہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک مخصوص پیشہ کی تربیت حاصل کی ہے۔ اور وہ اپنا کام اس لئے مستعدی سے کرتے ہیں کہ اس کے بغیر معاشی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔“ ذہنی اور حرفتی تعلیم میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ اگر تفاوت سے تو بامقصد اور بے مقصد تعلیم میں۔ ہر وہ تعلیم جو بامقصد ہوگی، جس سے انسان اختیار ی زندگی بسر کر سکے گا۔ جس سے مدنییت کی لیاقت اور معاشرہ کا باکار ممبر بننے کی صلاحیت پیدا ہوگی وہی حرفتی و افادہ ی تعلیم ہوگی، اسی کا نام شغل ہوگا۔ اسی کو دوکیشن کے دائرے میں رکھا جائے گا۔

منصبی و افادہ ی تعلیم پر تاکید | جمہوری اقوام میں یہ خیال عمومیت کے ساتھ پھیل رہا ہے کہ چونکہ ہر مرد و عورت کو ساج سے ذہنی اور اقتصادی مدد ملتی ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ ساج کو بھی مدد پہنچائے۔ اب لوگوں میں اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ محنت قابل ستائش ہے اور خدمت خلق ایک اخلاقی فرض ہے۔ گزشتہ صدی سے صنعتی انقلاب کی بدولت ان تمام پیشوں نے جو صنعتی ہیں کافی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ صنعت اور تجارت اب گھریلو نہیں رہے بلکہ ان کی حیثیت اب بین الاقوامی ہو گئی ہے اور ان میں بہترین دماغوں کی کاوش شامل ہے۔ تاجروں، ساہوکاروں اور بینک والوں نے زمین اور

کی جگہ لے لی۔ سماج کی کشتی کے یہی لوگ کھوٹا رہے ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدوروں میں ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ آج کل کی صنعت و حرفت نے فنی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور ریاضی، کیمیا، طبیعیات اور نباتات میں خاص تحقیقات کی گئی ہے۔ اقتصادِ انقلاب نے سائنس میں تازہ روح پھونک دی ہے۔ صنعتی پیشہ داعی کاوش چاہتے ہیں۔ اور ان میں تمدن کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے لئے بھی سائنس کی تھوڑی سی واقفیت لازمی ہے تاکہ وہ لوگ کامیابی سے کارخانوں میں کام کر سکیں۔ قدیم صنعتوں میں انفرادی علم کو بہت کم فروغ حاصل ہوا تھا۔ لیکن آج کل مشین چلانے والے کوشین کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ بشین کو اس کی رائے کے مطابق استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیوی نے صنعتی و حرفتی تعلیم کو اسکولوں کے لئے ناگزیر خیال کیا ہے۔

سائنس کا علم تمام تر تجرباتی ہے۔ اس کا انحصار ادبیات پر نہیں۔ اس کی رو سے علم کے طور و طریقہ سے واقفیت زیادہ اہم ہے۔ عام مزدوروں کو دارالترجہ کی تحقیق کی طرح کارخانوں میں تحقیق کی ضرورت نہیں۔ وہاں تو صرف ضرورت کے مطابق کام کرنا ہے۔ اسی بات کو مد نظر رکھ کر ڈیوی نے اسکولوں میں ایسے مشاغل مینا کرنے کو لازمی خیال کیا جن سے بچے مشینوں کا کارخانوں اور سائنس کے اسرار و راز سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیں۔ بچوں کو یہ تمام معلومات بتدریج دی جائیں تاکہ وہ مکمل کو دکھ کی طرح اس کو بھیجی آسانی حاصل کر لیں۔ انواع و اقسام کی معلومات کا ذخیرہ مینا کرنا اور بچوں کے دماغ میں ان کو عملی طور پر ذہن نشین کرنا اسکولوں کا فرض ہے۔ اس طرح بچوں میں ذوق عمل پیدا ہوگا۔ اسکول اور خارجی زندگی میں باہم ربط و تعلق پیدا ہو جائے گا اور وہ اس جذبہ کے ماتحت کام کریں گے۔

ذوق عمل سے ہے نشاطِ مجھ کو نہیں غمِ حیات

روزِ نیا ہے آفتاب، روزِ نئی ہے زندگی

میاں پر ڈیوی نے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس تعلیم کو تجارتی تعلیم خیال کریں جس سے بچے آئندہ زندگی میں مخصوص پیشہ اختیار کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ڈیوی نے بتایا ہے کہ اس تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جس سے ہر فرد معاشرہ کا لائق ممبر بن سکے۔ ہر فرد اپنی زندگی خود اختیار کر سکے اور دوسروں

کا محتاج و دوست نکر نہ رہے بغیر کسی روک کے ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق زندگی گزار سکے۔

افلاس و غربت مصیبت کے مراد نہیں مصیبت یہ ہے کہ لوگ اپنے فطرتی رجحان کے خلاف غلط پینے اختیار کرتے ہیں جن میں وہ کسی قسم کی سرگرمی و انماک ظاہر نہیں کرتے اور نہ ان کے دل میں فطرت و انقباض پیدا ہوتا ہے لوگ صرف روسپیہ کمانے کو سامنے رکھتے ہیں ان کا دل کیوں اور دماغ کیوں ہوتا ہے بیشہ کا محدود نظریہ ان تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کی روسے مزدور و سرمایہ دار اور آقا و غلام کے درمیان ایک ضلع حائل ہو جاتی ہے جو افراد کی ترقی میں روڑے اٹکاتی ہے۔

وہ تعلیم جو پیشہ کی ذہنی و سماجی اہمیت کی معترف ہے وہ اسکولوں میں گزشتہ واقعات کی روشنی میں موجود تعلیم کی گتھیوں کو سلجھا سکے گی۔ سائنس کی تعلیم دے گی تاکہ ذہانت تیز ہو اور مختلف قسم کی اختراع و ایجادات اور صنعت گرمی میں پیش قدمی کا مادہ پیدا کرے۔ حالات عصریہ سے واقفیت کے لئے معاشیات و سیاسیات اور معاشرہ کی اصلاح کا مطالعہ لازمی ہے۔ ان تمام باتوں سے بچوں میں جدید حالات کے مطابق آراستہ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور کورانہ تقلید کے بجائے اختراعی قوت نمودار ہوگی۔ اور اس طور پر ہماری سماجی تشکیل کا انحصار ایک نئی تعلیمی تعمیر پر ہوگا۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی



# حکومتوں کا پروپیگنڈہ

پروپیگنڈے کا ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ہے۔ حالانکہ ہم اس کو محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے اخلاق و عادات ہمارے مذہبی اور سیاسی عقائد کی تشکیل اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ یہ کوئی نئی ایجاد نہیں اس لئے کہ دنیا کے ہر دور میں مذہبی پیشواؤں سیاسی مدبروں اور جلیل القدر بادشاہوں نے اس کو اپنی کامیابی کا ذریعہ تسلیم کیا ہے۔ لیکن عشقی انقلاب کے بعد نئی ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے پروپیگنڈے کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے اور ہماری زندگی کا کوئی لمحہ اس کے اثر سے باہر نہیں ہے جس طرح آج کل ہر چیز میں خاص مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح پروپیگنڈے کو بھی ایک مکمل فن کے درجہ تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ہر حکومت نے باقاعدہ ایک محکمہ مقرر کر رکھا ہے۔ جو اس کے طریقوں اور اصولوں کی اشاعت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے لئے ایک بہت کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے تعلیمی اداروں، رسائل اور کتب، پبلک جلسوں اور ریڈیو وغیرہ کی خدمات اس مقصد کے لئے حاصل کی جاتی ہیں۔ موجودہ حکومتوں کے پاس پروپیگنڈے کے لئے جو سب سے مفید حربہ ہے وہ تعلیم عامہ ہے۔ پہلے انیسویں صدی میں مغربی یورپ کے سرمایہ دار تعلیم عامہ کو بہت مستحب نظروں سے دیکھتے تھے وہ اس کے مخالف اس لئے تھے کہ اس سے عوام میں بیداری پیدا ہونے کے امکانات تھے بعد میں انہوں نے محسوس کیا کہ تعلیم عامہ بہت کارآمد چیز ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے عوام پر اپنا اقتدار قائم کر سکتے ہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جو خیالات بچپن میں انسان کے دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں وہ بڑی مشکل سے زائل ہوتے ہیں اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ حکومتیں تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے عوام کو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا سبق دیتی ہیں۔ نصاب تعلیم بھی ایسا رکھا جاتا ہے کہ حکومت وقت کے خلاف کسی قسم کے باغیانہ جذبات نہ پیدا ہو سکیں۔ ہندوستان میں ہم کو برطانوی راج کی تعریف کے گیت سکھائے جاتے ہیں اور اس پر زور دیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر

ہیں امن و امان نصیب نہیں ہو سکتا۔ انگریز بچوں کو برطانوی سلطنت کے جاہ و جلال کا نشہ پلایا جاتا ہے تاکہ وہ اس میں غمخور رہ کر اس کے تحفظ کے لئے اپنے جان و مال کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔ جرمنی کے اسکولوں میں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ یہودی دنیا کے ذلیل ترین لوگ ہیں اور وہی جرمنی کی تمام بھلی مصیبتوں کے ذمہ دار ہیں۔ نازیٹ دنیا کے لئے بہترین نظام ہے اور چونکہ جن قوم سب اقوام سے اعلیٰ و ارفع ہے اس لئے دنیا بھر پر حکومت کرنا اس کے مقدر میں لکھا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ ان تمام سرمایہ دار ملکوں میں خواہ وہ انگلستان ہو یا امریکہ، اٹلی ہو یا جرمنی پر دوپگینڈے کے طریقے جدا جدا ہیں اور ان کے فوری اغراض میں بھی اختلاف ہے لیکن ان کے بنیادی مقاصد میں ہم آہنگی ہے یعنی ان سب کا آخری مدعا یہ ہے کہ سرمایہ داری دنیا میں قائم رہے برخلاف اس کے سویٹ روس کے اسکولوں اور کالجوں میں لڑکوں کو سرمایہ داری کے نقائص سمجھائے جاتے ہیں اور اشتراکیت کی خوبیاں ان کے دماغوں میں جاگڑیں کرانی جاتی ہیں۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ روس میں نئی پوڈیا لتویک اصولوں کو اس قدر بہتر اور مکمل سمجھتی ہے کہ ان کے قائم رکھنے اور ان کی تبلیغ کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کو تیار ہے اب میں چند باتیں مذہبی پر دوپگینڈے کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ مذہبوں کے پاس ہمیشہ سے پر دوپگینڈے کے بہت کارگر طریقے رہے ہیں جن کو انہوں نے اپنا اثاثہ قائم کرنے کے لئے استعمال کیا اور کرتے ہیں۔ مسلمان مسجد سے اذان کے ذریعہ، ہندو مندر سے ناقوس کے ذریعہ اور عیسائی گرجے سے گھنٹے کے ذریعہ اپنے اپنے مذہبوں کی دعوت دیتے ہیں۔ مذہبی اجتماع، جلوس اور رسوم اگرچہ انسان کے روحانی جذبات کو تسکین دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اس کی بے رنگ اور خشک زندگی میں آب و تاب اور رونق بھی پیدا کرتے ہیں۔ مذہبوں کی مقبولیت اور کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ علاوہ اس کے شاندار مذہبی جلوس، پراسرار رسوم اور عالیشان اور خوبصورت عبادت گاہیں انسان کے دماغ پر نہایت کاغلبہ اور اقتدار قائم کرنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔

لیکن جن مذہب کا اثر عوام پر ہے اس کو اچھے اصولوں کی اشاعت کے لئے نہیں بلکہ رحبت پسندی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہب حکومتوں کے تابع

ہو گئے ہیں اور حکمران طبقہ مذہبی پیشواؤں کو جو چال چاہتا ہے چلاتا ہے اور جس رنگ پر چاہے لگاتا ہے حکومتیں مذہبی اثر اور اقتدار کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ چنانچہ مذہبی رہنما ”مذہب خطہ سے میں ہے“، ”مذہب کو بچاؤ“ وغیرہ وغیرہ کے نعرے بلند کر کے عوام کو حکومت کی طرفداری اور حمایت پر آمادہ کرتے ہیں لیکن یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ لوگ بلاوجہ حکومت کا دامن پکڑے ہوئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ اس وجہ سے مروجہ حکومت کے ساتھ ہیں کہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہیں اس کی ترقی ان کی ترقی ہے اس کی بقا ان کی بقا ہے۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

پرانے زمانہ میں حکمران رعایا پر اپنا وقار اور دبیرہ قائم رکھنے کے لئے عظیم الشان محل اور مقبرے بناتے تھے۔ فوجی مظاہرہ اور دربار شان و شوکت سے منعقد کرتے تھے۔ ایران کے ساسانی بادشاہ، روم کے مشہور شاہ اور سیلوکس کے جانشین اسی مقصد کے لئے اپنے آپ کو دیوتا مشہور کئے ہوئے تھے۔ اسی طرح انگلستان میں موجودہ حالات کے اعتبار سے بادشاہ کے اثر کو قائم رکھنے کے لئے ہزار ہا تدابیر کی جاتی ہیں۔ اخبار، ریڈیو اور سینما کے ذریعہ سے شاہی خاندان کو ہر دلعزیز بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برسر اقتدار طبقہ کے لئے لازم ہے کہ وہ عوام پر اپنی افضلیت کا سکھ جائے تاکہ حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ اپنی اصل حقیقت کو نہیں ظاہر ہونے دیتا بلکہ اس کو پراسرار افسانوں میں پوشیدہ رکھتا ہے اور ہم میں سے بہت ایسے لوگ ہیں جو اس ظاہر جلا کی تہہ کو نہیں پہنچتے کیونکہ ہم سرمایہ داروں کی ظاہر شان و شوکت اور آرام و آسائش کی زندگی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اور ہم بھی اسی کا خواب دیکھنے لگتے ہیں چنانچہ بجائے اس کے کہ ہم ان کی مخالفت کریں ہم ان کے ہاتھوں بہت تھوڑے داموں بک جاتے ہیں اور اپنے اصولوں کے خلاف ان ہی کا گیت گانے لگتے ہیں۔

موجودہ جنگوں میں پروپیگنڈے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ جس طرح توہین ہم اور آبدوز کشتیاں دشمن کو شکست دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح پروپیگنڈے کا بھی حربہ یہی خدمت انجام دیتا ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں انگریزی اور جرمن ہوائی جہاز ایک دوسرے کی فوجوں پر بم کے

گوں کے ساتھ ساتھ اشتہارات بھی پھینکتے تھے تاکہ سپاہیوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کریں۔ زیادہ تر کاغذ کے غبارے یہ کام انجام دیتے تھے۔ موجودہ جنگ کے شروع میں انگریزی ہوائی جہازوں نے جرمنی میں لاکھوں رسالے اور اشتہار گراہے تاکہ اس طرح عوام ہٹلر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ ریڈیو کو پروپیگنڈے کے لئے سب سے پہلے جس ملک نے استعمال کیا وہ سوئیٹ روس تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۱۸ء کے بعد تمام دنیا روس کے خلاف تھی جتنی بڑی حکومتیں تھیں وہ ایک محاذ قائم کر کے اشتہار کی نظام کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ایسی حالت میں بالشویکوں نے اپنے دشمنوں کا دو طرح سے مقابلہ کیا اول تو اپنی فوجوں سے دوسرے ریڈیو کی مدد سے ریڈیو کے ذریعہ انہوں نے اپنے اصولوں کی اشاعت کی تاکہ دنیا کے مزدور بجائے ان کے خلاف لڑنے کے ان کی حمایت کریں۔ روس کے لئے آخر میں یہ اخلاقی اور نفسیاتی اثرات جو اس نے دوسرے ملکوں پر ڈالے بہت ہی منفید ثابت ہوئے۔ موجودہ جنگ میں بھی ریڈیو کے ذریعہ ہر ملک اپنے موافق بہت شدت سے پروپیگنڈا کر رہا ہے اور اس قدر جھوٹ اور مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے کہ شیطان بھی کانپ اٹھتا ہو گا۔ پہلی جنگ میں جرمنی نے غیر ملکوں پر بہت کم زور دیا تھا لیکن ہٹلر نے اس کی کوشش کر کے ۱۹۳۸ء ہی سے پروپیگنڈے کا جال تمام دنیا میں پھیلا کر شروع کر دیا۔ چنانچہ جب موجودہ جنگ چھڑی تو اس کو اپنی مہموں کے سر کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ریڈیو کے پروپیگنڈے میں بھی وہ اتحادیوں سے بازی لے گیا لیکن اب تھوڑے عرصہ سے انگریزوں کو ہوش آ رہا ہے اور وہ اس کمی کی تلافی کر رہے ہیں۔

پروپیگنڈہ کرنے کا یہ بھی ایک عام لیکن کارگر طریقہ ہے کہ جس نظریہ کی اشاعت کرنی ہو اسے کلیتہً بنا کر پیش کیا جائے تاکہ کسی گروہ یا فرقہ کو امتیازی صورت نہ مل سکے اور اس کے اثرات محدود نہ ہو جائیں۔ دنیا کی جتنی بڑی تحریکیں ہوئی ہیں ان میں یہ اصول ہمیشہ کار فرما رہا ہے۔ مثلاً ۱۹۱۸ء کے انقلاب فرانس میں درمیانی طبقہ نے جو اپنے مفاد کے تحفظ کیلئے جاگیریں نظام کے خلاف لڑ رہا تھا آزادی، مساوات اور اخوت کے نعرے بلند کئے تاکہ عوام ان کی طرف آجائیں حقیقت میں اس طبقہ کا مقصد عوام کو فائدہ پہنچانا نہ تھا بلکہ وہ اس ہانے اپنے لئے آزادی اور مساوات قائم کرنا چاہتا

تھاناکہ اپنی تجارت اور صنعت کو فروغ دے سکے۔ اسی طرح موجودہ لڑائیاں سامراجی لڑائیاں ہیں لیکن سرمایہ دار عوام کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں۔ ”تمہارا ملک خطرہ میں ہے۔“ تمہاری آزادی خطرہ میں ہے۔“ جمہوریت کو بگاڑو“ وغیرہ وغیرہ عوام دھوکے میں آکر ان اصولوں کے تحفظ میں اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ اور طرح طرح کی کلفتیں برداشت کرتے ہیں حالانکہ آخر میں ان کی قربانیوں کا ثمرہ دوسروں کو ملتا ہے۔

پروپیگنڈے کے متعلق ہٹلر کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو جنت و دوزخ معلوم ہو سکتی ہے اور دوزخ میں جنت کا لطف مل سکتا ہے۔ ہٹلر کا یہ خیال تجربہ پر مبنی ہے۔ اہل جرمنی کچھ عرصہ سے کس قدر تکلیف اور پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن وہ اس کو استغلاں کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے دماغوں میں یہ جاگزیں کر دیا گیا ہے کہ اب جرمنی کے لئے عہد زریں آیا چاہتا ہے۔ تھوڑا اور امتحان باقی ہے۔ اگر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ جہاں پروپیگنڈے کی بدولت ملک میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا ہو رہی ہے وہاں اسی کی بدولت ہندو مسلم کش مکش اور بارے سیاسی جمود اور اضمحال کا سماں بھی نظر آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ پروپیگنڈہ ہی کی برکت ہے کہ ہمارے مخالفین نے تمام دنیا بھر میں یہ شہرت دے رکھی ہے کہ ہندوستانی خود حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بغیر خارجی مدد کے سنبھال سکیں چنانچہ اس پروپیگنڈے کا یہ اثر ہے کہ نہ صرف غیر اقوام ان باتوں کو یقین کرتی ہیں بلکہ ہم میں خود ایک طبقہ ایسا ہے جو اپنے اہل وطن کو حکومت کرنے کے قابل نہیں سمجھتا اور اپنے ملک کے مستقبل کو امید افزا نہیں سمجھتا۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پروپیگنڈہ ہمیشہ کامیاب ہوا کرتا ہے ہم کو یہاں پر دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اول تو یہ کہ اشاعت کے طریقے مختلف ممالک میں جدا جدا ہوا کرتے ہیں جو طریقہ ایک جگہ کامیاب ثابت ہو کر دوسری جگہ بھی کامیاب ہو۔ مثلاً گاندھی جی کی فاقہ کشی ان کی طرز زندگی اور ان کی لنگوٹ بندی صرف اسی ملک کے لئے کارگر ہو سکتی ہے۔ اس لئے

کہ یہاں کے معاشی اور تمدنی حالات کی وجہ سے عوام گیر دے تہہ اور آدھ گز کی لنگوٹی کے بہت جلد گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں یہ طریقے بامقصد تخریبوں کے لیکن چونکہ ہمارے یہاں مذہبیت اور اہم پرستی کا بہت زور ہے اس لئے ہر وہ پود پیکینڈہ جس پر مذہبی رنگ ہو بہت جلد پھیل جاتا ہے انگلستان اور امریکہ میں ان باتوں سے کام نہیں چلتا اس لئے وہاں قومیت اور جمہوریت کے نعرے بلند کر کے عوام کو جوش دلایا جاتا ہے جو جرمی میں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد معاشی اور سیاسی حالات نے اس طرح پٹنا کھایا تھا کہ ٹیڈ اور اس کی پارٹی نے ایک نیا حربہ استعمال کیا جس نے ان کو آخر کار کامیاب بنا دیا۔ ملک میں جو اشتراک پارٹی تھی اور جس کا عوام پر بہت زیادہ اثر تھا اس نے رفتہ رفتہ اپنی حاکمیتوں سے اپنا وقار کھو دیا جس وقت عوام انقلاب چاہتے تھے انھوں نے نہ صرف ان کی رہنمائی نہیں کی بلکہ نہایت غداری سے کام لیا اور باوجود اس کے کہ حکومت کی باگ ڈور ایک عرصہ تک اشتراکی لیڈروں کے ہاتھ میں رہی انھوں نے بیروزگاری اور افلاس اور معاشی کساد کے سوالوں کا کوئی حل پیش نہ کیا۔ آخر کار عوام اپنے لیڈروں سے اس قدر بد دل ہو گئے کہ انھوں نے اپنی قیمت کو فسطائیوں کے حوالے کر دیا جن کے وعدوں کو انھوں نے آئنا اور صدنہ لکڑیہ کر لیا۔ ہٹلر مزدوروں سے کہتا کہ ہم تو سوشلسٹ ہیں اور تمہاری حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور مزدوروں کو اپنی طرف کرنے کے لئے پارٹی کا نام بھی فیشنل سوشلسٹ رکھا دوسری طرف سرمایہ داروں کی یہ کہہ کر دوجوئی کرتا اور ان سے مالی امداد حاصل کرتا کہ ہم تو اشتراکیت کے جانی دشمن ہیں اور اس کو نہ صرف جرمنی سے بلکہ تمام دنیا سے نیست و نابود کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ ٹیڈ انسانی نفسیات کا بڑا ماہر ہے۔ اور اس نے اس کو مد نظر رکھ کر وہ تمام طریقے اختیار کئے جن سے عوام اس کی طرف راغب ہو جائیں۔ ہاں نے اہل جرمنی کو ان کے قدیم کارنامے اور روایات یاد دلوائے۔ اس نے ان زیادتیوں اور بے انصافیوں کو عوام کے سامنے پیش کیا جو اتحادیوں نے جرمنی کے ساتھ کی تھیں۔ اور لوگوں کے جذبات کو برا بھلا کرنے کے لئے اس نے یہودیوں کو جرمنی کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار قرار دیا۔ وہ قربانی کا بکرا بن گئے۔ عوام نے اپنے دلوں کے غبار ان بے چاروں پر اتار دیا اور ان پر سختیاں کر کے اپنے آپ کو تسکین

دی لیکن وہ ان باتوں میں اس قدر غرق ہوئے کہ اپنی زندگی کے مسائل کو بھی بھول گئے۔ مختصر یہ کہ ٹھلر نے مختلف طریقوں سے ملک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ . . . . لیکن میاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح ”پروپیگنڈے کے طریقے“ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ملک کے معاشی حالات سے مطابقت رکھے اسی طرح جس چیز کا پروپیگنڈہ کیا جائے اس کی بھی ان باتوں سے مناسبت ہونا چاہیے۔

کوجن میں حالات نے مدد دی، انگلستان اور فرانس میں باوجود قہرسم کے پروپیگنڈے کے فطائیت کامیاب نہ ہو سکی اس لئے کہ وہاں کے اقتصادی حالات اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مختصر یہ ہے کہ کسی اصول کی اشاعت کے لئے اگر صحیح قسم کا پروپیگنڈہ بہت ضروری ہے لیکن جو سب سے بنیادی چیز ہے وہ ملک کی معاشی اور سماجی حالت ہے۔ روس میں جاگیر داری اور سرمایہ داری دونوں نیست و نابود ہو گئیں کیونکہ حکمران طبقہ نئی سماجی قوتوں کی دستوں کا اندازہ نہ لگا سکا۔ بالٹیک پارٹی کے پاس زار کے مقابل میں نہ تو فوجی قوت تھی اور نہ وہ اثوجہ صد ہا برس کے پروپیگنڈے سے حاصل ہوتا ہے لیکن اس کو پھر بھی کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ بالٹیک لیڈروں کی ثابت قدمی ان کی قربانی اور ان کے عاملانہ طریقے انقلاب کے لئے مفید ثابت ہوئے لیکن اصل میں جوشے پرانے نظام کی ہلاکت کا باعث ہوئی وہ اقتصادی حالات تھے۔ یورپ کی اور خاص کر روس کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں بالٹیک پارٹی کی کامیابی کا راز مضر ہے حکومت وقت کے مقابل میں کسی باغی جماعت کے ذریعے پروپیگنڈہ بہت محدود ہوتے ہیں اور اگر اقتصادی حالات اس کی مدد نہ کریں تو اس کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ پروپیگنڈے سے جو اس کو مدد ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے عوام پر معاشی ترقی کے نام سماجی پہلو اور اثرات، بخوبی ظاہر کر دئے جاتے ہیں۔ اور ہر طبقہ کی سوسائٹی میں جگہ اور ان کے اغراض و مقاصد نمایاں ہو جاتے ہیں یہ ایک مفید اور اہم فرض ہے لیکن آج کل دنیا کی حکومتیں خواہ وہ جمہوری ہوں یا فسطائی پروپیگنڈے کا یہ صحیح مصرف نہیں لیتیں۔ بجائے عوام کو فائدہ پہنچانے کے اس کے ذریعہ وہ طوق غلامی دوسروں کے گلوں میں پھناتی ہیں۔ اوپر اس کی بہت سی مثالیں دی جا چکی ہیں۔ اور جب تک موجودہ نظام قائم رہے گا یہی صورت رہے گی۔ اس لئے کہ غلط پروپیگنڈہ

کرنا سرمایہ داروں کے اثر اور اقتدار قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن جس وقت ایسے معاشرہ کی تشکیل ہوگی جس کی بنیادیں معاشی اور سماجی انصاف پر ہوں جس میں مالی نفع کی ہوس اور طبقاتی کشمکش نہ ہو جائیگی۔ تو اس وقت موجودہ قسم کے پروپیگنڈے کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی لیکن خود پروپیگنڈے کی نہ ضرورت اور نہ اہمیت کم ہوگی بلکہ اس کی تدر و منزلت میں صحیح معنوں میں اضافہ ہوگا۔ نژد سماجی اور اخلاقی اور معاشی نظریوں کو عوام میں زیادہ مقبول بنانے کے لئے ریڈیو، سینما، اخبار اور رسائل وغیرہ کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ جیسا کہ آج کل سویت روس میں ہو رہا ہے۔ ان باتوں کے باوجود اگرچہ اس نئی سوسائٹی میں پروپیگنڈے کے غلط استعمال کا امکان بہت کم ہو جائے گا لیکن اس کا خطرہ رہے گا کہ ایک فرد یا ایک گروہ اپنا ذاتی اقتدار قائم کرنے کے لئے پروپیگنڈہ شروع کر دے۔ بہترین سے بہترین سوسائٹی میں ایسے افراد موجود ہو سکتے ہیں جو معاشی فوائد نہ چاہتے ہوں بلکہ ان کی ہوس سیاسی اقتدار اور اپنی حکومت قائم کرنے کی ہو۔ ایسے لوگوں سے ہوشیاری لازم ہوگی۔ ان سے بچنے کا سوا اس کے اور کوئی علاج نہیں کہ عوام کی تعلیم اور ان کے سیاسی شعور کا معیار اتنا بلند ہو کہ وہ خطرناک اثرات سے محفوظ رہیں۔ اور رائے عامہ اتنی منظم ہو کہ کسی شخص کو جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے کی ہمت نہ پہنچے۔ ان ہی صورتوں میں انسانی آزادی خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

محبا الحسن خاں صاحب بنی۔ لے آنرز (لندن)



# نثر اردو کی تدریجی ترقی

(مترسینہ داران کے نقطہ تک)

آج اصول ارتقا زندگی کی ہر چیز پر جاری ہے۔ ہر چیز کی تدریجی ترقی اسی اصول کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار دی جاتی ہے۔ پہلے اگر اس کا عمل صرف حیات حیرانی تک محدود سمجھا جاتا تھا تو اب اس کا اثر اخلاقیات اور نفسیات تک بھی پہنچ چکا ہے۔ اور ہر قسم کی علمی تحقیقات میں ارتقائی پہلو کا مطالعہ اہم اور ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔

جبکہ انسانی زندگی تدریجی ترقی اور اصول ارتقا کا نتیجہ ٹھہری تو ادب جس کا انسانی زندگی کے ساتھ بولی دامن کا ساتھ ہے کیونکر اس اصول سے بچ سکتا تھا۔ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے جیسے جیسے زندگی بڑھتی رہی ہے ادب بھی ترقی کرتا رہا ہے۔ زندگی نے جو منزلیں طے کی ہیں ادب بھی ان راہوں سے گزرا ہے۔ لیکن زندگی کا جو حصہ گذر گیا خواہ وہ کتنا ہی دلچسپ اور رنگین کیوں نہ ہو اس کا لوٹنا ناممکن ہے لیکن ادب انی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ اور اس کے ساتھ زندگی کی وہ تمام رنگینیاں بھی جن سے وہ گذشتہ ادوار حیات میں گذر چکا ہے۔ اسی لئے ہر زمانہ کا ادب اس عہد کی زندگی کی یادگار ہے اور یہ ایک ایسا مرقع ہے جس میں امنی و حال کا رنگ مل کر مستقبل کی ہلکی سی جھلک دکھاتا ہے۔

نثر اردو کی ابتدا اٹھویں صدی ہجری سے ہوتی ہے اور ابتدا سے لیکر اس وقت تک اسی اصول ارتقا کے باعث اس میں براہ تدریجی ترقی ہوتی رہی ہے۔ آزاد ادب حیات میں زبان اردو کی ترقی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اردو اس قدر جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کا

دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا“

یہ بالکل صحیح ہے بلکہ ہمارے خیال میں اردو زبان نے ارتقائی منازل اس سے بھی جلدی جلدی طے کئے ہیں سنہ ۱۳۱۲ء جس وقت سے ہم اردو کی ابتدا کرتے ہیں سنہ ۱۳۱۲ء یعنی فورٹ ولیم کالج کے قیام تک کوئی منظم

کوشش زبان کو ترقی دینے کا قطعاً نہ کی گئی۔ اس تین چار سال کے عرصہ میں زیادہ تعداد میں صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ نے مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر زیادہ تر تبلیغ کی غرض سے اردو میں ترجمے کئے یا کتابیں لکھیں۔ اور کم تعداد میں تبلیغ کے سوا ادبی موضوع یعنی کمائیاں اور قصے لکھنے پر قلم اٹھایا گیا۔ یہ سب انفرادی کوششیں تھیں اور اس عرصہ میں بغیر کسی اجتماعی کوشش کے جتنا بھی ہو گیا غنیمت تھا۔ یہ اردو کی فطری صلاحیت اور کشش ہی تھی کہ لوگوں نے اپنے شوق سے اس میں خامہ فرسائی کرنی شروع کی لیکن مشاعراً جب سے کہ اس کی ترقی میں منظم کوششیں ابتداء شروع کی گئیں۔ اس وقت سے آج تک اس نے اس مختصر عرصہ میں اپنی صلاحیت، قابلیت اور ہمہ گیری کا ایسا زبردست ثبوت پیش کیا کہ دوسری پرانی لکھی زبانیں اس دؤر میں اس سے بہت پیچھے رہ گئیں اور وہ سب پر بازی لے گئی۔

اس مضمون میں ہمیں شرار دو کی تدریجی ترقی دکھانی ہے اور منازل ارتقاء پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف منازل کی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے شرار دو کے مختلف دور قائم کریں اور پھر ہر دور کو جدا جدا لے کر بحث کریں تاکہ عل ارتقاء کے اندازہ کرنے اور مختلف خصوصیات کے جاننے میں آسانی ہو۔

دور اول	۱۴۰۰ء سے ۱۵۹۰ء تک	خالص مذہبی دور
دوسرا دور	۱۵۹۰ء سے ۱۷۰۰ء تک	مذہبی ادبی دور
تیسرا دور	۱۷۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک	ادبی مذہبی دور شمالی ہند میں
چوتھا دور	۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۰ء تک	ادبی دور کلکتہ میں۔
پانچواں دور	۱۸۲۰ء سے ۱۸۵۰ء تک	لکھنؤ کا ادبی عہد (عموری دور)
چھٹا دور	۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۴ء تک	نفاذِ ننانیہ جدید شرار دو کی ابتدا

یہ سب ہماری زبان کی اجمالی کیفیت آئیے اب اس کا تفصیل مطالعہ کریں۔

نوٹ: دستہ دار جو دور قائم کئے گئے ہیں ان سے یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل معین تاریخ پر ایک دور ختم ہو کر ٹھیک اسی کے بعد سے دوسرا شروع ہو گیا بلکہ اس سے صرف ایک اندازہ لگانا مقصود ہے اگرچہ یہ ضرور ہے کہ معینہ زمانہ ہی میں کسی دور کی زیادہ تر خصوصیات طبعی ہیں

## نثر اردو کا پہلا دور

خالص ہندی

سنہ ۱۲۰۰ء سے سنہ ۱۵۹۰ء

اردو نثر کی ابتدا کے متعلق ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اب تک جو تحقیقات ہوئی ہے اور دکن کے اہل قلم کی جو کتابیں دریافت ہوئی ہیں ان سے یہ امر صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں نثر نویسی کے شروع ہونے سے کئی سو سال قبل دکن میں اردو زبان کی نہ صرف داغ بیل پڑ چکی تھی بلکہ اس میں نظم و نثر کے بار آور درخت بھی موجود تھے۔ ارتقائی منازل میں یہ وہ زمانہ عجیب اردو بکل بچپن کی حالت میں تھی اس وقت تک مدالتی زبان فارسی اور ہندوؤں کی زبان ہندی مثنوی اور ہندو مسلمان مذہب، تمدن، معاشرت اور زبان ہر چیز میں بالکل مختلف اور جدا تھے لیکن ایک ملک میں رہنے کے ساتھ اس اختلاف اور علیحدگی کا قائم رہنا بڑا مشکل تھا۔ مذہب جو نکل بالکل انفرادی چیز ہے اس لئے اس نے تو اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ لیکن زندگی کی اور دوسری چیزیں اس میں جوں اور ربط و اتحاد کے باوجود کیوں کر جدا جدا رہ سکتی تھیں۔ تمدن اور معاشرت کے جذبہ و انجذاب سے جان ایک نئے تمدن اور معاشرت کی بنیاد پڑی وہاں زبانوں کے ملنے سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔

زبانوں میں اس قسم کی تبدیلیاں غیر شعوری طور پر ابتداً صرف عام گفتگو اور روزمرہ کے کاروبار تک محدود رہتی ہیں لیکن چونکہ میل جول اور ربط و ضبط کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے اس لئے ضرورتاً دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ اور یہ عمل جاری رہتا ہے تاکہ ایک ایسی زبان جو دونوں سے مختلف اور دونوں سے مل کر بنی ہو وجود میں آجاتی ہے۔ یہ زمانہ زبان کے پچھنے کا ہوتا ہے۔ الفاظ کا سراپہ بہت مختصر اور محدود ہوتا ہے۔ ادائے مفہوم کے لئے غیر زبانوں کی دست گیری کی حاجت ہوتی ہے۔ استعارات تشبیہات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ علمی اصطلاحات اور تنجیدہ اسالیب بیان بھی ناپید ہوتے ہیں۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں اردو اسی عالم میں تھی اور اپنے عہد طفولیت سے گذر

دی تھی۔

اس دور کی اردو نثر پر خالص مذہبی رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہے جتنی کتابیں ملتی ہیں سب مذہبی ہیں اس کا اہلی سبب یہ تھا کہ اس دور کے علماء اور صوفی ہندی نثر اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بے پردہ و نہیں تھے اور چونکہ فارسی عربی سے مقصد پورا نہیں ہوا تھا لہذا ان کی تعلیم کے لئے ان کی زبان کا اختیار کرنا بھی ناگزیر تھا علاوہ بریں چونکہ ان کا مقصد تبلیغ اسلام تھا اور اس مقصد کے لئے دینی اور عوام کی زبانوں ہی سے اچھی طرح مقصد باری کی اسید تھی اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کی تصانیف میں مقامی بولیوں کا رنگ بچہ نمایاں ہے۔

دور اول کی تصانیف | ادکن میں اردو نثر کا ابتدائی دور سلاطین بہمنی کے زمانہ کی یادگار ہے۔ یہ حمد سلاطین بہمنی کی سرپرستی میں گذرا قدیم تذکرہ نگاروں نے نقلی کی وہ مجلس کو اردو نثر کی اولین تصنیف لکھا ہے لیکن جدید تحقیقات کی رو سے ایسے مصنفین ملتے ہیں جو فنی سے کسی صدی قبل گذرے ہیں ان میں خواجہ اشرف جاگیر سہانی علیہ الرحمہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے حضرت موصوف کی پیدائش ۱۰۸۵ء مطابق ۱۶۷۴ء میں ہوئی آپ کا تصنیف کردہ ایک رسالہ تفسیر جلی کا سنہ تصنیف ۱۱۳۵ء ہے موجود ہے جدید تحقیقات کے بعد اسی کو اردو نثر کی اولین تصنیف قرار دیا جاتا ہے تعجب ہے کہ اس کی زبان باوجود قدامت کے بہت صاف ہے اور آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

”اے طالب آسان و زمین سب میں خدا ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے  
تو صفات کے باہر بھیر تمام ذات ہی ذات ہے“

اس حمد کے دوسرے مشہور مصنف حضرت شیخ عین الدین گنج العلم ہیں ان کی زبان انکے حمد کی کوئی اُردو کا نمونہ ہے لیکن حضرت موصوف خود کو کئی نہیں تھے آپ کی پیدائش ۱۱۳۵ء میں دہلی میں ہوئی تحصیل علم کے شوق میں گجرات تشریف لے گئے۔ آخر دولت آباد آکر دم لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دولت آباد کی قسمت جاگ رہی تھی اور سلطان محمد تغلق کا دار الحکومت تھا اس وقت یہاں صوفیائے کرام کا اچھا خاصہ اجتماع تھا جن سے اکتاب فیض کا موقع تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلم حضرت علاؤ الدین حینی کے مرید ہوئے اور

حضرت شیخ منہاج الدین علیہ الرحمہ سے کتاب علوم روحانی کی کتابت ریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ ۳۷۷ھ میں بیجا پور تشریف لائے اور سلطان علاؤ الدین جن بھی اور اس کے چار جانشینوں کا عہد بھی آپ کے سامنے گذرا مولف اردو کے قدیم کاتبان ہیں کہ

”شیخ عین الدین گنج العلم نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے کئی زبان میں تصنیف کئے تھے بجلہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں موجود تھے۔ ان کے ادراک کی مجموعی تعداد چالیس تھی۔ اور ان میں فرائض و سنن کے متعلق مختلف احکام اور مسائل تحریر تھے۔“

اس دور کے دوسرے بہت مشہور مصنف حضرت بندہ نواز خواجہ گیسو دراز علیہ الرحمہ ہیں، ان کی تصانیف میں ویسے تو ادبی کتابیں ہیں لیکن بہت مشہور کتاب ”معراج العاشقین“ ہے جو طبع ہو چکی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۷۷ھ ہے آپ کی پیدائش ۱۲۷۲ھ بمقام دہلی ہوئی آپ خواجہ احمد نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ختم خلافت ملنے پر آپ گلبرگ تشریف لے گئے۔ یہ نیز در شاہ بہمنی کا زمانہ تھا یہ ۱۲۷۵ھ کا واقعہ ہے آپ کی وفات احمد شاہ بہمنی کے عہد ۱۲۷۵ھ میں ہوئی۔

حضرت خواجہ بندہ نواز شاعر عربی تھے اور بلند پایہ مصنف بھی تصوف کی تقریباً ۲۰ کتابیں آپ نے تصنیف کیں۔ اکثر عربی اور فارسی کی کتابوں پر حاشیہ لکھا۔ آپ اپنے ہندوستانی شاگردوں کو ان ہی کی زبان میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور اکثر دینی رسالے آپ نے اسی زبان میں مرتب فرماتے۔ آپ کی تصانیف میں تفسیر کلام اللہ، حاشیہ الکشاف، کتاب الاسماء، معراج العاشقین، ہدایت نامہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہ کتابیں اگرچہ کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتیں مگر اس زمانہ کی زبان کا حال ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے

حضرت خواجہ بندہ نواز کی مشہور کتاب معراج العاشقین کا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۷۸ھ/۱۳۷۸ھ ہے نمونہ عبارت ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ نثر اردو کا عہد طفولیت پورا پورا نظروں کے سامنے آجائے نیز پہلا دور جس کو ہم نے خالص مذہبی قرار دیا ہے اس کی خصوصیات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہو۔

”نبی علیہ السلام کے انسان کے بوجھ سے کون پانچ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔“

ہو رہا ہے دربان ہیں۔ پلا تین واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس اس کا امارہ یعنی وجہ  
کسی آنگ سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سنا سو۔ حسد تک سوں بد بوئی نہ  
کیا سو۔ بغض کی زبان سوں بد گوئی نہ لینا سو۔ کینہ کی شہوت کون غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طیب کمال  
ہونا بغض بچان کو دوا دینا۔

دکن کے مصنفین کی ابتدائی نثر کی کوششوں میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے ایک مرید نے کتاب  
ہفت اسماء اپنے پیر کی کتابوں کی تفسیر میں لکھی۔ اسی دور میں سید محمد عبد اللہ حسینی نے نشاط المشرق کا جو حضرت  
محمد الدین مہدلقادری جیلانی علیہ الرحمۃ کی تصنیف ہے، ترجمہ کیا شاہ میران جی نے بھی کئی کتابیں نظم و نثر دونوں  
میں لکھیں۔ نثر میں شرح مرغوب القلوب، بل ترنگ اور گل باس قابل ذکر ہیں۔ میران جی کے صاحبزادہ شاہ برہان  
نے اسی دور میں نظم و نثر کی بہت سی کتابیں لکھیں نظم میں حجت البقاء اور نثر میں کلمات الحقائق قابل ذکر ہیں۔  
شرح مرغوب القلوب مصنفہ شاہ میران جی کی (جس کا سنہ تصنیف ۹۰۱ھ ہے) عبارت کا نمونہ  
درج ذیل ہے

”یہ غیب کے جے کج کام کرے گا کوئی خدا ناؤں نالے کر تو او کام پا مال ہوگا۔ سرانا، نوازا خدا  
کو بہت کہ اد پالن ہارا ہے عالم کا“  
کلمات الحقائق مصنفہ شاہ برہان الدین خلیف میران جی (سنہ تصنیف قبل ۹۹۹ھ) کی عبارت کا نمونہ  
حسب ذیل ہے۔

”اللہ کرے سو ہو دے کہ قادر تو انا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرن بار سچ سچ  
سو تیرا اشارہ سچ ہو ابھی توج بھی باوجود بان کچھ نہیں بھی تھا۔ حق میں دو جا شریک کوئی نہیں۔  
ایسا حال سمجھنا خدا تم سے خدا کون جس پر کرم خدا کا ہو دے“  
شاہ برہان الدین جانم خلیف شاہ میران جی پر پہلا دور جس کو ہم نے خالص مذہبی دور کہا ہے ۹۵۹ھ  
میں ختم ہو جاتا ہے۔

پہلے دور کی نثر اردو پہرہ اوپر کے صفحات میں پہلے دور کے مصنفین اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ ہوا۔ تین عبارتوں

کے نمونے بھی پیش کئے گئے۔ سب سے پہلی چیز جو صاف طور پر معلوم ہوتی ہے دو تو یہی ہے کہ یہ لکنا میں غلط مذہبی رنگ میں لگی ہوئی ہیں مختلف کتابوں میں مختلف اسلامی مسائل کو عام فہم اور آسان زبان میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اور تعجب ہوتا ہے کہ معمولی مسائل نماز، روزہ، خجاست، طہارت سے لے کر بڑے پیچیدہ اور اہم مسائل مثلاً مسئلہ وحدت الوجود وغیرہ کو بھی اسی زبان میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے اس دور کی نثر اردو خالص مذہبی قسم کی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مذہبی مباحث کی نسبت اس قدیم دور کی تصانیف کی عبارت میں مذہبی مصطلحات بکثرت استعمال کی گئی ہیں۔ بہت سے خالص عربی اور فارسی الفاظ بجنسہ اردو میں استعمال ہونے لگے اور یہ ایسے الفاظ اور مصطلحات تھیں جن سے ہر مسلمان کم و بیش آشنا تھا۔ ہماری موجودہ مذہبی مصطلحات زیادہ تر اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان تصانیف کی زبان اس مدد کی زبان کا جو دن میں بولی جاتی تھی اچانک نہ ہے اور اس سے قدیم یا کوئی اردو کا اندازہ ہو سکے گا۔ اگرچہ ان عبارتوں میں ابجہی اور نامانوس الفاظ کثرت سے آئے ہیں لیکن اردو نثر کی ان ابتدائی کوششوں میں بھی زبان حتی الوسع سادہ اور صاف استعمال کی گئی ہے اسالیب بیان اگر بہت زیادہ سلیس اور آسان نہیں ہیں تو بہت زیادہ مشکل اور پیچیدہ بھی نہیں ہیں تعقید اور تصنع سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے لیکن اولین کوشش ہونے کی وجہ سے اکثر مقامات پر عبارت الجھی ہوئی اور گنجلک معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور سے اس قدر بعد زمانی ہونے کے سبب سے ہم ان کتابوں کی عبارتیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہوں

بعض لوگ مذکورہ بالا تصانیف کو اردو زبان کا نمونہ تسلیم کرتے ہیں اور اسے دیکھی سمجھتی ہیں ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ کوئی الفاظ جو اردو دانوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں ان تصانیف میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ الفاظ کس زمانہ کے لوگوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں؟ اس عہد کے لوگوں کو یا اس زمانہ کے لوگوں کو؟ اگر اس زمانہ کے لوگوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں تو بعد زمانی کی وجہ سے ایسا معلوم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ اس وقت سے لے کر اب تک اردو نے ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لی ہیں کہ اردو کی پرانی عبارتوں پر کسی دوسری زبان کے ہونے کا شک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جو ہم نے ادھر درج کی ہیں کوئی نہیں ہو سکتیں بلکہ وہ اردو کی ابتدائی شکلیں ہیں جن پر مقامی رنگ زیادہ غالب

ہے۔ یہ مقامی رنگ ہرزمانہ اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ آج بھی اردو بولنے والے ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں مقامی الفاظ، اصطلاحات، کہاوتیں، ضرب الامثال وغیرہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف استعمال کی جاتی ہیں اور وہ سب کی سب اردو ہی کی مختلف صورتیں قرار پاتی ہیں۔ رہا فصیح اور غیر فصیح کا سوال تو یہ بالکل جدا چیز ہے۔

## دوسرا دور

### مذہبی ادبی

۱۵۹۰ء سے ۱۷۵۰ء

ہم نے اردو نثر کا دوسرا دور مذہبی ادبی کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس دور میں اردو نثر کی جہاں مذہبی کتابیں ملتی ہیں وہاں کچھ قصے کہانیوں کی کتابیں بھی دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن اس دور میں مذہب ہی کا رنگ ادب پر غالب رہا۔

اردو کے ابتدائی دوروں میں یہ وہ زرین دور ہے جو کوئی بادشاہوں کی سرپرستی میں گزرا۔ اور اس کا مرکز گو لکنؤہ اور بیجا پور رہا۔ ان میں سلاطین قطب شاہیہ، سلاطین گو لکنؤہ اور بیجا پور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قلی قطب شاہ جو ۹۸۵ھ سے ۱۰۲۰ھ تک برسر حکومت رہا ایک قادر الکلام شاعر اور علم دوست فرزند تھا۔ دوسرے گو لکنؤہ کے سلاطین ابوالحسن، تانا شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور عبدالمتی قطب شاہ ان میں سلطان محمد قطب شاہ کا کلام بہت بہتر ہے۔ بیجا پور میں ابراہیم عادل شاہ بھی بڑا علم دوست اور قادر الکلام فرزند ہوا ہے۔ اس کے دور میں نصر قلی، ہاشمی اور میرزاں مرثیہ گوادر ملا ظہوری تھے۔ نصر قلی کا معراج نامہ ہے۔ ہاشمی نے ریختی ایجاد کی اور ملا ظہوری نثر لکھتے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی فرزند ابوبکر کا نورس نامہ ہے۔ یہ دور شاعری کے لحاظ سے دکن میں شہنوی کا دور تھا۔ چنانچہ قطب شاہی دور میں وجہی کی شہنوی، قطب شہری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجبال، احمد کی مصیبت اہل بیت،



ابن شامی کی پھول بن لہجی کا قصہ بہرام و گل اندام سب کی سب ثنوی کی طرز میں نظم ہوئیں یہی حال دوسرے سلاطین کے دربار کا تھا عیش و عشرت اور نرم طرب کا ہر جگہ چرچا تھا لہذا بزمیہ ثنویاں جن میں حسن و عشق و ہجو وصال اور فرضی قصے اور کہانیوں کا بیان ہوتا بہت پسند کی جاتیں۔ ایسی چیزیں فارسی ادب سے بکثرت مستعار لی جاسکتی تھیں چنانچہ مذکورہ الصدور ثنویاں زیادہ تر فارسی کا ترجمہ ہیں۔

اس کا اثر نثر پر یہ ہوا کہ اکثر کہتا ہیں فارسی سے ترجمہ کی جانے لگیں، چنانچہ ملا وجہی کی سب رس ایک فارسی قصے حسن و دل سے ماخوذ ہے مصنف نے اس کو اپنی داعی اُچھ کا نتیجہ بتایا ہے لیکن اصل فارسی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ مصنف نے فارسی قصہ سے ماخذ اٹھایا ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب قادری کی معرفت السلوک اور میران یعقوب کی شائل الاتقیاء فارسی سے ترجمہ ہیں۔

دورثانی کی تصانیف اس دور میں اگرچہ ادبی رنگ آنا شروع ہو گیا ہے لیکن مذہب کا رنگ اب بھی غالب ہے۔ اس دور کی مشہور کتابوں میں حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کی گنج مخفی، حضرت شاہ میران جی حسن خاندانا کی شرح تمہید بہانی، مولانا عبدلہ لکڑی احکام الصلوٰۃ، میران یعقوب کی شائل الاتقیاء، شاہ ولی اللہ قادری کی معرفت السلوک، سید شاہ تیر کا رسالہ اسرار التوحید، اور مولانا باقر آگاہ کی تصانیف مذہب سے متعلق ہیں اور سب مذہبیت کے رنگ کو ظاہر کرتی ہیں۔

گنج مخفی کی تصنیف تقریباً ۱۱۰۰ھ میں ہوئی۔ اس کے مصنف شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری ستونی ۱۶۵۵ھ میں اور اس میں مصنف نے شاہ و مشہور سے بحث کی ہے

”اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنے چاہا تو اس میں سوں یک نظر کھلی سوس سوں امین دیکھ ہوا  
امین شاہد کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں ذات کے دو ظہور ہیں۔ ذات نے اپس کون دیکھا۔ اسے نظر  
کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں یوتیوں مرتبہ ذات کے ہیں“

شرح تمہید بہانی جو ایک ضخیم کتاب ہے تقریباً ۱۱۶۳ھ کی تصنیف ہے، اس کے مصنف شاہ میران جی حسن خاندانا ستونی ۱۶۵۵ھ میں اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے یہ اور گنج مخفی بالکل قریب قریب زادہ کی ہیں

”جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تافہی بین الفصنات کو کہے کہ میں نے سو کتاب منجے دکھلاؤ،  
و کتاب بیکھر بہوت خوش ہوئے ہوئے کہ کیا خوب بیان میرے نور کا ہو خدا کے نور کا سکے  
ہو اور اسے کہنا بھی میرا چہ ہے“

احکام الصلوٰۃ کی تصنیف ۳۲۱/۱۶۱ کی ہے۔ اس کے مصنف مولانا عبداللہ معاصر قطب شاہ  
ہیں اور اس میں مصنف نے نماز کے مسائل کو بیان کیا ہے۔

”بات کرنے سوں نماز جانا نماز میں آدمیان کی مثال دعا مانگنے نماز جانا یہی وہ کہنے نماز جانا ڈر  
سوں یا مصیبت سوں نماز جانا نماز میں کسی موت کی خبر سن کر اللہ دانا الیہ راجعون بولے سوں  
نماز جانا مصحف دیک کر پرنے سوں نماز جانا مقہہ ہنسنے سوں نماز جانا“

ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ ان عبارتوں میں کچھ عبارت پہلی عبارت سے برابر کچھ نہ کچھ صاف اور آسان ہوتی جا رہی  
اس عمد کی دوسری کتاب مفتاح الخیرات ہے :-

”ایمان کی مکمل کا معرفت ہو نماز احکام ہو اور کان پہچانا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب  
کون اس کی بچانے چھکارا ہے۔ ہو آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار ہونا ہو گیا۔ اگر تجھے  
پوچھیں گے ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرنا ہے زبان کے تئیں ہو اور استوار کرنا ہے  
دل میں خدائے تعالیٰ کے ایک ہے بغیر ایک خدا خارج دوسرا نہیں“

معرفت السلوک مصنفہ شاہ ولی اللہ قادری کا نمونہ :-

”بولتا ہے کمترین مرید ہو رہا ہیں ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ابالی عاجز فقیر الحقیر  
محمد ولی اللہ حکم کئے مجھ کو حضرت شہباز دلایت معدن ہدایت آفتاب عالمناں (بزرگ اولیا  
کے بڑے اقلیائے) (ہو مرد نشین محمد مصطفیٰ کے) (صاحب شریعت ہو طریقت کے دربار  
ہو معرفت کے) (وارث محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھ اللہ انوں کو)  
مولانا باقر گاہ اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں :-

”بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا کمال کرنا سی میں لکھے ہیں تاکہ وہ لوگ جو عربی نہیں

سمجھ سکتے ہیں ان سے فائدہ پائیں لیکن اکثر عورتاں اور تمام آدمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عامی بہ طلب ان کے بہت اختصار کے ساتھ کئی رسالوں میں بولا ہے۔

اس دور کی مذہبی کتابوں کے ساتھ مختلف نمونے پیش کئے گئے جن سے اس دوسرے دور کے مذہبی ہونے کا کافی ثبوت ملتا ہے اور اس کا بھی آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زبان نے رفتہ رفتہ اس وقت تک کس حد تک ترقی کی نیز زبان کی ترقی کے ساتھ عبارت بھی کتنی سلیس اور صاف ہوتی گئی۔ وہ الجھن اور گنگلک پن جو پہلے دور کی کتابوں میں پایا جاتا تھا وہ اس دور میں کم ہو گیا۔ چونکہ زبان بہت کچھ ترقی کر چکی تھی۔ لہذا مذہبی کتابوں کے علاوہ دوسرے مباحث پر بھی کتابوں کی ابتدا ہوئی۔ الفاظ کا سرمایہ اگرچہ ابھی تک آنا و سنا نہ ہوا تھا کہ خالص علمی مضامین کی کوشش کامیاب ہوتی لیکن وہ زمانہ ضرور آپہنچا جہاں زبان تخیل کا ساتھ دے سکتی تھی۔ لہذا اس دور کی تصانیف میں مذہب کے علاوہ قصے اور کہانیاں لکھنے کی کوشش کی گئی اور یہیں سے ادبی دور کی ابتدا ہوتی ہے۔

مولانا باقر آگاہ کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں فارسی ترجموں کی مانگ زیادہ تھی چنانچہ نظم اور نثر دونوں میں فارسی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ اس سے ایک تو فارسی الفاظ، محاورے استعارات اور تشبیہات اردو میں آنے لگے دوسرے فارسی خیالات اور اسالیب بیان نے بھی اردو میں راہ پائی۔ ظہوری کی نثر کا تتبع اردو میں ہونے لگا۔ اگرچہ اس طرز کے بہترین نمونے اس دور کے بعد ہی ملتے ہیں لیکن ان کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

اس دور کی ادبی تصنیف ملا جلی کی سب رس ہے جس کا زمانہ تصنیف تقریباً ۱۰۴۰ھ ہے ملا جلی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا معاصر اور مدارج ہے مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں کہیں نہیں بتلایا ہے کہ یہ قصہ اس نے کہاں سے لیا ہے۔ دیباچہ پڑھنے سے ہر جگہ یہی شبہ ہوتا ہے کہ قصہ دجی کی داغ کی ایجاد ہے اور اس پر اس نے جا بجا فخر بھی کیا ہے لیکن اب جیسا کہ تحقیقات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ دجی نے یہ قصہ دستور عشاق، یعنی قصہ حسن و دل مصنفہ محمد علی فنا می نیا پوری سے لیا ہے۔ سب رس میں اگرچہ اس طرز کہیں اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب دستور عشاق دیکھ کر لکھی گئی ہے لیکن دونوں کے پڑھنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ وجہی نے قصہ کی واردات حرف بحرف فتاحی سے لی ہے۔ دستور عشاق، ایک شہزی ہے جسے نثر کی صورت میں خود فتاحی نے قصہ جن و دل کے نام سے لکھا تھا۔ وجہی کی نظر سے صرف شرکی قصہ جن و دل گذری اور اسی پر اس نے اپنے قصہ کی بنیاد رکھی۔ وجہی نے اپنی طرف سے صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ جا بجا پند نصیحت کا دفتر کھول دیا ہے جس کا اصل کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ طرز تحریر میں بھی وجہی نے نثر ظہوری کے تتبع کی کوشش کی ہے اور مفتی اور سجع عبارت لکھی ہے۔ مثلاً

”دنیا میں خوب گندائی چار لوگاں میں عزت پائی جاو، رہے کھڑے واں قبول پڑے  
نہ آفت دیکھی نہ زلزلہ، ایسے بجلے تو عالم بھلا کسی کو برا بونیا دوسوں ہے بجلائی برائی سب  
اپنے پاس ہے“

دوسری عبارت، اپنے ممدوح سلطان عبداللہ قطشباہ کی مدح اور سبب تالیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”سلطان عبداللہ نزل اللہ عالم پناہ، صاحب سپاہ حقیقت آگاہ، دشمن پرور، ثانی سکندر رماش  
صاحب نظر، خطرے تلے باخبر، صورت میں یوسف تلے اگلے، آدم ہوس، بچہ گچیلے، مملکت  
میں افلاطون شاگرد، سخاوت میں قائم ہوئے، برد سجا مت میں رستم گرد، عالی ہمت، نازی  
مرد، دلاور، فریدون فرخ کیم بیان، میا آدم مرتع صولت، زمرہ عشرت، خورشید علم صبح کے وقت  
بٹہ تخت، یکا یک غیب سے کچھ رمز پا کر دل میں اپنے کچھ لا کر، وجہی نادر فن کوں دریا دل  
گوہر سخن کوں حضور بلائے“

اس عبارت کو دیکھ کر صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت اس دور کی مذہبی کتابوں کی عبارت سے مختلف ہے اگرچہ یہ بھی سلیس اور صاف ہے لیکن یہ عبارت پر یکلف ہے جو اردو اور تصنیف سے بھری ہوئی ہے یہ اردو پر فارسی کے اثر کا نتیجہ تھا جو ترجموں کے ساتھ نقل ہوا تھا۔ اس وقت سے اردو پر فارسی کے اثر ہونے کی ابتدا ہوتی ہے اور فارسی الفاظ و محادلات اور اسالیب بیان اردو میں راہ پانے لگتے ہیں اگرچہ اس طرز کے بہترین نمونے بعد کے دوروں میں ملتے لیکن ان کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

”سب رس“ اسی طرز عبارت کا نمونہ ہے۔

”سب رس“ پہلی کتاب ہے جو اردو نثر میں ادیب کے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے اسی وجہ سے اردو کے دوسرے کئی دور کو توڑی بہت ادبی اہمیت بھی حاصل ہو گئی ہے ادیبوں یہ دوسرا دور صرف مذہبی ہونے کی جگہ مذہبی ادبی“ کلاس کے کا متقی قرار پایا ہے کتاب میں مصنف نے جو تلافی کا التزام کیا ہے اس سے اکثر مقامات پر تکلف اور پرتعصیب ہو گئے ہیں اور اکثر جگہ عبارت محض تک بندی جو کر رہ گئی ہے اور اسلوب بیان جو نڈا بن کر رہ گیا ہے لیکن ان مقامات سے قطع نظر کر کے بعض مقامات میں روانی اور سلاست بھی پائی جاتی ہے۔ حال میں نہایت عجائب وغیرہ بھی اسی انداز پر لکھی گئی ہیں لیکن بیان کی سادگی میں ”سب رس“ یقیناً ان سے بہتر ہے یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان قدیم ہے اور پرانے الفاظ و محاورات آج کل سمجھ میں نہیں آتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف نے اپنے زمانہ کی نہایت با محاورہ اور فصیح زبان لکھی ہے اور اس میں نہ مصنف کا کوئی قصور ہے اور نہ اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی حرف آتا ہے چنانچہ وہ خود بھی لکھتا ہے۔

”آج کل کوئی اس زمانہ میں ہندوستان میں ہندی زبان سوا اس لطافت اس چمکان سوا نظم و شعر لکھ کر گلا کر نہیں بولتا“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب رس اپنے زمانہ کی نہایت با محاورہ اور فصیح زبان میں لکھی گئی ہے جس پر مصنف کو بجا طور پر فخر و ناز ہے اس کا انداز بیان جیسا کہ عبارت کے نمونوں سے ظاہر ہے اپنے مقدمہ نمونوں سے ضرور جدا نظر آتا ہے اور اس کی تفسیر اور سب عبارت پڑھ کر کہا جاسکتا ہے کہ شمالی ہند میں جب نثر نویسی کی ابتدا ہوئی اور قصے کہانیاں لکھنے کی کوشش کی گئی تو غالباً اسی قسم کا تقلیدی نمونہ سامنے رکھا گیا۔ باوجود اس کی زبان بہت قدیم ہے۔ سینکڑوں الفاظ اور بہت سے محاورے ایسے ملتے ہیں جو اس وقت سمجھ میں نہیں آتے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض محاورات اس وقت بھی بعد میں اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کل استعمال ہوتے ہیں مثلاً ”شرم حضور می“ دیکھا دیکھی ایشان نہ گمان، وغیرہ۔

دوسرے دور کی اردو نثر پر عام تبصرہ | ہر چیز آغاز کے وقت نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت ہر زبان اور ہر ادب میں پائی جاتی ہے۔ کوئی الفاظ اور محاورات سے قطع نظر اس دور کی شروعات طور پر سادہ اور بے تکلف تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی مؤلفین کے پیش نظر فارسی کی ترقی یافتہ اور پرتکلف نثر کی بجائے

قدائے ایران کی سادہ اور سلیس نثری نمونے تھے۔ اس لئے صفائی اور سادگی اس دور کی اردو نثر میں خود بخود موجود رہی اس وقت الفاظ کے ذریعہ زینت مقصود نہیں تھی جو کچھ بیان کرنا ہے حتی الوسع صاف صاف عبارت میں بیان کر دیا گیا ہے تاہم مرور زمانہ اور زبان کی تدریجی ترقی اور تبدیلیوں کی وجہ سے آج کل اس دور کی تحریروں میں گنجلک پن نظر آتا ہے۔

## تیسرا دور

ادبی مذہبی دور شمالی ہند میں

۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۰ء

پہلے اور دوسرے دور کی نثر اردو میں مذہبیت کا غلبہ تھا وہ اس تیسرے دور میں آکر بہت کم ہو گئی گذشتہ دوروں میں جو کچھ لٹریچر پیدا ہوا وہ مذہب کی بدولت تھا اور اس ابتدائی زمانہ میں اس کا دامن صرف مذہب تک محدود رہا لیکن دوسرے دور کے آخر آخر میں جب زبان کو ذرا ترقی ہوئی تو قصص اور حکایات کا کچھ تھوڑا سا ذخیرہ فراہم ہونا شروع ہوا اور اردو زبان صنعت ادب سے آشنا ہوئی جس کا تذکرہ دوسرے دور میں ہو چکا ہے۔

اس دور سے ادبیت کو غلبہ ملنا شروع ہوتا ہے اور قصص اور حکایات کا کافی تعداد میں لکھی جانے لگیں مذہبی کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن تھوڑی تعداد میں اس سے مذہبیت کا رنگ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور اسی وجہ سے یہ دور مجائے مذہبی ادبی کے ”ادبی مذہبی قرار پایا۔“

اردو نثر کے گذشتہ دور دو دکن میں گذرے اور سترھویں صدی تک دکن ہی اس کا مرکز بنا رہا۔ اٹھارہویں صدی میں مرکز منتقل ہوا اور دکن کی جگہ شمالی ہند نے لی۔ اس وقت تک شمالی ہند بڑی حد تک دکن کی ادبی سرگرمیوں سے بے خبر تھا۔ اہل ادب کے ادبی کارنامے شمالی ہند تک نہ پہنچ سکے تھے نظم سے جو عام دلچسپی رہی ہے اس کی وجہ سے نثر نے دکن کا کچھ نہ کچھ کلام وقتاً فوقتاً شمالی ہند تک پہنچتا رہا مگر اہل دکن کی نثر سے شمالی ہند کو واقف ہونے کا موقع ہی نہ ملا۔ چنانچہ شمالی ہند کے پہلے اردو نویس بولانا نصلی نے

اپنی نثر لؤسی کو ایک ایجاد اور اختراع سے تعبیر کیا ہے۔ اسی خیال کے ماتحت ایک جگہ لکھا ہے:-  
 ”پھر دل میں گذرایسے کام کو عقل چاہے کامل اور مد و کسوط کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید  
 صدی ہے مد جناب احمدی شیکل صورت پذیر نہ ہوئے اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آئے  
 لہذا کوئی اس صفت کا نہ ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی عبارت ہندی نہیں ہوا مستحکم“  
 بہر حال اٹھارویں صدی میں شمالی ہند میں بھی لوگوں نے اردو نثر لؤسی پر قلم اٹھایا اور اردو نثر کا وہ  
 انداز جو کن میں آخر آئیں فارسی کے اثر سے پیدا ہوا چلا تھا شمالی میں آکر ادبی نکھر گیا عبارت میں لؤسی اور  
 مکلف نے دخل پالیا۔ اور رفتہ رفتہ اسی زبان گوئی کہ قافیہ ردیف اور وزن کی بھول بھلیوں میں بھنسن کر اسکی  
 لطافت، سادگی اور خوبصورتی ختم ہو گئی۔

اس دور کی تصانیف | صرف دو پنجہندوستانی مصنفہ بان جو نثر الیکٹر سیر ولندیز مصنفہ ۱۲۵۵ھ ۱۱۲۵ھ اس دور کی سب  
 سے پہلی تصنیف ہے اس سے پہلے عبارتوں کے نمونے درج کئے گئے ہیں وہ سب جنوبی ہند کی قلم کار یا  
 ہیں۔ شمالی ہند کی کوئی کتاب اٹھارویں صدی سے قبل کی نہیں ملتی۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

”ترجمہ دعا حضرت علیؑ ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے۔ پاک ہے تیرے نام آدھے ہم کو  
 ملک تیرا ہوئے راج تیرا جو آسمان تو ہمیں (زمین) میں روئی نہ تھی ہم کو اس دے اور معاف  
 کر تعصیر اپنی ہم کوں، جوں معاف کرتے اپر سے قرض داروں کوں نہ ڈال ہم کوں اس دوسرے  
 میں بلکہ ہم کوں کر اس برائی سے تیری ہی لہجی؟ سواری؟ عالمگیری حمایت میں۔ آمین“

جان جو شواکی اردو عبارت شمالی ہند کے انداز بیان سے جدا ہے۔ البتہ کئی اردو سے کچھ نہ کچھ ملتی جلتی ہو  
 قیاس یہ چاہتا ہے کہ جب غیر ملکیوں کی یہ کوشش رفتار زمانہ کے مطابق عام طور سے کبھی گئی ہوگی اس وقت  
 شمالی ہند کے اہل قلم کو بھی احساس ہوا ہو گا یہ امر بھی خلاف قیاس نہیں کہ اہل یورپ کے عہد تصانیف سے  
 پہلے یا قریب قریب اسی زمانہ میں شمالی ہند کے مصنفین نے تھوڑی بہت کتابیں اردو میں لکھی ہوں لیکن آج  
 تک اس قیاس کے مطابق کوئی اثر نہیں ملتا۔ اس دور کی دوسری تصنیف مہر علی نامہ مصنفہ سید محمد قادر  
 ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۵ھ ۱۱۳۵ھ ہے۔ اس میں مصنف نے حضرت نجفی رحمۃ اللہ علیہ کے قصص و

حکایات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

”پچھے سین طرح طرح صفت و ثناء پیدا کرنے والے زمین و آسمان کی کیفیت و حقیقت (یہ) ہے کہ داستان قصہ و حکایات حضرت بخشیش رحمتہ اللہ علیہ کو نیچ طوطی نامے کے ساتھ عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں اس کے متن مفصل و بیان دار واسطے معلوم ہونے تمام لوگوں کوں محمد قادی نیک کرے اللہ مرتبہ انوں کا بیچ عبارت سلیس اور آسان کے کہ ملی ہوئی اور عبارت خطان کئے ہوئے و درزمرہ جواب و سوال کہ دولت منداں کے تئیں لائق ہوئے لکھے ہیں۔“

اس دور کی کتابوں میں ”وہ مجلس“ بہت مشہور ہے فعلی دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور ان کی زبان اس مہدی عالم شہر کا اچھا نمونہ ہے ”وہ مجلس“ کی تصنیف ۱۲۳۵ھ میں ہوئی ہے۔ یہ کتاب فارسی و روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے جو علامہ حسین کاغذی کی تصنیف ہے اکثر تذکرہ نگاروں نے اسے اردو کی اولین کتاب لکھا ہے لیکن اوپر کے بیان سے اس کی تردید ہو چکی ہے جس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اردو تو درکنار یہ شمالی ہند کی اردو کی اولین تصنیف بھی قرار نہیں دی جاسکتی۔ ”وہ مجلس“ کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو سبب تالیف کتاب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”پس اس اندیشہ عین میں غوطہ کھایا اور میان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہاً نسیم عنایت الہی گلشن افکار پر ہوا تہ ازین آریہ بات آئینہ خاطر میں نہ دکھائی کہ یہ فکر غلطیہ انداز و روح مقدس حسین علیہما السلام حسب خواہش مجہوں کے سرانجام نہ پاوے چوں ذکر حسین علیہما السلام کا ذہن نشین ہوا۔ دین دل کو تقویت ہوئی پھر خاطر میں گذرا کہ قادر حقیقی اور خالق تحقیقی نے ذات انسانی کو ایسی قدرت کرامت کی ہے کہ جیسے کام پر طبیعت اور قوجہ کو مصروف رکھے البتہ معطل اور بوقوف نہ رہے اور انہما کو پہنچے اندازہ ہوا جو گا کہ پہلے دوروں کے مقابلہ میں عبارت میں رنگینی اور تکلف نے کتنا دخل پالیا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

”دیکھا اس جہاں جہاں آرا کو کہ مانند لہر منور اور راہ اور کے برج روضہ مقدس کو روشن کئے ہوئے بیٹھے روتے ہیں اور گوہر غلطاں صدف رخسار آبدار پر بسے ہیں میں دیکھتے ہی اس جہاں باکمال کو تصدق ہو قدموں پر گر کر یہ التماس کیا کہ حضرت حق تعالیٰ نے میری یہ مراد دی جو پیشانی ان قدموں پر پڑی و جو انداز دکن میں آخر آخر میں پیدا ہوا چلا تھا اس نے اس دور میں ترقی کر کے کس طرح رفتہ رفتہ پرانے دوروں کی نشا



سادگی اور خوبصورتی کو کم کر دیا اور زبان کس طرح آہستہ آہستہ تکلف تھنن نیز قافیہ ردیف اور وزن کی بھول بھلیوں میں پھنس گئی لیکن اسے زبان کا عیب نہیں کہا جاسکتا اپنی ترقی کے اعتبار سے زبان مختلف حالتوں سے گذرتی ہے۔ ابتداً جب زبان بالکل بچپن میں ہوتی ہے تو صرف بل بال کے قابل سرمایہ موجود ہوتا ہے اور اسی نسبت سے زبان میں بچپن کی سادگی باقی رہتی ہے۔ اسلوب بیان سیدھا سادہ عام فہم ہو سکتا ہے لیکن زبان کی ترقی کے لئے الفاظ، استعارات اور تشبیہات، نئی نئی اصطلاحیں اور رنگ و رنگ کے اسلوب بیان درکار ہوتے ہیں۔ اور جب تک یہ چیزیں پیدا نہ ہوں زبان آگے نہیں بڑھ سکتی ہر زبان کی ترقی میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب ان چیزوں کا سرمایہ بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو جب یہ سرمایہ فراہم ہو جاتا ہے تو اس کی مدد سے زبان اس قابل ہوتی ہے کہ روزمرہ کی گفتگو سے لڑکر زیادہ وقیع اور دلچسپ مباحث کو ادا کر سکے جن متقدمین نے نئی نئی جدتوں سے ہماری زبان کے لئے الفاظ، استعارات، تشبیہات و کنایات اور ترکیبوں کا بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے ان کا نظم و اثر رد و پر بہت بڑا احسان ہے۔ یہ دراصل ہمیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو میں وسعت پیدا ہوئی اور آئندہ ترقی کی راہ کھلی۔

اس دور کے دوسرے مصنفین میں محمد حسن کلیم عطا تحسین، سودا، شاہ عبد القادر، انشا اللہ خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں عطا تحسین کی نو طرز مصرع (چار رویش) امر ناسودا کا دیا چہ، شاہ عبد القادر کا ترجمہ کلام پاک اور انشا اللہ خاں کی دریائے لطافت اور رانی لیکنی کی کامیابی اور دوش کی مشہور اور مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ مرزا سودا بھی اپنی مخصوص طرز عبارت کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی زبان کا نمونہ ان کا خود نوشتہ دیا چہ ہے جو ان کی کلیات کے ساتھ شامل ہے۔ اس کا نہ تصنیف سنہ ۱۲۶۶ھ ہے۔

ضمیمہ نمبر پچائینہ داران سنی کے مہر جن ہو کہ محض حمایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامۂ و زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے کہ تخیل سخن سامعہ بجان روزگار و دگر دوز تا زبانی ان اشخاص کی ہیئتہ مورد تحسین و آفریں رہوں ۴

دوسرا نمونہ :-

یعنی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گو بہر سخن ماضی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مٹھل گوتی دقیقہ سخی کا نام رہا ہے اور سد امر غرضی عرش آشیان گرفتار دام رہا ہے۔ باوجود اس کے قول خدا صفا دے ماکہ نہ پوئل کیا ہے بلکہ تمام عالم کے سخن انصاف پر تلمذائے گوش دیا ہے ۴

مبارت میں رنگینی، مختلف اور تصنع کے علاوہ کس طرح فارسی اور عربی الفاظ جن میں سے بعض تو بچیدار و بکثرت استعمال کئے گئے ہیں جیسے پیچیدہ، پر تصنع اور متغی میں۔ زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اس میں بالکل نہیں مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے ملبوس ہے۔ ایسی عبارت صرف موزوں نہ ہونے کی وجہ سے شرکی جا سکتی ہو ورنہ اس میں اور نظم میں کوئی فرق نہیں۔ اور طبیعت کی دقت اور کھل پندی نے کس طرح عبارت کو دقیق اور شکل بنا کر رکھا انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت داگر چہ فارسی میں ہے لیکن اردو شعر کے بکثرت مضمون اس میں ملتے ہیں، اردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم تصنیف ہے اس میں اس حمد کے اردو بولنے والوں کے مختلف طبقوں کی بویوں کا بہت اچھا نمونہ فراہم کیا گیا ہے جس سے اس حمد کی سانی حالت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ مختلف رسم و رواج اور مسمی بول چال، ضرب الامثال اور ادبی کھنڈ کی زبان کا نیز مترکات قدیم و مختلف ملکوں کی زبانوں کا وہلی اور لکھنوی میں شامل ہونے کا اثر دکھایا ہے مثلاً انشاء اللہ خاں اور مرزا منظر کی گفتگو کا جو نمونہ دیا گیا ہے وہ اس حمد کے پڑے کئے شعر فارسی کی زبان ہے انشاء اللہ خاں کہتے ہیں۔

”ابتداء سن و سال سے تا اوائل ربیعان اور اوائل ربیعان سے تا الان اشتیاق بالاطلاق یقبل  
اتمام علیہ نہ محضے تھا کہ تحریر و تقریر میں نظم ہو سکے لہذا بے واسطہ وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔“

اس کا جواب مرزا منظر دیتے ہیں:-

”اچھے تئیں کون بھی۔ دُور سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجاہست رہا کی جو“

لیکن بی زور کی گفتگو بالکل مختلف ہے

”اچھی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلی میں آتے تھے۔ دود و پھر رات ٹھک بیٹھے تو

اور ریتین پڑھتے تھے لکھنوی میں نہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھائے۔ اب کے کر بلا

میں کتنا افسوس آئیں تمہارا اثر معلوم نہیں ہوا۔“

اس دور کی دوسری مشہور کتاب فوط زمر صحت ہے۔ جس کو عطا حسین خاں تمکین نے امیر خسرو کے قصہ

چار درویش سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۹۹ھ ہے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کے حمد

میں کھل ہوئی جن کی تعریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے آخر میں دیا ہوا ہے۔ فوط زمر صحت کی عبارت نہایت

پڑچکلف رنگین اور فارسی اور عربی الفاظ سے ملوے ہیں وہ ہر گوئی کہ اس کی شکل اور وقت عبارت کہ دیکھ کر ڈاکٹر گلگرسٹ نے قصہ چار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ باغ و بہار کے نام سے میرامن سے کرایا۔

تیسرے دور کی اردو شہریتہ [اس دور کی تصانیف کی آخری کڑی عطاحسین خاں تحسین کی "نوطرزمع" ہے اور اس پر یہ فہرست ختم ہو جاتی ہے۔ ان کتابوں کا تعلق ادب یعنی قصص و حکایات یا مذہب سے ہے۔ اس وقت تک تاریخ سوانح عمری، اخلاق و معاشرت وغیرہ سنجیدہ اور قبیح موضوعات پر ایک کتاب بھی نہیں لکھی گئی۔ اس دور میں فضلی کی، مجلس سے لے کر تحسین کی نوطرزمع تک سب کا قریب قریب ایک طرز تحریر ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ فارسی ہر جگہ اردو پر جاری ہے۔ فارسی الفاظ جن میں سے بعض تو بیک وقت اور نامائوس میں بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ فارسی کی تقلید میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ اکثر صورتوں میں قافیہ اور ردیف کا التزام رکھا گیا ہے۔ غرض کہ ساری عبارت محض تصنع اور آرد و پردہ پر مبنی ہے۔ عبارت میں سادگی اور بے ساختہ پن اس دور میں نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے اکثر بغیر ایسا ہوا ہے کہ خیال شاندار اور پڑچکلف الفاظ کے گورکھ دھندوں میں لپکا لپکا کر رہ جاتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں کو الجھن محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور یہ پڑچکلف اور پڑتصنع طرز تحریر اردو میں عرصہ تک مقبول رہا۔

اس دور میں پہلے دور سے اتنی ترقی ضرور نظر آتی ہے کہ فارسی کا اسلوب بیان اختیار کرنے کی وجہ سے اردو اسلوب بیان میں بھی وسعت پیدا ہو چکی۔ نئے الفاظ جو فارسی اور عربی سے مستعار لئے گئے، انہوں نے اگر ایک طرف تکلف اور تصنع کو دعوت دی تو دوسری طرف ان سے اردو کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ بھی ہوا۔ اور اس طرح زبان کی ترقی کا ایک بڑا مرحلہ طے ہو گیا۔ اسی نے زبان کو اس قابل کیا کہ روزمرہ کی بول چال اور عام گفتگو یا سیدھے سادے مذہبی مسائل اور احکامات کی تصانیف سے گذر کر تخیلی اور زیادہ وسیع مباحث کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔

فارسیت کے اثر کا سبب یہ تھا کہ دربار کی زبان اب بھی فارسی تھی۔ بڑے بڑے مصنفین کی تالیفات و تصنیفات کا سلسلہ فارسی زبان ہی میں تھا جن لوگوں نے اردو کی طرف توجہ کی وہ بھی اپنی قابلیت اور علمیت کی دھاک فارسی دانی کا اظہار کر کے کرنا چاہتے تھے۔ اور اس دور تک جس کی عبارت تہی مکمل، دقیق اور پیچیدہ ہوتی آتا ہی اس کی علمیت کا اعتراف کیا جاتا۔

محمد عرفان خاں صاحب جاسمی

(باقی آئندہ)

# آج کی دنیا

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج  
وہ سر اٹھائے موج فنا آ رہی ہے آج  
کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج  
چپک رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر  
ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چلے  
یکسر جانِ سخن بھی بدلا ہوا سا ہے  
ہر ہر شکست ساز میں صد سخن سردی  
یا زندگی دہر تھی سو گند موت کی  
یہ دامن اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے  
بنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز  
افلاک کی جبین بھی شکن و شکن سی ہے  
پھر چھپتی ہے موت حیاتِ فسرودہ کو  
برہم سا کچھ مزاجِ غنا ضر ہے ان دنوں  
اک موج دو دسینے میں لرزاں ہے اس طرح

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج  
موج حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج  
ہر چیز کائنات کی تھرا رہی ہے آج  
کون و مکان کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج  
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج  
دنیا نے عشق اور نفرت آ رہی ہے آج  
یا زندگی کے گیت اجل گارہی ہے آج  
یا موت زندگی کی قسم کھا رہی ہے آج  
کیا شے ہو ائے دہر کو ننگ رہی ہے آج  
جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج  
تیوری زمین کی بھی چڑی جا رہی ہے آج  
پھر آتشِ خموش کو اکسا رہی ہے آج  
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج  
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے تجلوں کی چھاؤں ہے امر و پرفراق

ہر چیز اک نسا نہ ہوئی جا رہی ہے آج

(فراق گورکھپوری)

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**متاع اقبال** ۱۔ از ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم۔ اسے مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن قیمت عمر سائز ۳۰×۳۶ صفحات ۱۰۰ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

زیر نظر کتاب مصنف کے تین مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسالوں میں ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں چھپے تھے۔ مضامین کے عنوان یہ ہیں۔ ”اقبال کی شاعری اور اس کا پس منظر“۔ ”اقبال کا ذہنی ارتقاء اور اقبال کا شاعر فلسفہ“ چونکہ یہ مختلف موقعوں پر لکھے گئے تھے اس لئے تینوں مضامین میں بہت سی باتیں مشترک ملتی ہیں مثلاً اقبال کا یورپ جانا اور وہاں ان کا وطنیت کے تخیل سے برگشتہ ہو جانا۔ اس بات کو تینوں مضامین میں دہرایا گیا ہے۔ غالباً جب مضامین لکھے گئے تو یہ خیال نہ تھا کہ یہ مضامین ایک ساتھ چھاپ دئے جائیں گے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں دہرائی ہوئی ملتی ہیں۔ ویسے جہاں تک اقبال کے سمجھنے اور سمجھانے کا تعلق ہے مصنف نے بڑے مدلل اسلوب میں اقبال کے نظریات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں اسید ہے ابو ظفر صاحب تینوں مضامین کو ایک کر دیں گے تاکہ وہ نقص جو تکرار سے پیدا ہو گیا ہے دور ہو سکے پاکستان اور ہندوستان وہ مرتبہ عبدالقدوس ہاشمی دارالاشاعت سیاسیہ اشاہدہ عثمانی حیدرآباد دکن سائز ۳۰×۳۶ صفحات ۳۲۶ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ قیمت مجلد عام

زیر نظر کتاب پاکستان کے مسئلے پر ایک مفصل مالیف ہے اس ایکٹیم کی موافقت میں جتنے مضامین اور صد ارتقی خطبے مختلف پرچوں اور رسالوں میں اس موضوع پر نکلی چکے ہیں وہ بھی جمع کر دیئے گئے ہیں بعض جگہ اعتراضات کے جواب میں طرز تحریر ذرا جذباتی ہو گیا ہے ورنہ دیئے اپنے موضوع کا بہت اچھا احاطہ ہے۔ اگر ایک دو نقشے بھی شامل کر دیئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ اسید ہے کہ دارالاشاعت اسی طرح سیاسی علم کو عام بنانے کے لئے دیگر مفید کتابیں پیش کرے گی۔

نازو۔ اردو کے نوجوان اور ہونہار افسانہ نگار اختر انصاری کے مختصر افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل ۱۲ افسانے ہیں اور سب سب اختر انصاری کے طرز نگارش کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں سے کوئی تو صرف کسی مخصوص سیرت کا مطالعہ ہے۔ اور کوئی زندگی کے کسی مختصر اور محدود پہلو کی مصوری کسی میں محبت اور رومان ہے اور کسی میں صرف شاعری۔ یہ افسانے مختلف قسم کے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک جیتی جاگتی زندگی کی تصویر ہے۔ سیرت، نفسیات، مشاہدہ، محبت، رومان اور شاعری کوئی چیز زندگی سے الگ رہ کر با معنی نہیں رہتی اور اختر انصاری اس چیز کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

نازک کے تقریباً سب افسانے دلچسپ ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اختر انصاری اپنے افسانوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ان میں شروع ہی سے *deeper* کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا ہر قدم پر یہی سوچتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ اور اس کا تصور افسانے کے انجام کی تصویریں بناتا ہے وہ یقیناً اس تصویر کے مختلف ہوتی ہیں جو افسانہ نگار کے ذہن میں تھی اختر انصاری کے افسانے جذبات انسانی کی کشمکشوں کی بڑی چھٹی تصویر ہیں وہ ایک شاعرانہ دل کی کیفیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ الباطل جس کے خیالات میں ناز اور بیان میں زور ہے۔ یہ افسانے مکینہ جہاں ناؤ پہلے نے شائع کئے ہیں۔ کتاب جلد ہے ٹائٹل خوش نما اور دیدہ زیب بھائی چھاپی بھی اچھی ہے اور اس لحاظ سے ان افسانوں کی قیمت ایک روپیہ (عمر) درست ہے۔

سرگزشت ادارہ ادبیات اردو۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد، سب رس کتاب گھر، رفعت منزل خیریت آباد، حیدر آباد دکن، ساؤتھ ویسٹ ۱۶ صفحات ۳۰۴ قیمت ۱۲ روکا غذا کتابت اور طباعت عمدہ یہ سرگزشت ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کی دس سالہ رپورٹ ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں قائم

ہوا تھا مقاصد یہ تھے کہ اردو زبان اور ادب کی توسیع اور حفاظت کے ساتھ دکن کے نوجوانوں میں انتشار و ازمی، شاعری اور تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کر کے ساتھ ہی عوام میں اردو کے مطالعہ کا شوق تازہ کر دینا دکن کی خدمت اور ایک کتب خانہ کا قیام وغیرہ تھے۔ خوشی کا مقام ہے کہ یہ دس سال سے بڑی متعدی سے اپنے کاموں کو انجام دیتا رہا ہے۔ تقریباً ہر موضوع پر بیشتر مفید اور کمتر غیر مفید کتابیں چھاپی ہیں۔ ادارہ کی وسعت کا رکاز اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ نہ صرف مختلف مضامین پر تالیفات و تصانیف پیش کرتا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی تعلیم و امتحانات بھی لیتا ہے۔ ایک کتب خانہ بھی قائم ہے۔ ایک رسالہ سب رس کے نام سے نکلتا ہے جس میں مختلف مذاقوں کے لئے مختلف قسم کا سامان دلچسپی پیش کیا جاتا ہے علمی ناٹشیں بھی کرتا ہے اور دکن کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں بھی قائم ہیں۔

غرض کہ ادارہ بڑے مفید کام کر رہا ہے۔ نوجوانانِ دکن اس مفید کارکردگی پر یقیناً لائقِ صدا فرما رہے ہیں۔ آخر میں اتنا ضرور عرض ہے کہ ادارہ بحیثیت مجموعی ادب اور شاعری پر زور زیادہ دیتا ہے۔ اگر یہی اہمیت سائنس اور دیگر مفید علوم کو دی جائے تو ملک کا زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ نیز ادبیات میں ابھی اچھے تراجم کی کمی ہے۔ امید ہے کہ ادارہ آئندہ اس کی کو بھی دور کر دے گا۔

نقشِ ناتمام :- از سحر رامپوری ملنے کا پتہ مرزا عباس علی بیگ۔ باغچہ نازی مظفر خاں ریاست رامپور  
سائز ۲۰x۲۰ صفحات ۶۶ قیمت ۶ روکا غذا کتابت اور طباعت عمدہ

یہ سحر رامپوری کی نظمیں اور غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے سحر صاحب رامپور کے نوجوان شاعروں میں سے ہیں اور چٹ کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی اکثر نظمیں اور اکثر غزلوں میں کسک ہے۔ ”اے دل“ مغربِ نوجوان، حسنِ اقیان، استہلالِ بہار، آج ابھی نظمیں ہیں۔ لیکن ابھی سحر صاحب کے نقوشِ ناتمام ہیں پھر بھی در در کہنے والوں کو ان کے کلام میں ایک دروہری روح ملے گی۔

السیرۃ الخثیث فی تاریخِ تدوین الحدیث :- کئی سال سے دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ملک کے نام آور علماء کو دعوت دیتی ہے کہ اپنی علمی تحقیقات کو مقالات کی صورت میں ادارہ کے طلبہ میں پیش کریں۔ جولائی ۱۳۷۷ء میں جو اجتماع ہوا اس میں مولانا سید محمد سلیمان ندوی اور مولانا عبدالحق عزمیہ (صدر شعبہ عربی سلم یونیورسٹی) نے جہاں اپنے مقالے عربی زبان میں لکھ کر پیش کئے۔ ڈاکٹر محمد زہیر صاحب (صدر اسلامیات جامعہ کلکتہ) نے اپنا مقالہ اردو میں پیش کیا۔ موصوف کا یہ مقالہ ان کی ایک انگریزی کتاب کا ایک حصہ اور اس کا اردو ترجمہ تھا۔ اب موصوف نے اس اردو ترجمہ کو عربی لباس، پہنایا ہے اور دائرۃ المعارف کی طرف سے چھاپا گیا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ میں حدیثِ نبوی کی تدوین پر نظر ڈالی گئی ہے۔

ہیں اس کا اعتراف ہے کہ موصوف کی روشن فکر کی توجہ سے اس بحث کے بعض اہم پہلو روشنی میں آگئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہیں کہیں موصوف کی یہ علمی کاوش ڈاکٹر اہرنگر اور ڈاکٹر گوئلزیر کی ریسرچ کی ترجمہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہیں موصوف سے مستشرقین کی تحقیقات پر مفصل نقد کی آرزو تھی جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔

# طلبا کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب

ہندوستانی مدرسوں میں اگر طالب علم ناکامیاب ہو جائے یا مختلف مضامین میں کمزور رہتا ہو تو سرپرست اور والدین کی فوراً یہ رائے ہوتی ہے کہ مدرسہ کی پڑھائی اچھی نہیں ہے۔ اساتذہ توجہ سے نہیں پڑھاتے اور اساتذہ یہ جواب دیتے ہیں کہ طالب علم کا داغ اچھا نہیں ہے، کند ذہن ہے، محنت نہیں کرتا اس لئے فیل ہو گیا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ دونوں طالب علم کی کمزوری کے اسباب پر غور نہیں کرتے اور اگر غور کرتے ہیں تو اس کو اتنا ہم خیال نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو مورد الزام قرار دیتے ہیں اپنی اپنی کہتے ہیں اور طالب علم کا خیال نہیں کرتے اساتذہ یہ کہتا ہے کہ ہاں کمزوری کے اسباب یہ ہیں۔ لیکن چالیس پینتالیس لڑکوں کی جماعت میں اس مسئلہ کے حل کی کیا صورت نکالی جاسکتی ہے جبکہ ہم صرف چالیس پینتالیس منٹ کے لئے جماعت میں جاتے ہیں سرپرست کہتے ہیں کہ مجھے خود فرصت نہیں اب تو آپ ہی کے حوالہ کر دیا ہے آپ جو چاہیں کریں۔ لہذا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کے تعاون بغیر طالب گرتا پڑتا تعلیم تو پالیتا ہے لیکن اُس کی بھیجی ہوئی قوتوں کے ابھرنے اور تربیت پانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ طلبا کی تعلیم کا معیار ہر اعتبار سے پست رہتا ہے۔

کمزوری کی سب سے بڑی وجہ مدرسہ سے غیر جاضری ہے جو طلبا مدرسہ آنے میں پابندی نہیں کرتے وہ اپنی ذہانت اور ذکاوت کے باوجود بھی اُس معیار سے نیچے رہتے ہیں جو ان کا پابندی سے حاضر رہنے کی صورت میں ہوتا اور کم ذہین اور کم محنت کرنے والے طلبا تو بہت پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اپنا ناقابل تلافی نقصان کرتے ہیں۔ مدرسہ سے غیر جاضری کی کئی صورتیں ہوتی ہیں بعض طلبا کو مدرسین سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے یا شکایت نہ ہو لیکن ان کے دل میں یہ خیال کسی طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ فلاں استاد سخت ہے اور یوں وہ مدرسہ جانے سے گھبراتے ہیں اور بجائے مدرسہ جانے کے ادھر ادھر چلے جاتے ہیں یا معمولی سا باہر کے گھر پر ہی پڑ رہتے ہیں اس کو عرف عام میں مدرسہ سے بھاگنا بھی کہتے ہیں۔ یہ عمل سخت سزا کے خوف سے بھی ہونے لگتا ہے اس صورت حال کی ذمہ داری مدرسین پر ہوتی ہے وہ طلبا سے محبت سے پیش نہیں آتے اور ان کی سختی



طلبا کو بھاگنے پر مجبور کرتی ہے یا جو کام وہ طلبا کو دیتے ہیں اس کا مطالعہ وہ سختی سے کرتے ہیں کہ طلبا مدرسہ نہ آنا ہی پسند کرتے ہیں بعض طلبا اس لیے بھی مدرسہ نہیں آتے کہ ان کو مدرسہ آنے میں کچھ دیر ہو جاتی ہے۔ اور مدرسہ میں دیر سے آنے پر باز پرس ہوتی ہے یا سزا ملتی ہے لہذا باز پرس اور سزا کے خوف سے مدرسہ سے غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور بجائے ایک گھنٹہ کے نقصان کے تمام دن کی پڑھائی کا نقصان کرتے ہیں۔ مدرسوں میں ایسے طلبا بھی ہوتے ہیں کہ باز پرس نہ کرنے والے اور بہت کم سزا دینے والے استادوں کے گھنٹوں میں حاضر رہتے ہیں اور سخت استادوں کے گھنٹوں سے بھاگ جاتے ہیں یا جھپی لے کر چلے جاتے ہیں اس طرح اس پڑھائی سے محروم رہتے ہیں جو ان گھنٹوں میں ہوتی ہے۔ یہ وہ تمام صورتیں ہیں جن میں مدرسین اور مدرسہ کے ڈسپلن کی وجہ سے طلبا مدرسہ نہیں آتے۔ مدرسہ کے ڈسپلن میں ہمیشہ لوچ ہونا چاہئے۔ یہ ڈسپلن فوجی ڈسپلن کی طرح بالکل حتمی نہ ہونا چاہئے طلبا کو اس کا تو بالکل یقین ہی نہ ہونا چاہئے کہ اگر میں کام کر کے نہ لے جاؤں گا یا دیر سے مدرسہ پہنچوں گا تو بس سزا ہی سے دوچار ہونا پڑے گا یا سخت باز پرس ہوگی ہاں آپ یہ خیال ضرور پیدا کر دیں کہ اگر کام نہیں کیا، سامان درست نہ رکھا یا دیر سے مدرسہ پہنچا تو سزا بھی مل سکتی ہے۔ مدرسہ کے ڈسپلن میں تدریج کا خیال ہونا چاہئے۔ کیوں نہ آپ طالب علم کو سمجھائیں، دوسروں کی مثالیں دیں، فائدہ جتلائیں، سرپرستوں کو کمپن سرپرستوں سے ملیں خفا ہو جائیں اور اس قسم کی سینکڑوں تدریجی صورتیں اختیار کریں اور جہاں تک ممکن ہو سزا دینے سے پرہیز کریں۔ طالب علم پر یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیں کہ آپ سخت مزاج ہیں۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ طالب علم کو سرپرستوں نے شادی بیاہ کوئی نجی کام یا سفر وغیرہ پر لے جانے کی غرض سے مدرسہ جانے سے روک دیا ہو۔ آخری وجہ خود طالب علم کی عیالیت ہے۔ گھر پر کسی کام سے روکنے میں سرپرست اور والدین بہت کم ذمہ داری محسوس کرتے ہیں وہ پوری طرح غیر حاضری کے نقصانات کی اہمیت نہیں سمجھتے اور ایک ایک دو دو دن کی رخصت کی درخواستوں سے لے کر دو دو مہینوں تک کی رخصت کی درخواستیں دیتے ہیں جو بچے پہلی اور دوسری جماعتوں میں پڑھتے ہیں وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنی ننھیال چلے جاتے ہیں اور جب تک بچے کی والدہ میکے سے واپس نہیں آتی ہیں بچہ مدرسہ سے غیر حاضر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح اس کی ابتدائی تعلیم میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ وہ نقصان ہے جس کا بچہ کو سخت خمیازہ اٹھانا

پڑتا ہے یعنی وہ نفل ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے پچھڑ جاتا ہے۔ اس میں اپنی کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ آگے کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی سرپرست بچوں کو چار پانچ دن کے لئے روک لیتے ہیں اور اگر شادی بیاہ وطن سے دور کسی دوسری جگہ ہوتے ہیں تو دو دو ہفتے بچے نہیں آتے۔ اس قسم کی طویل غیر حاضریوں کے بعد جب طلباء مدرسہ آتے ہیں تو ایک دو ہفتے تو وہ جماعت میں بالکل اجنبی رہتے ہیں اس کے بعد پھر کہیں جا کر جماعت کی تعلیم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر گھر پر کسی کی مدد حاصل ہو گئی یا ذہین ہوئے تو ایک حد تک یکمزدوری دور ہو گئی ورنہ یہ کمزوری برابر ساتھ دیتی رہتی ہے

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی فضا میں جبکہ تعلیم میں نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس اہم کام کی ذمہ داری بھی استاد ہی کو لیننی چاہئے۔ ایک طرف تو اسے اپنا طریقہ تعلیم دلچسپ بنانا چاہئے کہ طلباء خود بخود مدرسہ آنے کے لئے بے چین ہو جائیں اور گھر پر رد کے نہ کریں۔ دوسری طرف استاد ہر غیر حاضر ہونے والے طالب علم کے سرپرست اور والدین سے ملے اور انہیں بتلائے کہ بچہ کی غیر حاضری سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔ مدرسہ میں حاضری کا جتنا مدرسہ میں مختلف دلچسپ کام اور کھیل اور استاد کا بہتر سلوک مدرسہ کی حاضری کو بہت زیادہ بڑھا سکتے ہیں۔ مدرسین اپنے کام کو اس طرح ترتیب دیں کہ طلباء گھر سے زیادہ مدرسہ میں دلچسپی لینے لگیں وہ مدرسہ کے بعد اور تعطیلات میں بھی خوشی سے مدرسہ آئیں اور مدرسہ میں کام کریں۔ آپ مدرسہ اور طلباء میں ایک گہرا لگاؤ پیدا کر دیں۔

مختلف بیماریاں بھی بچوں کی تعلیمی کمزوری کا سبب ہوتی ہیں۔ اس میں والدین، سرپرستوں اور استادوں کی نگرانی کی کمی ہوتی ہے۔ اکثر بچے صرف اس لئے بیمار ہوتے ہیں کہ وہ گھر کا کچا ہوا تازہ اور اچھا کھانا نہیں کھاتے بلکہ بازار سے مختلف قسم کی مٹھائیاں اور چٹوٹی چیزیں خرید کر کھاتے رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سستی، سرکے درد اور ہیٹ کے درد کے دائمی مریض بن جاتے ہیں۔ سستی اور درد کی وجہ سے پڑوسائی کے دوران میں ان کی توجہ ادھر ادھر ہوتی رہتی ہے اور جو کچا استاد سمجھتا ہے وہ پورے طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا اور اس طرح گو وہ جماعت میں موجود رہتے ہیں لیکن ان کا ذہن جماعت سے باہر ہوتا ہے۔ بچے بے احتیاطی کی وجہ سے کبھی کبھی سردی اور کوکھا بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ چھوٹ سیاحت کی وجہ سے جس کا وہ مطلق خیال نہیں کرتے کئی

بیاریاں لاحق ہو جاتی ہیں لیکن زیادہ بچے بار بار کھانے اور نا وقت کھانے سے بیمار ہوتے ہیں۔ مدرسہ پر اس سلسلہ میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مدرسوں میں بچوں کی دوکان کا انتظام کرے جہاں سے بچے صاف ستھری کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ دوسری چیز بچوں کا شفا خانہ ہونا چاہئے جس میں اس قسم کے مرض کی دوا یا موجود رہیں بچوں کی دوکان اور شفا خانہ میں بچے ہی کام کریں اور اس طرح ایک طرف لین دین سیکھیں اور دوسری طرف شفا خانہ سے وابستہ رہ کر صحت اور صفائی کے متعلق عملی طور پر سیکھیں۔ مدرسہ میں مکمل اور ورزش کے انتظام سے بھی بچوں کی صحت پر نمایاں اثر پڑتا ہے لیکن مکمل اس طرح کھلانے جائیں کہ تمام بچے حصہ لے سکیں اور ورزش اس طرح کرائی جائے کہ بچے جہنہ محسوس کریں۔

غیر حاضری اور بیماری کے علاوہ بچوں کے پاس لکھنے پڑھنے کا پورا سامان موجود نہ ہونا بھی بہت بڑی کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک طالب علم سال کے دوران میں صرف دو ایک دفعہ بیمار ہوا ہو اور دوسری وجوہات کی بنا پر بھی وہ غیر حاضر نہ ہوا ہو لیکن دوا اپنا سامان مکمل نہ رکھتا ہو اس لئے کمزور ہو بعض بچوں میں سامان کھو دینے کی عادت ہوتی ہے یا وہ گھر سے سامان لانا بھول جاتے ہیں یا وہ مدرسہ میں سامان رکھتے ہیں اور ڈسک کی چابی لانا بھول جاتے ہیں یا ان کا سامان مدرسہ میں کوئی چرا لیتا ہے اور وہ اپنے والدین اور سرپرستوں سے دوبارہ سامان طلب کرنے کی جرات نہیں رکھتے اس لئے کہ شاید سزا سے دوچار ہونا پڑے۔ لہذا ان تمام صورتوں میں سامان کی غیر موجودگی کی وجہ سے طالب علم کا تعلیمی نقصان ہوتا رہتا ہے بعض سرپرست بچوں کو سامان دلانے میں بہت لاپرواہی کرتے ہیں اور اس طرح بھی بچوں کا نقصان ہوتا رہتا ہے بعض بچوں کو سامان کھوڑا تھوڑا ملتا ہے یعنی پورا سامان ان کے والدین یا سرپرست بیک وقت خرید کر نہیں دیتے کچھ بچے ان بیسوں کی جن سے انھیں سامان خریدا ہے کھانے پینے کی چیزیں خرید لیتے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان نہیں خریدتے جس سے پڑھائی کا برابر نقصان ہوتا رہتا ہے۔ اکثر سرپرست طلباء کی بات کا یقین نہیں کرتے کہ واقعی طالب علم کو مدرسہ میں فلاں چیز کی ضرورت ہے اور اس لئے چیزوں کی خریداری کے لئے قیمت نہیں دیتے کچھ لوگ ملازمین کے ذریعہ طلباء کو چیزیں خریدواتے ہیں جو وقت پر بچوں کو چیزیں خرید کر نہیں دیتے۔ اس معاملہ میں مدرسہ کو رہنمائی اور مدد کرنی چاہئے۔ مدرسہ ہر جماعت میں تعداد طلباء کے مطابق

دوات قلم اور نیپل اور بادامی کاغذ کا انتظام کر دے۔ اس لئے کہ بعض مرتبہ اس معمولی سامان کے نہ ہونے سے طلبہ کا بہت نقصان ہوتا ہے جو ضروری باتیں استاد طلبہ کو لکھنا چاہتا ہے وہ ان چیزوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے رہ جاتی ہیں۔ اور صرف طالب علم اپنی سستی کی وجہ سے اسے کسی دوسرے طالب علم کی کاپی سے نقل کرنا بول جاتا ہے۔ جہاں قلم کے واسطے سے لکھائی کا کام ہوتا ہے وہاں طلبہ کے قلم روز ٹوٹے ہوئے اور بغیر بنے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے ان کے تعلیمی نقصانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر جماعت میں بنے ہوئے قلم موجود ہونے چاہئیں اور جب لکھائی کا کام شروع ہو تو جن طلبہ کے پاس قلم نہ ہوں یا بغیر بنے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ہوں ان سے ان کے قلم لے لئے جائیں اور ان کو بنا ہوا قلم دے دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ آپ طلبہ کا قلم بنانے میں وقت ضائع کریں۔ آہنی قلم میں بھی اس قسم کی دقتیں ہوتی ہیں۔ اکثر طلبہ اپنا قلم اپنی شیروانی یا کوٹ کے اوپر کی جیب میں رکھتے ہیں۔ اب جاں کیں وہ جیکے تو ان کا یہ قلم بھی گرا اور گرنے سے اس کی تباہی ہو گئی۔ لہذا ان تمام دقتوں کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ مدرسہ قلموں کا انتظام کرے۔ مدرسوں میں ایسا انتظام بھی ہو سکتا ہے کہ ہر بچے کا حساب بچوں کی دوکان میں کھول دیا جائے اور تھوڑی رقم ان کے کھاتہ میں جمع کر لی جائے تاکہ جب ان کے پاس کوئی سامان نہ ہو تو وہ اپنے حساب میں سے اسی دن خرید سکیں جس دن ان کو ضرورت ہو۔

بچوں کی تعلیمی حالت پر ان کے ماحول کا بھی اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان ایسے ملک میں اچھے تعلیمی ماحول کی بہت کمی ہے بلکہ بچوں کو اپنا چاہئے یہ ماحول بیشتر حالات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ طلبہ کے آس پاس اکثر ایسے بچے ہوتے ہیں جن کا بیشتر وقت کھیل کود اور بیہودہ مذاق میں گذرتا ہے اور جن کی تعلیم کا کہیں انتظام نہیں ہوتا۔ مدرسہ میں پڑھنے والے بچوں کا بھی تمام وقت انھیں بچوں کے ساتھ گذر جاتا ہے اور اس طرح تعلیم انھیں یکسوئی اور دل چسپی حاصل نہیں ہوتی جو ایک تعلیمی ماحول میں حاصل ہو سکتی تھی جب طلبہ بیٹھ کر مدرسہ کا کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنا بھی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آس پاس کے بچوں کا کھیل کود اور شور و شغب انھیں اس تعلیمی کام سے کھیل کود کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور متواتر ایسا ہونے سے وہ تعلیم سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔

اکثر گھروں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ نہ والدین نہ سرپرست۔ اگر طالب علم کو اپنی پڑھائی اور اپنے کام میں کوئی دقت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس کے متعلق کسی سے دریافت نہیں کر سکتا۔ اپنی وقت کو دو نہیں

کر سکتا اور جب ان کی وقت ریف نہیں ہوتی تو قدرِ زمان کو مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں چند ہی بچے آگے بڑھتے ہیں اور باقی دوچار سفل پر ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اکثر گھروں میں بچوں کو اپنے گھر کا بھی کام کرنا پڑتا ہے اور بازار سے سودا سلف لانے کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی بن کو بھی کھلاتے ہیں اور یوں آزادی سے اپنا مطالعہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ پھر بعض گھروں میں اس قدر شور و غل ہوتا ہے کہ طلباء کو سکول سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا یہ چند گھروں کے نمونے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں کم و بیش اسی قسم کے حالات نظر آتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسی مجبوریات ہیں جن کا علاج ان حالات میں بالکل نامکن سامعہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈسٹرک بورڈ اور سبڈیو کے چند اسکولوں کی اونچی جماعتوں میں طلباء کو صبح بلا تے ہیں اور دن بھر مدرسہ میں رکھ کر شام کو گھر واپس بھیجتے ہیں گھر کے لئے جتنا کام تجویز کیا جاتا ہے وہ مدرسہ ہی میں کر لیا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے جو مفید نتیجہ حاصل ہوتا ہے یعنی طلباء بری صحبت سے بچے رہتے ہیں اور امتحانوں میں پاس ہو جاتے ہیں۔ وہ اس مضر اثر سے کہیں کم ہے جو اس جبری حاضری سے پیدا ہوتا ہے اس لئے بچے بالکل ڈرپوک ہو جاتے ہیں۔ آزادی فکر کی جگہ امتداد کے خیالات کے ہر وقت محتاج ہو جاتے ہیں ہر کام بلاچوں و چرا اور بلا بچے بوجھ کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذکاوت اپنی ذہانت، اپنی فکر، اپنی بھوج و غمضہ ہر حسین قربان کر دیتے ہیں دراصل یہ ان کے لئے ایسا نظام بن جاتا ہے کہ بس استاد کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کھیلنے تک کے لئے وقت نہیں ملتا۔

جہاں تک مدرسہ کے اوقات سے پہلے اور بعد میں طلباء کے آنے اور کرنے کا تعلق ہے یہ چیز اپنی جگہ بہت اچھی ہے لیکن جن متاعد کے ماتحت بچوں کو بلایا جاتا ہے وہ طریقہ مناسب نہیں ہے بچے مدرسہ کے اوقات سے پیشتر اور بعد میں اگر اپنے شوق سے کوئی تعمیری کام کرنے کے لئے رکیں تو بہت مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں بچے اپنے مقصد اور کام سے مدرسہ آئیں گے اور رک کر کام کریں گے۔ حرمہ اور با مقصد کاموں کے ذریعہ جو مدرسہ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں وہ اپنے بچوں میں اپنے اوقات کو مفید کاموں میں استعمال کرنے کا شوق اور عادت پیدا کر دیتے ہیں وہ بچوں کو بغیر کسی جبر کے مدرسہ میں اور گھر

پر اپنے اوقات کے صحیح استعمال کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔

بچہ کی جسمانی خرابی بھی تعلیم میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ بچہ تندرست ہو، بہت کم بیمار پڑتا ہو لیکن کم سنتا ہو زیادہ فاصلہ سے بورڈ پر لکھی ہوئی باتیں نظر نہ آتی ہوں۔ پڑھنے اور بولنے میں ہکلا تا ہو تو بھی اس میں برابر کمزوری رہے گی۔ جماعت کے چند لڑکوں میں یہ صورتیں ضرور ہوتی ہیں جو استاد ان باتوں کو معلوم نہیں کرتے یا معلوم کر کے توجہ نہیں کرتے اور جماعت کے طلباء کو تعلیم دیتے رہتے ہیں وہ ان بچوں کا بہت نقصان کرتے ہیں۔ استاد یہ خیال کرتا ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ تمام لڑکے سن رہے ہیں یا جو کچھ میں بورڈ پر لکھ رہا ہوں وہ تمام لڑکے دیکھ رہے ہیں حالانکہ چند بچے ایسے ہوتے ہیں جو کم سننے کی وجہ سے اور کم بینائی کی وجہ سے استاد کی تمام باتیں اچھی طرح نہیں سمجھتے اور اس طرح ان کا برابر نقصان ہوتا رہتا ہے اور وہ کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس میں سرپرستوں کا بھی قصور ہے کہ وہ مدرسہ میں بچے کے داخلہ کے وقت مدرسین کو یہ نہیں بتلاتے کہ بچہ میں فلاں فلاں جسمانی خرابی ہے جن بچوں کو سخت طیر یا نایاں لڈ ہو جاتا ہے۔ ان کے دماغ پر بھی ان بیماریوں کی وجہ سے خاص اثر ہوتا ہے ان کی ذہانت اور ذکاوت میں نسبتاً کمی ہو جاتی ہے تقسیم میں ان کی رفتار مدہم پڑ جاتی ہے۔ داخلہ کے وقت مدرسہ کو یہ تمام باتیں سرپرستوں سے دریافت کرنی چاہئے تاکہ پڑھانے والے معلمین بچوں کی ان خرابیوں سے آگاہ ہو سکیں جو بچے کم سنتے ہیں یا بورڈ کی عبارت اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کو بورڈ اور استاد کے قریب بٹھانا چاہئے چٹھر کا انتظام بھی اس وقت کو رفع کر سکتا ہے لیکن ہندوستان ایسے غریب ملک میں بہت کم سرپرست یہ انتظام کر سکتے ہیں اور گاؤں میں تو بالکل ہی نہیں جو لڑکے بولنے اور پڑھنے میں ہکلاتے ہیں یا تو تلتے ہیں ان سے ہمدردی کرنی چاہئے۔ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ دوسرے لڑکے اُس لڑکے کی نقل کر کے اُس کا مذاق نہ اڑائیں۔ اس لئے کہ اس سے ایک طرف دوسرے بچوں میں ہکلا پن پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ہکلانے والے بچوں میں اپنی کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ بولنے سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔

اس قسم کی خرابیاں استادیں بھی ہوتی ہیں اس کا بھی بچوں کی کمزوری پر اثر پڑتا ہے اگر استاد بہت تیز بولنے کا عادی ہے تو پوری جماعت پر اس کا اثر یوگیکا اور لڑکے استاد کی باتوں کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے وہ استاد کو

فصیح و بلیغ تو خیال کرنے لگیں گے لیکن جو باتیں ایسا استاد ان کو سمجھانا چاہے گا اس کو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے گو استاد اپنی جگہ پر ہی خیال کرے گا کہ اس نے ہر بات کو اچھی طرح بچوں کو سمجھایا ہے۔ بعض استاد بہت آہستہ بولتے ہیں۔ اس کا بھی تیز بولنے کی طرح اثر پڑتا ہے گو آگے بیٹھنے والے بچے استاد کی باتیں سمجھ لیتے ہیں لیکن پیچھے بیٹھنے والے لڑکوں کی سمجھ میں استاد کی بات اچھی طرح نہیں آتی۔ استاد بھی پہلے ہوتے ہیں اس سے بچے استاد کی باتیں اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ جو استاد مہلکا کر بولتا ہے اُس سے اولاً بچے اس کی نقل کرتے ہیں دوم ان میں اس کی باتیں سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ جو استاد کم سنتے ہیں وہ اپنی نوکھ لیتے ہیں لیکن شاگردوں کی کم سنتے ہیں۔ استادوں میں ان خرابیوں کا ہونا طلباء کے لئے مستقل مصیبت ہو جاتی ہے۔

۱۔ ہندوستان کے تمام مدرسوں میں بچوں کی کثیر تعداد ایسی ملتی ہے جو کسی نہ کسی قسم کی کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتی ہے یہ وہ احساس ہے جو اکثر بچوں کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ ہندوستانی گھرانوں کی تربیت اور اٹھان ہی اس انداز پر ہوتی ہے کہ بچوں میں شروع سے احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب ان کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنی بے انگلی پر غور کرنے لگتے ہیں اور فوراً کرتے کرتے بالکل دلگیر ہو جاتے ہیں تعلیم میں دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر کوفت اور غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ استاد کی ذرا سی جھڑکی انہیں اپنی اپنی کمتری کا بار بار خیال دلاتی ہے۔ گھروں میں ذرا ذرا سی باتوں پر والدین، سرپرست اور گھر کے دوسرے ممبران کی ہر وقت کی روک ٹوک اور گرفت بچوں کی فطری آزادی اور خوشحالی کو رفتہ رفتہ کم کر دیتی ہے۔ اس سے بچے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گھر کے لوگ ان سے ہمدردی نہیں کرتے اور اس طرح ان میں دلگیری اور احساس کمتری رفتہ رفتہ پیدا ہونے لگتا ہے اور جب بچہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے ساتھ والدین اور دوسروں کو اچھا سلوک کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس میں یہ احساس اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے جن بچوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے انہیں نہ کھانا اچھا لگتا ہے نہ پہنا۔ وہ گھر میں اپنے والدین اور مدرسہ میں استاد کو اپنا ہمدرد خیال نہیں کرتے ہیں مدرسہ جانے اور تعلیم پانے میں وہ نسبتاً کم دلچسپی لیتے ہیں بس والدین کا حکم بجا لاتے ہیں۔ وہ استاد کے لئے ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ اگر مدرسہ میں بھی ایسی فضا ہوئی یعنی مدرسین نے طالب علم کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تو پھر مدرسہ سے بھاگنا ایک فطری فعل ہو جاتا ہے اور اگر مدرسہ اتنے رہے تو تعلیم میں برائے نام دلچسپی

رو جاتی ہے۔ جن بچوں کی والدہ یا والدین دونوں حیات نہیں ہوتے ان میں بہت ناخوشگوار قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا بھر دی کا گھر ہو جاتی ہے۔ ایسے بچوں کے خیالات منتشر ہوتے ہیں ان میں توجہ اور انہماک کی کمی ہوتی ہے وہ زیادہ تر کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ اس لئے جماعت میں جو کچھ تعلیم ہوتی ہے اس کا بہت زیادہ حصہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

احساس کمتری کی تمام پیچیدگیوں اور ان کے نتائج کو اس مختصر مضمون میں قلمبند کرنا بہت مشکل ہے لیکن تعلیم میں یہ تمام پیچیدگیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اساتذہ کے ملامت کلمات ایسے بچوں کی زندگی ہی خراب کر دیں۔ اس لئے ایسے بچوں کی تعلیم کی رہنمائی بڑی ہوشیاری سے کرنا چاہئے۔ انہیں کبھی دیگر نہ ہونے دینا چاہئے۔ ان سے اس طرح پیش آنا چاہئے کہ وہ خوش رہیں۔ ایسا موقع ہی نہ آنے دینا چاہئے کہ وہ فکر مند اور آزرده خاطر ہوں۔ میں سمجھا ہوں کہ ایسے بچوں میں بعض ایسی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن پر گرفت کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہ گرفت ملامت طریقہ سے بھی ہو سکتی ہے اس لئے سخت باز پرس ان میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ ایسے بچوں کے مسئلہ کو ہمیں اپنے خیال کے مطابق نہیں بلکہ اس بچے کے خیال کے مطابق دیکھنا چاہئے۔ اگر اس کا خیال مضربے تو اس کو رفتہ رفتہ تبدیلی کا خواہشمند بنانا چاہئے۔ بری عادتیں رفتہ رفتہ بنتی ہیں اور اگر مناسب طور پر تربیت کی جائے تو رفتہ رفتہ جھوٹ بھی جاتی ہیں اور بعض مرتبہ خود بخود۔

بچوں کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب میں غیر دلچسپ طریقہ تعلیم اور داخلہ کے وقت بچوں کی صحیح جانچ کا نہ ہونا بھی ہیں۔ غیر دلچسپ طریقہ تعلیم میں متاعرض کر دوں گا کہ جو کچھ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا جاتا وہ سب کا سب غیر دلچسپ طریقہ تعلیم ہے اور بے نتیجہ (استفادہ کے اعتبار سے) ہونے کے علاوہ مضربے بھی ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ داغ سدھرتے ہیں نہ ذہن نہ عادات سدھرتی ہیں نہ ہنر۔ ہاں بچوں کی صحیح طریقہ پر جانچ کا نہ ہونا سو بیسی اپنی جگہ پر بہت اہم ہے اور بچوں کو ان کی استطاعت کے مطابق جماعتوں میں نہ رکھنا ان میں بے اعتمادی اور احساس کمتری پیدا کرنا ہے اور عارضی خوشی سے تمام پڑھائی کے سالوں کی کوفت مول لینا ہے بچوں کو اسی جماعت میں داخل کرنا چاہئے جس میں وہ آسانی سے چل سکیں اور اس جماعت کی تمام پڑھائی میں دشواری نہ محسوس کریں۔ اگر ابتدا میں اٹھان اچھی ہے تو آئندہ بھی خوشگوار طریقہ پر تعلیم جاری



رہے گی۔ ورنہ بچہ جماعت میں دبا ہو کر رہ جائے گا اور اس کی تمام صلاحیتوں میں انحطاط ہی انحطاط نظر آئے گا۔  
 مدرسوں میں عام طور سے بچوں کے تبادلے سائٹیفکٹ کے ذریعہ ہوتے ہیں اور جس جماعت سے ایک  
 طالب علم ایک مدرسہ چھوڑ کر جاتا ہے دوسرے مدرسہ میں اسی جماعت میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح  
 ایک مدرسہ کی خامیاں دوسرے مدرسہ میں بھی جاری رہتی ہیں اور اگر طالب علم ایک دواہ بیمار ہو گیا تو  
 اس میں اور زیادہ تعلیمی کمزوریاں پیدا ہو گئیں۔ لہذا دوسری جگہ بچوں کو اچھی طرح امتحان لے کر داخل کرنا  
 چاہئے اور اسے کمزور پودے کی بجائے تندرست پودے کی طرح بڑھنے کا موقع دینا چاہئے۔

# استانی

دونوں لڑکیاں اپنے کمرہ میں تنہا تھیں۔ روشنی گل ہو چکی تھی ہر طرف اندھیرا تھا البتہ دونوں بستروں سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھی۔ لڑکیاں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں جس سے دھوکا ہوتا تھا کہ دوسری ہی ہیں۔ ”بس کتنی ہوں۔ ایک بستر سے بھی لیکن کتنی ہوئی آواز آئی۔ بارہ سالہ لڑکی بول رہی تھی۔

”کیا؟ اس کی بہن نے دریافت کیا۔ جو اس سے ایک سال بڑی تھی۔

”اچھا ہوا تم جگ رہی ہو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا گیا البتہ دوسرے بستر سے اٹھنے کی آواز آئی بڑی لڑکی اٹھی اور منظر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں دھندلی روشنی میں چمک رہی تھیں

”دیکھو میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ..... لیکن پہلے یہ تو بتاؤ کیا تم نے ”مس مین“ میں اس طرف کوئی عجیب بات دیکھی؟

”ہاں۔ دوسری لڑکی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ کوئی بات ضرور ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح زیادہ سختی بھی نہیں کرتیں۔ دونوں سے میں نے اپنا کام نہیں کیا ہے لیکن وہ مجھ پر بالکل خفا نہیں ہوئیں معلوم نہیں کیا وجہ ہے مگر اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ ہماری فکر نہیں کرتیں وہ نہایت مٹی رہتی ہیں مگر ہمارے کھیل میں پہلے کی طرح شریک نہیں ہوتیں۔

”میرا خیال ہے کہ وہ کچھ پریشان رہتی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرنا نہیں چاہتیں۔ اب تو انھوں نے پیانو بجانا بھی سیکھ لیا۔“

تھوڑی دیر سکوت کے بعد بڑی لڑکی بولی ”تم نے ابھی کہا تھا کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“  
اں لیکن وعدہ کر دے کہ میری بات کو اپنے ہی تک محدود رکھو گی اماں یا اپنی سہیلی توئی، کے سامنے اس کا ذکر نہ کر دو گی۔



دو تین میسے سے پہلے کبھی ہمارے ساتھ ٹہلے نہیں گئے لیکن اب تو وہ ایک دن بھی ناغہ نہیں کرتے مس بین،  
کے آنے سے پہلے تو وہ ہم لوگوں کے پاس پھٹکتے ٹھک نہ تھے اور اب یہ ہے کہ ہر وقت ہمارے قریب ہنگامہ بچایا  
کرتے ہیں ہم جب بھی باہر نکلتے ہیں وہ ہمارے ہمراہ ہوتے ہیں خواہ پارک کی طرف یا کسی باغ میں.....  
..... جہاں بھی مس بین ہم کو لے جائیں۔ یقیناً تم نے اس پر غور کیا ہو گا؟

”اں غور تو کیا ہے“ چوٹی نے جواب دیا ”لیکن ابھی یہ خیال پیدا ہوا کہ.....“ وہ جملہ  
پورا نہ کر پائی۔

”اب تک میں اس پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہم لوگوں سے  
وہ آؤ گا کام لیتے ہیں۔“

دیر تک خاموشی رہی وہ دونوں اس پر غور کر رہی تھیں اس کے بعد چوٹی نے سلسلہ کلام شروع کرنے  
میں اقدام کیا

”لیکن اگر ایسا ہو بھی تو آخر وہ روکیوں رہی تھیں وہ تو ان کے بڑے دلدادہ ہیں.....  
میں ہمیشہ اسی خیال میں رہی ہوں کہ محبت کرنا بھی کس قدر مسرت انگیز ہے؟“

”اور میں بھی“ بڑی نے خواب آگین انداز میں کہا، یہ رازہ سمجھ میں نہیں آتا ”نیکو بھری آواز میں ایک  
مرتبہ یہ آواز پھر سنا دی ”بے چاری مس بین“

اس رات کو بچہ کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

صبح انھوں نے اس معاملہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا دونوں ایک دوسرے کے متعلق جانتی تھیں  
ہر ایک اسی خیال میں غرق ہے یہی نہیں کہ انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا  
بلکہ اشارہ نہ کرنے کے باوجود جب بھی ان کی آنکھیں اسٹانی پر آکر جھپٹیں وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی  
آنکھوں میں باتیں کر لیتیں کھانے کے وقت دونوں نے آؤ تو کو اپنے سے الگ سامعوس کیا۔ ایسا معلوم  
ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہنی ہے۔ انھوں نے اس سے بات تک نہ کی اور بہت ہی غور سے جانچتی رہیں کہ شاید  
اس طرح اس کے اور مس بین کے درمیان کسی خفیہ تعلق کا پتہ لگ سکے۔

ان کی دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں وہ ہر دم اسی دمن میں لگی رہیں کہ کسی طرح یہ معاملہ حل ہو جائے شام کو ایک نے دوسری سے مصنوعی لاپرواہی کے ساتھ پوچھا۔  
 ”کیا تم نے آج کسی نئی بات پر غور کیا؟“  
 ”نہ“ اس کی بہن نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ دونوں اس موضوع پر گفتگو کرنے سے خائف تھیں یہ حالت کئی روز تک باقی رہی مگر دونوں لڑکیاں خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کر رہی تھیں ان کا دماغ بے چین تھا لیکن پہلی محسوس کر رہی تھیں کہ بہت جلد ان کو حیرت انگیز راز معلوم ہو جائے گا  
 بالآخر دوپہر کے کھانے پر چھوٹی لڑکی نے دیکھا کہ استانی نے غیر مشہور انداز میں اشارہ کیا اور اڈوٹنے اس کو سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے ہیجان سے کانپتے ہوئے اپنی بہن کے میز کے نیچے آہستہ سے پیرارا بڑی نے دریافت طلب نگاہوں سے چھوٹی کو دیکھا اور سخی خیز نگاہوں سے چھوٹی نے جواب دیا کھانے کے اختتام تک دونوں عجیب شش و پنج میں رہیں کھانا ختم ہوتے ہی استانی نے لڑکیوں سے کہا ”تم لوگ پڑھنے کے کمرے میں جا کر کچھ کام کرو میرے سر میں درد ہو رہا ہے مجھے کم از کم گھنٹہ آدھ گھنٹہ لیٹ رہنا چاہیے۔“

”نہائی پاتے ہی چھوٹی لڑکی بول اٹھی“ ابھی دیکھنا اڈوٹاس کے کمرے میں جائیں گے۔  
 ”ہاں“ دوسری نے کہا ”اسی لئے تو انھوں نے ہم کو یہاں بھیج دیا ہے ہم کو باہر سے سننا چاہیے۔“  
 ”لیکن فرض کرو کوئی آجائے!.....“  
 ”کون آجائے؟“

”ااا“

”یہ تو بہت برا ہو گا“ چھوٹی لڑکی خوف زدہ ہو کر چلا اٹھی۔  
 ”دیکھو میں سنتی ہوں اور تم اس راستہ کی پاسبانی کرو۔“  
 چھوٹی لڑکی نے منہ پھلا کر کہا ”لیکن تم مجھ کو سب باتیں نہیں بتاؤ گی۔“

”اطمینان رکھو“

”پکی رہی“

”ہاں جیسے ہی کسی کو آتے دیکھنا کھانسن دینا“

راستہ میں دونوں ٹہریں۔ ان کا دل میں بیسوں جہل رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا؟ انھوں نے قدموں کی چابپاسنی اور کمرے میں گھس کر پڑھنے لگیں۔

”ہاں آؤ ٹوٹا؟ وہ سہین کے کمرہ میں گیا ہے۔ اندر سے دروازہ بھی بند کر لیا“ بڑی لڑکی اپنی جگہ پر جا پہنچی اور دروازے سننے لگی۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ سانس بھی آسانی سے لے سکے چھوٹی لڑکی ماسداً لگا ہیں ڈال رہی تھی۔ حیرت زدہ ہو کر وہ بھی دروازہ کی طرف چپکے سے لپکی لیکن بڑی بہن نے اسے دیکھ لیا اور جھجکا کر بولی کہ راستہ کے دوسرے کنارے پر جا کر پاسبانی کرو۔ انھوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا مگر چھوٹی بہن کو یہ چند لمبے پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ شدت بے قراری میں بے کل ہو کر ادھر سے اُدھر جاتی گویا آتش زیر پا ہے۔ دفتر جس میں وہ اپنے آنسو شکل سے ضبط کر سکی کیونکہ اس کی بہن سب کچھ سن رہی تھی بالآخر ایک آواز نے اسے چوکنا کر دیا۔ دونوں لڑکیاں اپنے پڑھنے کے کمرے کی طرف اس زور سے بھاگیں کہ تھوڑی دیر تک بول بھی نہ سکتی تھیں چھوٹی لڑکی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”اب تو سب کچھ بتا دو“

بڑی لڑکی عجیب الجھن میں پڑ گئی۔ اس طرح جواب دیا گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

”میں تو ان کی باتوں کو سمجھی ہی نہیں؟“

”کیا؟“

”یہ معاملہ غیر معمولی طور پر اہم ہے“

دوسری نے جھجکا کر کہا۔ ”کیا کیا؟“

بڑی لڑکی نے کتنا شروع کیا۔ ”ہم لوگوں کی خیال آرائیوں سے بالکل مختلف یہ عجیب اہم بات ہے جوئی ادنوکرہ میں داخل ہوا۔ اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کرنا چاہا۔ کیونکہ میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے، ٹھہر رہی



”ان کا بچہ! چھوٹی لڑکی نے کہا۔ ایک بچہ ناممکن ہے۔“

”صحیح جی یہی کہا تھا۔“

”تم اسے صحیح صحیح سن نہ سکی ہو گی۔ یہ ناممکن ہے۔“

”نہیں نہیں! میں نے سنا ہے اور مجھے کامل یقین ہے۔ بعد کو آؤ نے یہ دہراتے ہوئے کہا تھا۔“

”ہمارا بچہ اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ کہنے لگی اب ہمیں کیا کرنا چاہئے تب.....“

”اچھا۔“

تب تم ٹھنکھارنے لگیں اور مجھے مجبوراً وہاں سے بھاگنا پڑا

چھوٹی بہن کی پریشانی خوف و وحشت کی حد کو پہنچ گئی۔

چھوٹی بہن نے کہا: ”بچہ اس کو کہاں سے مل گیا؟“

”میں خود تم سے زیادہ نہیں سمجھ سکتی۔“

شاید وہ اپنے گھر پا گئی ہے۔ مگر ماں نے اسے یہاں آنے کی اجازت نہ دی ہو گی اسی وجہ سے شاید

وہ اس قدر افسردہ خاطر ہے،

کیسی محفل باتیں کرتی ہو اس وقت تو وہ آؤ سے آشنا بھی نہ تھی،

دونوں منکر سی ہو گئیں۔ مگر سب سے بڑھ چھوٹی بہن نے کہا۔

بچہ تو قطعی ناممکن ہے۔ اس کے کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے صرف شادی

کے بعد ہی بچہ پیدا ہو سکتا ہے شاید اس کی شادی ہو چکی ہو۔

”یہ تو فنی کی باتیں مت کرو۔ اس کی نسبت آؤ سے کبھی نہیں ہوئی ہے۔“

”اچھا تب.....“ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”غریب مس عین! ایک نے المٹاں انداز میں کہا۔“

ان کی گفتگو اور ان کے احساسات و جذبات کا اھل ہی ایک حسرت بھرا جملہ تھا جو تاسف اور رنج

کے ظاہر کرنے کے لئے ان کی زبان پر بار بار آ جاتا لیکن تجسسانہ جذبات انہیں بے چین کر دیتے۔



”تمہیں معلوم ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی؟  
 تم ہی بتاؤ مجھے اس کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟  
 کتنا اچھا ہو گا اگر چالاک سے میں سب کچھ اس سے اگھراؤں؟  
 ”چپ رہو کیسی باتیں کرتی ہو۔“

”آخر میں کیوں نہ پوچھوں؟ وہ تو ہم لوگوں سے بے مدخوش اخلاق ہے!  
 فائدہ ہی کیا وہ اس قسم کی چیزیں ہم لوگوں سے کتنا پسند نہ کریں گی جب کبھی بھی اس قسم کی گفتگو کے  
 درمیان ہم لوگ کمرہ میں داخل ہوتے ہیں وہ فوراً گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہیں ایسی فضول باتیں شروع  
 کر دی جاتی ہیں جیسے ہم لوگ ابھی تک بچے ہیں اگرچہ میری عمر تیرہ سال سے زیادہ ہے۔ پوچھنے سے کیا فائدہ  
 صرف ایک ہنگامہ ہو جائے گا۔  
 ”لیکن میں جاننا چاہتی ہوں،“

”بیشک میری بھی خواہش ہے مگر دل بیٹھا دینے والی چیز یہ ہے کہ ادوٹے اسے ہم لوگوں سے  
 پوشیدہ رکھا جس طرح اپنے والدین کا نام بتانے میں کسی کو شرم نہیں معلوم ہوتی اسی طرح کسی کے اگر کچھ پیدا ہو تو  
 اس کے بتانے میں کیا شرم ہے وہ پونہی قسمیں کھا رہا تھا اصل میں وہ ہم لوگوں کو جھانا دے رہا تھا.....“

اسی وقت اتانی کمرہ میں داخل ہوئی وہ دکھاوے کے لئے کام پر لگ گئیں لیکن نظر بچاتے ہوئے  
 انہوں نے دیکھ ہی لیا کہ آنکھوں کے پوٹے سرخ تھے۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز سے اس کے شدید جذبات  
 کا اظہار ہو رہا تھا۔ لڑکیاں اس کی تعظیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے بت کی طرح خاموش ہو گئیں اس کے ایک بچہ ہے  
 یہ خیال ان کے ذہن میں پھر رہا تھا۔ ہونہ ہودہ اسی لئے بے مدغگیں ہے لیکن ان پر بھی نادانستہ طور پر غم  
 کا اثر ہونے لگا۔

دوسرے دن دو پہر کو ایک حیرت میں ڈالنے والی خبر معلوم ہوئی۔ ادوٹے نے جلاوطنی کا قصد کر لیا۔ اس نے  
 اپنے چچا کو بتلایا کہ اسے سخت سخت کرنی ہے۔ گھر بڑھیک ٹھہرائی نہیں ہو سکتی وہ دو مہینے کے لئے کسی دوسرے

مقام کو چلا جائے گا۔ لڑکیوں کے دل جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کو کامل یقین تھا کہ اس کی جدائی ہی دن کی گفتگو سے تعلق رکھتی ہے اسلئے جب آؤ تو آخری مرتبہ ان سے نصیحت ہونے آیا تو وہ جان بوجھ کر روٹھ گئیں اور اس کی طرف پیٹھ کر لی اس کے باوجود جب دوسرے تین سے ملنے گیا تو وہ توجہ سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ آؤ نے خاموشی سے ہاتھ ملایا گرائی کے لبوں پر ہلکی سی جنبش ہوئی تھی اتنے دنوں میں لڑکیاں بہت بدل گئیں تھیں۔ دوپٹے سے ہنسیں اکرسی خوشی میں بھی شریک نہ ہوتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے حسرت نکلتی وہ ادھر سے ادھر اس طرح پھرتیں گویا ان کا صبر و قرار ٹپکا تھا۔ اپنے بڑوں پر ان کا اعتماد بھی اٹھ چکا کیونکہ ان کو شبہ تھا کہ ان کی سادہ وحی کی باتوں میں کرد و فریب پوشیدہ ہے ہمیشہ تاک میں لگی رہتیں۔ سایہ کے اندر وہ دبے پاؤں جاہل اور دروازوں کی آؤ میں اس طرح منتیں گویا وہ اس جال یا پردے کو جس نے اس بھید کو ان سے چھپا رکھا ہے چاک کرنے یا کم سے کم اس جال کے سوراخ سے دنیا کے حقیقت پر ایک نظر ڈالنے کے لئے مضطرب ہیں۔ ایسا..... عہد طفولیت کی بے لوری جس پر کچھ قانع رہتا ہے۔ ان کے دماغ سے محو ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ہمیشہ کچھ نئے انکشافات کی منظر رتی تھیں۔ اور ہر موقع سے کچھ نہ کچھ اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتیں۔ ماحول کے کرد و فریب نے انھیں بھی مکار بنا دیا تھا۔ اپنے والدین کے سامنے اپنے کو بچہ بنانے کی کوشش کرتیں۔ ان دونوں بڑے بوڑھوں کی مخالفت تھیں۔ اسی لئے آپس میں ذہنی قربت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جب کبھی ان کو اپنی نادانیت اور لاعلمی کا خیال آتا تو ہمدردانہ انداز میں ایک دوسرے سے چٹ جاتیں کبھی جذبات کی شدت میں ان کی آنکھوں سے زار زار آنسو نکل پڑتے بلا کسی ظاہری سبب کے ان کی زندگیاں نازک صورت اختیار کر رہی تھیں۔

ان کے گونا گوں معائب میں یہ مرحلہ تلخ ترین تھا چپ چاپ انھوں نے فرداً فرداً معصم ارادہ کر لیا کہ وہ مس تین کو کچھ بھی تکلیف نہ پہنچائیں گی کیونکہ وہ یونسی اندر وہ غلط تھی۔ وہ انتہائی مخفی واقع ہوئی تھیں۔ اپنے سبق کے یاد کرنے میں ایک دوسرے کو مدد دیا کرتیں۔ خاموش اور خوش اخلاق ہوتے ہوئے انھیں اپنی انسانی کمی مرضی سمجھ جانے میں ملکہ حاصل تھا لیکن انسانی کو کبھی بھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ اسی چیز سے تو ان کے دلوں کو ٹھیس لگتی تھی۔

استانی اب قطعاً بدل گئی تھی جب لڑکیاں اس سے گفتگو کرتیں تو وہ اس طرح چونک اٹھتی گویا یکدم خواب سے بیدار ہو رہی ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ سے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا وہ کسی عین تجسس میں پڑ گئی تھی گفتگوں میں ہونی خیالات کی دنیا میں سیر کیا کرتی لڑکیاں اپنے انگوٹھے کے بل اس کے پاس سے کل باتیں مبادا اس کے تصور میں کوئی غلط پڑے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ بچہ کے متعلق سوچا کرتی ہے چونکہ لڑکیوں میں بھی نسبت کے جذبات بیدار ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنی مہربان اور شریف استانی سے ہمدردی اور محبت کرنے لگی تھیں زندہ دل مس آئین جس کی بڑی ہونی زندہ دل کی کسی زمانہ میں بری معلوم ہونے لگی تھی اب متفکر بن گئی تھی گویا کہ کوئی بت ہے۔ اس کے تمام افعال سے حزن و ملال نکلتا اسے روتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں کے پوٹے ہمیشہ سرخ رہتے تھے بالکل صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی تکالیف کو اپنے ہی تک چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن انھیں اس بات کا بے حد تعلق تھا کہ وہ اس کے کسی کام نہ آسکیں۔

آخر کار استانی ایک دن آنکھ پوچھنے کے لئے کھڑکی کی طرف گئی۔ چھوٹی بہن نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

”مس آئین آپ کبیدہ خاطر کیوں ہیں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔“

استانی نے محبت بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی لمبی زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا، نہیں عزیزم یہ تمہاری غلطی نہیں ہو یہ کبھی اس نے چھوٹی بچی کی بیٹانی کا بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد لڑکیاں ہمیشہ اسی فکر میں پڑی رہیں۔ ایک دن ان میں سے ایک غیر متوقع طور پر اپنے والدین کے کمرہ میں گھس آئی اس نے ایک دو الفاظ ایسے سن لئے جو اس کے لئے موزوں نہ تھے۔ اس کے والدین نے اس کو دیکھتے ہی فوراً موضوع گفتگو بدل دیا لیکن ان کیلئے اتنا ہی سن لینا کافی تھا وہ تفکرات میں پڑ گئیں۔

ہاں میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی تھی ”اں کہہ رہی تھی مجھے اس سے گفتگو کرنی پڑے گی۔“

پہلے چھوٹی لڑکی نے خود اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی مگر نا کامیاب رہ کر اپنی بڑی بہن سے رائے لینے کے لئے دوڑی ہوئی گئی۔

”آخر یہ گفتگو کس چیز کے متعلق ہو سکتی ہے؟“

لیکن کھانے کے وقت انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے والدین استانی سے کس قدر ناراض اور بدن ہیں کھانے کے بعد ان کی ماں نے سہیل سے کہا۔

”کیا آپ میرے کمرہ میں تشریف لائیں گی میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں؟“

لڑکیاں خوف سے کانپ رہی تھیں کوئی ہولناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ لیکن اب چیکر سن گن لینا روزانہ کا معمول ہو گیا تھا جبکہ اور شرم قطعاً معدوم ہو چکی تھی۔ ان کے ذہن پر صرف ایک خیال حاوی تھا کہ پوشیدہ راز کو کس طرح معلوم کیا جائے جس دروازہ سے سہیل داخل ہوئی تھی اسی پردہ کھڑی ہوئی گفتگو کو سننا چاہتی تھیں ان کو صرف ہلکی سائیں سائیں کی آواز سنائی دی۔ کیا وہ راز کے معلوم کرنے میں ناکام رہیں گی؟ اتفاقاً ان کو ایک آواز سنائی دی۔ ان کی ماں کو غصہ آ رہا تھا۔

”کیا ہم لوگ اندر سے تھے کہ ہیں تمہاری حالت کی خبر نہ ہوتی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ استانی کے فرائض کے بارے میں تمہارے نظریات کیا ہیں۔ تم ایسی عورت کے اہل میں لڑکیوں کی تعلیم سپرد کر کے میں بھڑکتی ہوں جو یہ خیال آتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تمہاری بے شرمی اور غفلت شعاری اتنا کہ پوچھ گچھ گئی ہے۔ استانی غصہ سے تنہا اٹھی مگر اس کی آواز اس قدر ملامت اور خجیف تھی کہ لڑکیاں اسے سن نہ سکیں۔“

”ہوئے جاؤ، بہانہ تو تلاش ہی کر لیا۔ ہر بالی اور بدکار ایسا ہی کرتا ہے تم نے نتائج کی پرواہ نہ کر کے ایک زور و دھماکا سے ناجائز تعلقات پیدا کئے تم سے خدا بچے گا تم ایسی عورت کا استانی ہونا کتنا شرمناک ہو تمہیں میرے متعلق اب زیادہ جن ملن نہ رکھنا چاہئے۔ اب میں تمہیں ایک لمحہ کے لئے یہاں نہیں ٹھہرا سکتی۔“

لڑکیاں کانپ اٹھیں وہ سب کچھ نہ سمجھ سکیں مگر پھر بھی ان کی ماں کی آواز و ہشتناک تھی۔ اس کے جواب میں سہیل نے کہا کہ ان کی بھی آنکھوں سے آنسو کے قطرے نکل پڑے مگر باں کا بارہ چڑھتا ہی گیا۔

”اب چیخنے چلانے کے علاوہ رہ ہی کیا گیا ہے لیکن تمہارے آنسو مجھے نہیں رلا سکتے مجھے تم جیسی عورت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں کہ مجھ پر کیا بتیے گی۔ تمہیں اپنا نام تو معلوم ہی ہو گا بہر حال تمہارے معاملہ میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں میرا حکم ہے کہ میرا مکان خالی کر دو۔“



”بھری بھری نہیں آنا کہ ماں آخو پچاری س آہیں سے کیوں ناراض ہیں؟  
غریب س آہیں“

اس کے منہ سے دوبارہ اکھڑی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھبائے۔ اس کے بعد اس کی ماں نے اگر پوچھا کیا وہ اس کے ساتھ سیر کرنے چلیں گی۔  
”نہیں ماں! آج ہم لوگ نہیں جائیں گے“

درحقیقت وہ اپنی ماں سے ڈر رہی تھیں اور غصہ اس بات پر تھا کہ مس آہیں کو کھالتے وقت ان کی ماں نے انھیں کیوں بتایا اس وقت تمہارا ہنا ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ حاضر نفس کی طرح وہ کمرہ میں پھڑپھڑاتی ہیں مگر خاموشی اور غریب کے بار سے دبی جا رہی تھیں۔ انھوں نے مس آہیں کو سب کچھ پوچھنے اور اسے اپنی ماں کے خلاف روکنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ صاف طور پر کہہ دیا جانتی تھیں کہ ان کی ماں کا رویہ اس کی طرف بہت غیر منصفانہ ہے۔ مگر وہ یہ لکڑا سے زیادہ نگین بنانا پسند نہ کرتی تھیں اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ جھجکتی بھی تھیں کہ کسی کو نیپال ہو جائے کہ انھوں نے اسے کیسے معلوم کیا۔ ان کے دلوں میں چور تھا کیونکہ سب کچھ سن گن کر معلوم کیا تھا غرض کہ سہ پہر کا وقت اسی طرح انصر دگی میں نکلا۔ اس درمیان میں جو کچھ انھوں نے دروازہ کی آڑ میں چھپ کر سنا تھا بار بار یاد آ رہا تھا۔۔۔۔۔ ان ماں کی سنگدلی اور بے رحمی۔۔۔۔۔ مس آہیں کی حسرت بھری مسکریاں۔

شام کو راتانی آخری ملاقات کے لئے آئی جو نبی وہ کمرہ سے باہر نکلی لڑکیوں نے سکوت کو توڑنا چاہا لیکن ان کی زبان پر ایک لفظ نہ آسکا۔ دروازہ پر پہنچ کر جیسے وہ ان کی خاموش حسرتوں سے متاثر ہو گئی ہے اس میں واپس لوٹی۔ اس کی آنکھیں جذبات کی شدت سے جھک رہی تھیں۔ وہ دونوں سے بغلیں ہوئی جو فوراً بے تحاشا روئے نگین انھیں دوبارہ پیار کر کے راتانی فوراً باہر نکل گئی۔ لڑکیاں سمجھ گئیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ ایک نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”اب ہم اسے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔“

یکل جب ہم اسکول سے واپس آئے ہوں گے تو وہ چلی گئی ہوگی۔  
لیکن اگر ہم پھر کبھی ملے تو اس کا پھر بھی اس کے ہمراہ چوگا۔

”ہاں وہ تو بڑی ہی پیاری ہے۔ غریب مس مین۔“  
 معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس حسرتناک جملہ میں ان کی قسمت کی پیشینگوئی مضمر ہے۔  
 ”آخر اس کے جانے کے بعد ہم کیسے رہیں گے۔“  
 ”میں تو اس اسانی کے علاوہ شاید ہی کسی کے سامنے کھڑی بھی ہو سکوں۔“  
 ”میں بھی نہیں۔“

”مس مین کی طرح کوئی دوسری نہ ملے گی۔ اس کے باوجود..... جب سے معلوم ہوا وہ حاملہ ہے۔“  
 اس میں جملہ پورا کرنے کی ہمت نہ تھی ایک نادانستہ جذبہ نسوانیت نے مس مین کو ان کی نگاہوں میں وقیع اور  
 عزیز بنا دیا تھا۔

یہ خیال ہمیشہ ان کے ذہن میں چلکھٹا اور اسی کو سوچ کر ان کا دل پسچ جاتا۔  
 ”مجھے ایک بات کہنی ہے۔ ایک نے کہا۔“  
 ”ہاں کیا ہے؟“

”میرے دماغ میں ایک تدبیر آئی ہے۔ کیا اس کی جدائی سے پہلے ہم اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے  
 جس سے اس پر ظاہر ہو جائے کہ ہم اسے کتنا چاہتے ہیں اور ہم لوگوں کی طبیعت اپنی ماں سے کس قدر مختلف  
 ہے۔ کیا تم میری تدبیر میں شریک ہو گی؟“  
 ”بالکل۔“

”تم جانتی ہو کہ اسے گلابی پھول کس قدر پسند ہیں۔ کل ہم لوگ علی الصبح باہر نکل چلیں اور اس کو ملنے سے  
 قبل کچھ پھول خرید کر اس کے کمرہ میں رکھ دیں۔“  
 ”لیکن کب۔“

”اس کو ملنے کے بعد۔“

تب تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت تک وہ چلی گئی ہو گی۔ دیکھو میں ناشتہ سے قبل ہی نکل جاؤ گی  
 اور پھول جب کہ لاؤں گی پھر ایک ساتھ اس کے کمرہ میں چلیں گے۔“

”بہت خوب پھر ہیں صبح سویرے اٹنا چاہئے۔“

انہوں نے اپنی بیدوں کو ٹٹولا۔ وہ خوشی کے مارے پھولی نہ ساتی تھیں کیونکہ انہیں اپنی محبت کے ظاہر کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ صبح سویرے ہاتھوں میں گلاب کے پھول لئے ہوئے انہوں نے مس جنین کے دروازہ کو کھٹکھٹایا کوئی جواب نہ ملا یہ سوچ کر کہ اتنی سو گئی ہوگی۔ انہوں نے جاکٹنا شروع کیا۔ کمرو عالی پڑا تھا بستر پر شکن تک نہ تھی گویا کوئی اس پر سرمایہ بھی نہ تھا۔ میز پر دو خطوط پڑے تھے۔ لڑکیاں حیران ہو گئیں آخر کیا ہو گیا؟ بڑی لڑکی نے کہا: ”میں سیدھی اس کے پاس جاؤں گی۔“

”اس نے بے خوف و خطر پوچھا۔ اماں مس جنین کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”کمرہ میں تو کوئی نہیں ہے،“ آج سوئی بھی نہیں ضرور وہ کل رات چلی گئی۔ اس کے متعلق آپ نے ہم لوگوں سے کیوں نہیں ذکر کیا؟“

اماں کو اس کی سخت آواز کا ذرا بھی خیال نہ ہوا یہ سن کر وہ زرد پڑ گئی۔ اپنے شوہر کر لے کر وہ مس جنین کے کمرے میں داخل ہوئی۔

وہ کچھ دیر وہاں ٹھرے۔ اس دوران میں لڑکیاں اپنی ماں کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ اماں اسکا کوئی جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر میں ان کا باپ ایک کھلا ہوا خط لئے ہوئے واپس لوٹا۔ وہ خود ہی بہت پریشان تھا۔ والدین اپنے کمرے میں پہلے گئے اور وہی آواز سے باتیں کرتے رہے۔ اس مرتبہ لڑکیوں میں ان کی گفتگو سننے کی ہمت نہ تھی۔ انہوں نے اپنے باپ کو اس حالت میں کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔

جب ان کی ماں باہر چلی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ انہوں نے اس سے پوچھنا چاہا مگر اس نے ترش روئی سے ڈانٹا۔

”ماں کوں جاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی۔“

انہیں جانا پڑا گھنٹوں درج میں کھڑی ہو جی نہیں رہیں۔ ایک لفظ بڑا نہ سن سکیں۔ جیٹی ہوئے ہی وہ گھر کی طرف دوڑیں۔ سبھی کے چہرے خوفناک ہو گئے۔ تھ جیٹی کہ لڑکوں کا چہرہ بدلا ہوا تھا جب ماں اس سے ملنے آئی



تو اس نے کہا۔

بچو! اب تم سب کو کسی نہ دیکھ سکو گی۔ وہ..... جملہ پورا نہ ہو سکا۔ لڑکیوں کا چہرہ استعد  
خونخاک ہو گیا تھا کہ ان کی کچھ جہت نہ چڑھی وہ مڑی اور اپنے کمر میں جا کر پناہ لی۔

اسی دن سہ پہر کو آدو بھی وارد ہوا۔ ان خطوں میں سے ایک اس کے نام کا بھی تھا۔ جس میں اسے آنے  
کی دعوت دی گئی تھی وہ بھی ادا اس اور پریشان تھا کسی نے اس سے بات تک نہ کی ہر ایک نے اس سے پرہیز کیا۔  
وہ دونوں لڑکیوں کو ایک گوشہ میں غیر مطمئن پا کر انہیں کے پاس گیا۔

”ہمارے نزدیک مت آؤ۔ دونوں چلا آئیں جیسے ان پر کوئی ناگمانی آفت ہی آنے والی ہو،  
تھوڑی دیر تک وہ ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر غائب ہو گیا۔ انہوں نے کسی سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا اور نہ  
آپس میں کوئی بات ہوئی۔ بلا کسی متعدد کے علیحدہ علیحدہ وہ کمرن میں گھومتی رہیں اور جب ایک دوسرے کے  
پاس سے گزرتیں تو خشک آلود چہرے پر نظر اٹھا کر دیکھ لیتیں اب انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ انہیں یقین تھا  
کہ انہیں سراسر دھوکا دیا گیا۔ وہ اپنے والدین کے مکینہ بین اور ذلالت پر چڑچڑاہیں مگر کوئی چارہ نہ تھا ماں باپ پر  
ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ شخص سے بدگمان ہو گئیں۔ ہر چیز سے انہیں کمر و فریب کی بو آتی احساس  
زندگی کے بارے ان کے نوجوان نازک شانے دبے جا رہے تھے۔ مغلوبیت کا انبساط انہیں کبھی پہلے پہر والی  
ختم ہو گئی۔ وہ معلوم خطرات کی نظر پہنے لگیں اگرچہ اس واقعہ کی پوری اہمیت ان کی سمجھ اور عقل سے باہر تھی  
مگر پھر وہ اس کے دہشت ناک اور ہولناک امکانات کے معلوم کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ وہ سب سے الگ  
تھلک رہتیں مگر ان میں ایک خاموش ربط قائم تھا وہ اس طلسم سکوت کو توڑ نہ سکتی تھیں۔ اپنے بڑے بوڑھوں سے  
علیحدہ رہتیں۔ ان تک کسی کی رسائی نہ تھی کیونکہ انہوں نے اپنے دلوں کے دروازے بند کر دیے تھے  
..... شاید آنے والے کئی سالوں کے لئے..... انہیں گرد و پیش کی ہر چیز سے نفرت تھی کیونکہ  
کچھ دنوں کے مختصر عرصہ میں وہ سن رشد و تمیز کو پہنچ گئیں تھیں بچپن کی لاپرواہی جوانی کی ذمہ داریوں اور  
نہواری جذبات کے ناگماں ارتعاش سے مغلوب ہو چکی تھی۔

ایک روز شام کو بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک بچپن کا آہٹیب ان میں پھر پیدا ہو گیا مردہ عورت کا خوف

اور خوفناک کمکات ان کے چاروں طرف شیطان ڈراؤنی شکل میں منڈلانے لگے۔ کڑا کے کی سردی پڑی تھی۔ ایسی گھبراہٹ میں وہ کمرہ کو گرم کرنے کے لئے آگ بھی نہ جلا سکیں۔ دونوں لڑکیاں ایک ہی ستر میں گھس گئیں۔ اور کچھ تو گرمی پہنچانے اور کچھ ایک دوسرے کو تعزیت دینے کے لئے کانامپوس کرنے لگیں۔ عمو ان گفتگو بہت ہی معمولی تھا۔ وہ اپنے مصائب کا دکھ اسیان کر رہی تھیں لیکن چوٹی لڑکی جو کہ سرخ لاس تھی اسے مجبوس جذبات کا شکوک کے راستہ تسکین ملی۔ بڑی لڑکی بھی رونے لگی۔ وہ ایک دوسرے کی آغوش میں روتی رہیں۔ دوس تین کی جدائی پر اتنا غمگین تھیں جتنا یہ سوچ کر کہ معلوم نہیں کس وقت کیا مصیبت نازل ہو جائے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایک حقیقی دردناک واقعہ دیکھا تھا جیسا اسے کیسے نبھاسکتیں۔ ان میں احساس اور بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا رد عمل یہ ہوا کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئیں۔

زندگی کا جھگڑا ایک گھنا جھگڑا ہے جس میں درندے بستے ہیں۔ انہیں یہ جھگڑا پار کرنا تھا۔ ابھی تک بے خوف و خطر چلی جا رہی تھیں مگر اب انہوں نے درندوں کے پاؤں کے نشانات دیکھ لئے اور یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ معصوم اور کمزور انسانوں کو کس طرح چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ انہیں اپنی زندگی کے متعلق خطرہ پیدا ہو گیا۔

لیکن اس کے ساتھ بچپن کا تجسس بھی کم ہوتا گیا۔ اب ندوہ زوروں سے روتیں اور ندوہیں آتیں۔ ان کی زندگی کی ندی میں طوفان اٹھتے تھے مگر خاموش تلامذہ ہر بات تھے گر بے آواز۔

مترجمہ ملک حامد حسین صاحب

# جامِ صہبائی

(۱)

ہو مہر کہ ماہ دیکھتے ہیں تجھ کو! ہم شام و بچاؤ دیکھتے ہیں تجھ کو!  
میدان ہو کہ کوہاں صحرا ہو کہ باغ ارباب نگاہ دیکھتے ہیں تجھ کو!

(۲)

کو نا ہے جو مجھ کو کام کر جاؤں گا حق کوش ہوں حق کی راہ پر جاؤں گا  
اے لشکر اہرمن ڈراتا ہے کسے تیری صفیں چیر کر گور جاؤں گا

(۳)

اخلاص و وفا میں بھی ہے طاقت پنہاں تسلیم و رضا میں بھی ہے طاقت پنہاں  
بے تیغ و تنگ ہیں یہ نطاہر میں، مگر مردانِ خدا میں بھی ہے طاقت پنہاں

(۴)

زردار بھی حکمران بھی جھک جائیں گے سرکش ہیں جہاں جہاں بھی جھک جائیں گے  
تو دامنِ حق اگر نہ چھوڑے گا آثر تیرے لئے آسماں بھی جھک جائیں گے!

(۵)

نمرد نے آگ بھڑکائی ہے یہاں فرعون کو دعوائے خدائی ہے یہاں  
یارب! ہیں کہاں تیرے خلیل اور کلیم مردانِ خدا کی جگہ بنائی ہے یہاں

(۶)

بڑھ بڑھ کے جگر پہ زخم کھاتا ہوں میں ہرزخم پہ جھومتا ہوں گاتا ہوں میں  
اور دلوں کی مصیبتوں پہ رو دیتا ہوں میں اور اپنے غموں پہ مسکراتا ہوں میں  
اثرِ صہبائی

# بکھری ہوئی پتیاں

(ساینٹ)

اے دوست! بھر بھی میری پریشانیاں یہ کیوں؟  
تاریخ باغِ دہر کو ترتیب دے چکا  
منظوم گلستاں کی ہاں میں بھی لے چکا  
لیکن پڑی ہیں، بکھری ہوئی پتیاں یہ کیوں؟  
مدت سے ایک فکر ہے، صدیوں سے کوششیں  
لیکن ہوئیں نہ آج تک افسوس کا سیلاب  
یعنی ابھی ہر ایک تغیر، ہر انقلاب  
کھاتا رہا ہے چار قدم چل کے غرض نشیں!  
یہ نظم، یہ فسانہ، یہ تفسیر، یہ پکار  
ایسٹج سے زمانہ کے سوسرخوؤں کے ساتھ  
ان منظر سی، تکتی ہوئی ہتھیوں کے ساتھ  
کس درجہ دلفریب مگر کتنا انتشار!!  
— کہ شور اے حیات اکہ سمجھی نہیں ہوں میں  
اے زندگی، پکار! کہ اندواگیں ہوں میں!  
سلام (مچلی شہری)

# آخری نصیحت

حیات ہو نفسِ مہر و مادِ تیرے لئے  
 جہاں تمام ہوا اک درگاہِ تیرے لئے  
 اندھیری رات میں عصرِ رواں کی، نورِ نبی  
 شرارِ عشق ہو قندیلِ راہِ تیرے لئے  
 ترے ضمیر پہ روشن ہو باطنِ امروز  
 میں انگٹا ہوں خدا سے نگاہِ تیرے لئے

حیات دہر ہوا اک بحرِ بیکرا نہ تجھے  
 اسیرِ دام نہ کر دے تلاشِ دانہ تجھے

دُورِ غم سے تری روح بے قرار نہ ہو  
 شکستِ عمرِ جوانی سے اشکبار نہ ہو  
 تمامِ قلبِ دجگر ہو ترا، کنِ رطلب  
 مگر تو ساحلِ مقصد سے ہمکنار نہ ہو  
 تلاشِ رزق بھی سہے شرطِ زندگی لیکن  
 خودی کو بیچ کے فطرت سے شرمندہ ہو

رہے نظر میں ترے امتیازِ دین و وطن  
 ترے نصیب ہو، سوز و سرورِ عہدِ کمن

فضلِ حسین صاحبِ کیفیت

## تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں نامزد رہی ہیں)

بیک انگلش :- از خیرات علی زیدی، مدوکار مدرسہ فوقانیہ میدک حیدرآباد دکن۔ سائز ۸ ۱/۲ × ۲۶ × ۸۲، قیمت پیر غالباً مصنف صاحب سے مل سکتی ہے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت کچھ زیادہ۔ انگریزی زبان کو دنیا بھر کی زبان بنانے کے مقصد سے ایک طریقہ تعلیم زبان ایجاد کیا گیا ہے جس کو بیک انگلش کہتے ہیں اس کی رو سے انگریزی زبان کے ۲۵۰۰ الفاظ کو ۸۵۰ الفاظ کی مدد سے سمجھا لیا گیا ہے متعین یہی ہے کہ جو لوگ انگریزی زبان نہیں جانتے وہ جلد از جلد سیکھ سکیں اور جو تھوڑی بہت جانتے ہیں وہ خاصی جاننے لگیں۔ حال میں اس بنیادی انگریزی نے اس قدر مقبولیت حاصل کی ہے کہ انگریزی ادب کی بہت سی مشہور کتابیں اسی سادہ زبان میں منتقل کی جانے لگی ہیں تاکہ شد بد انگریزی جاننے والے انگریزی ادب سے بھی مستفید ہو سکیں۔ خیرات علی صاحب نے بنیادی انگریزی کے اصول اور قاعدوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔ اس لئے بڑی وضاحت اور سہاؤ سے اس کے مسائل کو بیان کیا ہے انگریزی میں تو خیر اس موضوع پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو میں کوئی نہ تھی۔ وہ لوگ جو انگریزی زبان سے مرعوب ہیں یا بیچ بچ شوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ بنیادی انگریزی کی کتاب بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

اس انگریزی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہیں اردو کی اشاعت میں بھی ایسی ہی جدوجہد کرتا ہے۔ کچھ دن ہوئے رسالہ اردو میں بنیادی اردو پر کسی نے کچھ لکھا تھا لیکن ضرورت اس کا ہے کہ بنیادی اردو کا کام کوئی منظم جماعت مثلاً انجمن ترقی اردو یا حیدرآباد کی کوئی جماعت کرے یہ اپنی زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

سین اور انقلاب :- از جوش ملیح آبادی، ملنے کا پتہ سرفراز بک ڈپو سرفراز بلڈنگ نادان محل روڈ لکھنؤ۔

سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۴۰ قیمت ۵ روپيا کتابت و طباعت خاصي۔

زير نظر کتاب ميں جناب جوش يلج آبادي کا ايک مفسر ہے جو حضرت امام حسين کا ايک مربيہ ہے دو چھوٹے چھوٹے سلام اور چار رباعياں ميں مفسر مربيہ لائے ہوئے ہے ليکن ظاہر ہے کيا گيا ہے کہ حسين کي مداخلت حکومت کے خلاف ايک انقلاب تھی۔ آج کل جبکہ انقلاب کا لفظ فيض بن رہا ہے اس قسم کي تاويل روايات کس کو قائم رکھنے کي ايک سمي معلوم ہوتی ہے۔ جوش سے کبھی کبھی مذہبي ائمہ کے متعلق نظميں سرزد ہو جاتی ہيں غالباً کسي شرت يا کسي طبقہ ميں مقبوليت کے خيال سے نہيں بلکہ صرف عقيدت کے جوش ميں۔ وہ خدا پر يقين نہ رکھتے ہوں ليکن خدا کے بعض بندوں پر فريفتہ ہيں سچ ہے۔ کيسے کوئي عزيز روايات چھوڑ دے۔

جاں تک نظم کا تعلق ہے اس ميں شک نہيں کہ بے پايان جوش، بلند معاني اور مناسب خوشنما جڑے ہوئے الفاظ کا ايک گلدستہ ہے خلوص، صداقت اور عقيدت ہر ہر مصرعہ سے طراوت کرتی ہے۔ دو بند نوشتا پيش ہيں۔ امام حسين ؑ کي تعريف ميں لکھتے ہيں۔

جو صاحب مزاج نبوت تھا، وہ حسين      جو دارث ضمير رسالت تھا، وہ حسين  
جو خلقي شاہد قدرت تھا، وہ حسين      جس کا وجود فخر مشيت تھا، وہ حسين

ساچے ميں ڈھالنے کے لئے کائنات کو

جو تولدًا تھا ذک مرثوہ پر حيايات کو

جو اک نشان تشہد باني تھا، وہ حسين      گيتی پہ عرش کي نوشتا في تھا، وہ حسين

جو خصلہ کا امير جواني تھا، وہ حسين      جو اک سن جدید کا باني تھا، وہ حسين

جس کا لہو تلام پيں سا لائے ہوئے

ہر بزم ميں تازہ کا طوفاں لائے ہوئے

اس ميں شک نہيں کہ مفسر کے ساچے ميں جوش کا یہ تجربہ بہت کا سياب رہا ہے پھر بھی ہيں۔

يقين ہے کہ ميرافيس کي سمي رواني، گھلاوٹ اور خوشنماي ان ميں پيدا نہيں ہو سکتی۔ وجہ اس کي صاف ہے

مدرس میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ بند کی ابتدا اتار سے ہوتی ہے اور جب ٹیپ کے مصرع پر پہنچتے ہیں تو چڑھاؤ کی انتہا ہوتی ہے جوش کی طبیعت میں جوش ہی جوش ہے ایسا جوش جو اتار چڑھاؤ نہیں جانتا بلکہ صرف چڑھاؤ ہی چڑھاؤ کا پابند ہے اس لئے وہ مد و جزر کی خوبصورتی نہیں پیدا ہو سکتی بوسیرانی کی نرم و گرم ہمتیں اور پر جوش طبیعت کا ذخیرہ بھی یہاں تک کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرانیس کی طبیعت کو مدرس سے جو فطری مناسبت تھی وہ اس سانچے سے بہتر کسی دوسرے میں ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جہاں تک جوش کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ قدرت الفاظ، جوش بیان اور جوش تصور میں ان کا پلہ کسی سے کم نہیں لیکن اپنی طبیعت کی افتاد کے باعث میرے خیال میں یہ سب سے بہتر رومانی نظموں میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین اظہار کر سکے ہیں۔ زرمیہ یا انقلابی نظموں کا سانچہ مدرس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ زرمیہ یا انقلابی نظموں سے زیادہ ان کا بہترین میدان رومانی نظمیں ہیں جب یہ اس ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں تو کہنے کو تو وہ ہر چیز کہہ لیتے ہیں اور اچھی کہہ لیتے ہیں لیکن رومانی نظموں کی سی خوشنوائی اور کمال کسی میں نہیں آتا۔ انقلابی نظموں کے لئے ان کی روح میں تڑپ تو کافی ہے لیکن اس کے برابر کی رومانی سوجھ بوجھ اور تنقیدی نظر نہیں۔

رسالہ چمنستان (شاعر نمبر) مدیر آغا شاعر خوش قریب باش نائب مدیر گوردین دہس ایم۔ اے۔ ملے کا پتہ نصر شاعر دہلی قیمت ۲۰ مارچ کار سالہ چمنستان کا شمارہ شاعر نمبر ہے جو آغا شاعر قریب باش دہلوی مرحوم کی یادگار میں نکالا گیا ہے

آغا شاعر مرحوم دہلی دبستان شاعری کے پرانے نام لبواؤں میں سے تھے۔ داغ مرحوم کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ انوس کہ ۱۲ مارچ کو شمع بھی گل ہو گئی۔ زیر نظر شمارہ میں مرحوم آغا شاعر کی حیات و کلام پر اچھے اچھے مضامین ہیں نیز مرحوم کے دوستوں کے بیانات بھی ہیں جن سے مرحوم کے کلام پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ مہاتما گاندھی کا بھی تعویذی تا خصوصیت سے ہلاک بنوا کر شامل کیا گیا ہے حالانکہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی جن حضرات کو دہلوی محاورہ بندی اور زبان سے شوق ہے۔ ان کے لئے یہ نمبر ایک تحفہ ثابت ہو گا کیونکہ آغا شاعر مرحوم کا کلام زبان و محاورہ کا ایک خوشنما الم ہے۔

رسید کتب

شہادتہ الغبر من مولد خیر البشر۔ از قاری شاہ محمد رحیم۔ ملے کا پتہ تراہیم خاں چٹانک مفتی والاں دہلی



## قومیت اور بین الاقوامیت

مصنفہ محمد قاسم حسن

مصنف نے اس مقالے میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے عناصر سے بحث کی ہے۔ قومیت کا ارتقاء کیونکر ہوا مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ وہ عنوانات ہیں جن پر فاضل مصنف نے اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ بین الاقوامیت کو تحلیل کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ قیمت عمر

## بحرالکابل کی سیاست

مصنفہ امین خالیدی

اس مقالے میں مصنف نے بحرالکابل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے اس کا خیال ہے کہ اگرچہ اس وقت دنیا کی نظروں میں بحرالکابل نے وہ جگہ نہیں لی ہے جو اس کا حق ہے پھر بھی مستقبل میں بحرالکابل کی اہمیت دنیا کے تمام سمندروں سے بڑھ جائے گی جس طرح کسی زمانے میں بحر روم کے ارد گرد مصری، یونانی اور رومی تمدن کا عروج ہوا اور اب بحرالکابل کے یورپ اور امریکہ کی جدوجہد کا میدان ہے اسی طرح آئندہ بحرالکابل دنیا کی معاشی اور سیاسی ترقی کا مرکز ہوگا اس مقالے میں انھوں نے امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکرائے کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ قیمت عمر

# استاد اور بچے کے مسائل

(یہ مقالہ چرچ ٹریننگ اسکول راہپور کی ایجوکیشن سوسائٹی میں، ہاں کے طلبہ کی فرائش پر پڑھا گیا)

استاد اور اس کے مسائل! لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا استاد کے بھی کوئی مسائل ہوتے ہیں؟ استاد اور اس کے مسئلے! یہ بکار تو پہلے کبھی سنی نہ تھی سنتے تھے کہ اقلیدس اور ہندسہ کے مسئلے ہوتے ہیں جنہیں استاد لوگ مدرسہ میں بیٹھے سلجھایا کرتے ہیں، اکثر منطق اور الیات کے مسئلے بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ لوگ الجھایا کرتے ہیں اور ان کے بعد استاد کیا اور اس کے مسئلے کیا! اور پھر مسئلے تو علمائے کرام کا حصہ ہیں اور استاد تو

نہ فقیم، نہ فقیم، نہ محتسب نہ امیر

میرے دوستو! سماج سمجھتی ہے کہ اس نے استاد کو مدرسہ کی چار دیواری میں ہمیشہ ہمیش کے لئے بند کر کے محفوظ کر دیا ہے، علم کی اس کال کو ٹھہری میں وہ استاد اس کے مسائل آپس میں سرسجراتے رہیں لیکن اس ٹکڑاؤ کی گونج مدرسہ کے ایوانوں سے باہر نہ آتا چاہئے۔ تو پھر استاد کیا اور اس کے مسائل کیسے!

سماج کہتی ہے کہ ہم نے استاد کے لئے کام کرنے کو مدرسہ دیا پینتے کو بچے دے آگے کو میز اور پیچھے بیٹھنے کو کرسی اتنا شکوہ ہے کہ یہ نہیں کہہ دیا کہ کمانے کو روٹی اور پینے کو کپڑا بھی دیا، تو پھر اب کون سے مسائل رہ گئے۔

بملا جب گھوڑے کے لئے صاف ستھرا صطل موجود ہو گا۔ گاڑی اور بچاڑی لگی ہو کبھی کبھی دولتیں جھانسنے کو دو چار ٹو بھی ادھر ادھر بندھے ہوں جب چلنے کے لئے تعلیمی کوڑکی وہ چرنیلی سڑک ہو کہ دونوں آنکھوں پر کھینے چڑھا ہوتے بے فکر چلے جائیے اور ہانکے کو حکم تعلیم کا ہنر لگانے کی بھی ضرورت نہیں ایک ہیش کر دیجئے کہ تعلیمی گاڑی آسمان کی خبر لانے لگے۔

سماج سمجھتی ہے کہ استاد کیا اور اس کے مسائل کیا اور ہماری برادری بھی وہ شرمناؤ اور لجاؤ برادری ہے کہ ان کے چہرے ہمہ تن سوال، ان کی صورت ہمہ تن مسائل لیکن اس سوال کو معرض بیان میں لانے کے لئے نہ تو ہمت ہے نہ مکت۔

میرے دوستو! اب وقت آچکا ہے کہ ہم بتائیں استاد ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کے مسائل زندہ حقیقتیں۔ استاد کے مسائل، مدرسے کے مسائل، مدرسے کی چار دیواری کے مسائل نہیں ہیں۔ استاد کے مسائل زندگی کے مسائل ہیں جیسے زندگی کا ابوالہول ایک محمّد طلب ہمہ استغناء تیسم کا نشان استغناء سیہ ہائے ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ اس کا زمانہ حیات کا مقصد کیا ہے؟ استاد کے سامنے بھی تعلیم کی دیوی اپنے معنی نیز تہم سے ایک چیلنج، ایک اعلان مبارزت پھینک رہی ہے بتاؤ تعلیم کیا ہے؟ اگر زندگی کی تفسیر اکبر الہ آبادی کے یہ الفاظ ہو سکتے ہیں کہ ص

”بی اے بنے نوکر ہوئے نیشن ملی اور مر گئے“

تو تعلیمی زندگی کی تعبیر اس سے بھی مختصر الفاظ میں نیشن کی جاسکتی ہے کہ

بی ٹی بنے، ٹیچر ہوئے، ساری عمر یوں کو ڈپر چلتے رہے جیسے چلے کو لوکا ہیل  
ہینڈ ماسٹر سے جگ کی کچھ ساتھ والوں سے رہی اور آخوش نیشن ملی جی پی ٹی آؤ نکیل  
اور اس رہائی پر ہوئی اتنی خوشی، اتنی خوشی! کہ بس خوشی سے مر گئے عزم رہا قیدی جیل  
لیکن اگر تعلیم زندگی کے مترادف ہے تو اس کے مسائل بھی اتنے ہی ہنگامہ خیز اتنے ہی ہمہ گیر ہونا چاہئیں  
تعلیم زندگی سے یوں ہم آخوش ہے جیسے دریا کی لہر ساحل سے بغلیں مارتی ہے۔ مجلاہروں کے تلامذہ کی دھمک  
ساحل کے سینہ میں نہیں اٹھتی! میرے دوستو! آج ہمیں تعلیم کو انھیں وسیع معنوں میں لیا ہے۔

ہمارے دس میں علم اور زندگی کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ پورا سماجی ماحول ایک زندگی  
نہش تعلیمی اثر لئے ہوئے تھا اس میں تعلیم و تربیت کی وہ خوشگوار لیکن نامعلوم سوتیں جاری تھیں جو فرد کو اپنے  
دامن میں یوں لپٹائے ہوئے تھیں جیسے کسی محبت بھری گد میں بچہ ہلکورے سے رہا ہو۔ زندگی اور تعلیم ایک  
مسلل اور مربوط سلسلہ تھا ایک نامعلوم اور بے پناہ وسعتیں دوسری میں یوں سرایت کرتی جاتی تھیں جیسے جھپٹے  
کے دھند لگے میں پتہ نہیں چلتا کہ اندھیرا کہاں ختم ہوا اور جالے کی حد و کماں شروع ہوئیں تعلیم اور زندگی دو  
ایسے جزیرے نہ تھے جن کے مابین ایک دریائے فوارا اپنی طوفان نیز موجیں اٹھائے ہوئے ہو۔ اگر ایک دریا  
تھا تو دوسرا ساحل اگر ایک چولی تو دوسرا دامن۔

لیکن پچھلے سو سال سے ہمارے دیس میں ایک نئی تعلیم کا آغاز ہوا۔ وہ تعلیم کسی دوسری فضا میں اچھی تعلیم تھی۔ کامیاب تعلیم تھی لیکن میرے دوستو! کسی تعلیم کا کامیابی کا معیار زمان و مکاں ماحول اور فضا کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بجائے ایک دیو قیامت پیل کا درخت جو منطقہ حارہ کی ہواؤں کی گود میں پل کر برگ ڈبار لایا ہے جس کے پتے اس کی زندگی بخش گرم ہواؤں میں پھیلے اور پیل کر سبز روشنی کا بقعہ نور بن کر رو گئے۔ کیا یہی پتے شمال کی سرد ہواؤں میں سمٹ کر ان سوئیوں جیسے زینت شراب بن جائیں گے جن سے ان دیسوں کے درخت برغانی طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں کیا جب منطقہ معتدل کے خطوں کا عطربز گلاب جب شمالی آب و ہوا میں پہونچا جاتا ہے تو اپنی بو باس نہیں کھو دیتا میرے دوستو! جب باقی ایشیا پر ماحول اور فضا کا اثر مسلم ہے تو نظام تعلیم جوادی رشتوں سے زیادہ وقیمین زیادہ نازک واسطوں کے ذریعہ اپنے سماجی اور کچل ماحول سے وابستہ ہے کیسے اس سلسلہ سے بالا ہو سکتا ہے۔ میرے دوستو! ایک غیر معمولی طریقہ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کے سلسلے میں لوگوں نے وہی غلطی کمانی جو ایک معمولی کسان یا ابا خان بھی نہیں کرتا اس کا جو نتیجہ ہوا وہ سب پر نظام ہے تعلیم اور زندگی کا وہ نازک رشتہ سیاستدانوں کے غیر بہرہ ورانہ سلوک کی تاب نہ لاسکا اس کے رہنے آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگے اور ان دونوں میں ایک غیر شعوری اور نامعلوم طور پر تلج پیدا ہو گئی۔ ہمارے ملک میں تعلیم اور زندگی جھیل ڈل پر دو تیرتے ہوئے جزیروں کی طرح تھے جن میں کشش مناسیب شعری ایک ذرہ کو دوسرے ذرہ سے وابستہ اور منسلک کرتی ہے آہستہ آہستہ یہ طاقت منتقل ہوتی چلی گئی اور ہمارے تعلیمی جغرافیہ میں ایک طرف زندگی، عوام کی زندگی، ایک صحرائے پیدائش، ایک ریگستانوں کا سلسلہ، ایک بنجر وادیوں کا جو جم بیج میں ایک تلج اور دور پازئی تعلیم کا نخلستان میرے دوستو! اس عظیم انسان خلق کا پائنا آسان کام نہ تھا میں جانتا ہوں کہ پہلی صدی نے چند ایسے دیو قیامت المں پیدا کئے جنہوں نے اس وسعت کو پانے کی کوشش کی۔ وہ عظیم انسان شخصیتیں جن کی پیامبرانہ نگاہ نے اس روزانہ بڑھنے والی خلق کو پایا تھا جن میں ایسی انتھک خود اتحادی تھی کہ انہوں نے اس نخلستان سے دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھا دیا تو ایسی بھیانک کھڑی کو بار کر گیا جو عوام اور خواص کے مابین حائل تھا مگر پھر بھی انگریزی تعلیم داؤں کو نئی وقوتوں کا سامنا ہوا کوئی پودا ہم آہنگ آب و ہوا کے بغیر پروان نہیں چڑھا اور کوئی نظام تعلیم ایک شیش گھر میں رہ کر پنپ نہیں سکتا جب اس کے مصنوعی طریقوں سے کاشت کئے ہوئے پودوں کو صحرا کی سموم کا سامنا کرنا پڑا تو پہلے جھوٹے میں ہی سبزلا کر

رہ گئے۔ ان میں زندگی کے لئے وہ ادبی اور عقلی اقدار کا احساس پیدا نہ ہوا جن سے حیات ابدی کی ہلک ٹہنی ہے اور جن کی صحیح پرکھ اور جانچ اصل مسرت کا راز ہے

کیونکہ آج مشہور تعلیم اہل نے مدرسہ کو انسانوں کی بھٹی کہا ہے۔ اگر مدرسہ بھٹی ہے اگر ہزاری درگاہیں وہ ہلکتا ہوا شعلہ ہیں جس میں تعمیر حیات کا عمل جاری ہے تو اسے زندہ رکھنے والی دھونکی ہماری سماج اور کچل زندگی ہے جب تک اسے سانس ملتا رہے گا یہ زندہ ہے جس دن سانس بند ہو جائے گا یہ شعلہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا تو دوستو! ہمارے نظام تعلیم کی تشکیل کرنے والوں نے دھونکی تو بند کر دی اور امید یہ رکھی کہ بھٹی کا شعلہ جوں کا توں ہلکتا رہے گا۔

تعلیم کا سچا اور وسیع مقصد محض مدرسہ پورا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ تو سماجی اور معاشی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ہم محدود اور تنگ ادارہ ہے جو محض کتابی تعلیم کے لئے وقف ہے لیکن وسیع معنوں میں تو پوری زندگی ایک دلبان علم عمل ہے۔ اس کے مختلف اداروں سے شخصیت کی اُٹھان اور اس کی تکمیل نشرو نفا پاتی ہے زندگی کے ابتدائی دوروں میں انسان قبائلی گروہ میں رہتا تھا اور اس کی نئی پود غیر کتابی طریق تعلیم کی گود میں پلتی اور پروان چڑھتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مدرسوں کی چار دیواری میں ان کے ضوابط اور بندشوں کی پابند ہوتی گئی سب سے پہلے جس انقلاب آفرین معلم نے کتابی تعلیم کی بڑھتی ہوئی زنجیروں کو ٹھہر چڑھا دیا وہ روسو تھا اس کی فطری تعلیم کی صدائے بازگشت اب تک وقت کے ایوانوں میں گونج رہی ہے لیکن مدرسہ کو سماجی لحاظ سے زندگی سے بنائے گا سہاویوں صدی کے سر ہے۔ اور یہ تو یہ ہے کہ جب تک زندگی کی گرم اور دلولہ خیز لہریں مدرسہ سے یوں ہم آغوش نہ ہو جائیں جیسے کہ ایک محبت بھری ماں کی گود بچے سے ہوتی ہے اس وقت تک مدرسہ میں زندگی کی حرارت گھرنیں کر سکتی۔

میرے دوستو! آج ہمارے دیہی مدارس میں جو عام بے حسی اور زندگی سے سرد مہری پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی بڑھتا ہوا بعد ہے جو مدرسہ اور زندگی میں پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی اعداد و شمار کا مقیاس الحارث صریحاً بتا رہا ہے کہ ابتدائی مدرسہ کی چار دیواری سے کل کو فائز تحصیل طلبہ کا معیار کس تیزی سے گرنے لگا ہے۔ ہماری نئی نسل کی اکثریت مدرسہ سے باہر آ کر یوں ٹٹنا کر رہ جاتی ہے جیسے دیوالی کا

چند دل کسی جگر میں آگیا ہو۔

لیکن ایک نہ ایسا تھا کہ ہمارے مکتبوں کا فارغ التحصیل طالب علم باہر نکل کر اس سیاح کی طرح محسوس نہ کرتا تھا جس کے نغمے کو ہمالیہ کی بلندیوں پر پہنچنے سے پہلے جا رہے ہیں اور جس کا دم ہلکی ہوئے کی وجہ سے گھٹل جا رہا ہے اس کے برعکس اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی زندگی بخش فضا میں پہنچ گیا ہے جس میں علم و ہنر کی وہ سوتیلی جن کے سرچشمے مدرسہ نے کھول دیے تھے اب پوری قوت اور ہواؤں سے چل نکلیں گی۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب ہمارا سماجی اور معاشی ماحول تعلیمی اثرات سے یوں تناہوا تھا جیسے کسی کان کی نفاذ قیق ادوں کی آمیزش سے آتش و آغوش ہوتی ہے۔

ایک زمانہ میں آپ کے اپنے شمر میں ہی چند اسباب سے کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس نے پورے شمر کی فضا کو وسیع و وسیع الگ گیر مضمون میں تعلیمی بنا دیا تھا۔ انہیں مضمون میں جس میں اتنے مختصر ایک زمانہ میں عروس البلاء دکھاتا تھا باغراطہ شمروں کا سردار۔

کائنات کا وہ ترنم جس کے ہمہ گیر اثر سے صبح و شام، چاند اور سورج بھی بچ کر نہ نکل سکے۔ اس شمر میں پوری فضا کو مقرر قرار ہا تھا۔ رامپور کے موسیقی اسکول نے اس فن لطیفہ کی روایات کو ہی حیات جاوید میں بخشی اس کے ترنم نے عوام کے دلوں میں وہ سکون اور کیفیت، توازن و تناسب کی وہ روح پھونک دی جو یونانی افلاکین کے نزدیک کامیاب زندگی کا اصل راز ہے۔ کنگ اسکول نے تربیت صبح کے ساتھ تہذیب نگاہ کا سامان بھی فراہم کیا یہ محسن موت کی بجائے پورے اعضاء انسانی کی شاعری تھی میرے دوستو! ایسی مترنم فضا میں ہماں قدرت کا گراں بار عطیہ جہم انسانی خود ایک مجسم شہر اور پوری فضا ایک نغمہ ہو گوننا تاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہ فضا وسیع مضمون میں تعلیمی نصف تھی۔

کچھ سال ہوئے ایک دلالت کے ماہر تعلیم نے ان ہی صوبہ جات میں مدرسوں کا دورہ کیا اور دو گے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے مدرسوں میں مسرت اور خوشی کی فضا نہیں۔ ہمارے درس بے کیف۔ ہمارا ماحول بے مہر ہے۔ اگر اس قسم کا ماحول جس کا میں نے ذکر کیا ہے ایک حد تک معصومانہ انداز میں ہم بچوں کی دنیا میں پیدا کر سکتے تو شاید ہم پرے یہ الزام دہل جاتا۔ بہر حال آپ دیکھیں کہ ہمارے پرانے تمدن میں ایک حد تک زندگی اور تعلیم کس طرح

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے شانہ بشانہ گامزن تھیں۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں ہندوستانی موسیقی کے اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ ہمارے ماہرین تعلیم میں یہ احساس لطیف کافی دیر کے بعد بیدار ہوا ہے تاہم میں کہوں گا کہ علم موسیقی میں اعلیٰ اسناد پائے ہوئے حضرات (اور اب تو موسیقی میں ڈاکٹری کی سند بھی ملنے لگی ہے) اس فن لطیف کو پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اتنے کامیاب نہ ہوں گے جتنا رامپور کا ایک شہری۔

اور اس کے بعد آپ کا مشاعرہ ہے۔ وہ موثر تعلیمی ذریعہ جس کی امداد سے عوام کا ادبی کچل میا اور پنجا ہو جاتا تھا۔ پانی کے سیلاب کے برعکس ان ادبی کارگزاریوں کی سطح خواص کے معیار علم کے مطابق بلند ہوتی تھی اور اپنے ساتھ عوام کے خس و خاشاک جیسے مذاق کو بھی بلند کر دیتی تھی اس دلچسپ اور محبوب ذریعہ سے عوام میں توازن موت کے ساتھ ساتھ تناسب خیال کا بھی عام مذاق پیدا ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پچھلے زمانہ کا وہ ان پڑھ شہری جس نے اس تاریخی شہر میں غالب اور امیر مینائی، جلال اور داس کی آکھیں دیکھیں ہوں گی، خس و خاشاک اور ذوق سلیم میں آج کل کے کتنے کلمے پڑھوں سے بڑھا ہوا ہوگا۔ ہمارا ادب کتنی ایک مثالیں ان شعرا کی میا کرنا ہو جو نے ایک عرب بد کی طرح فطرت کی گرد میں یا ایک کچل میا اور اس سے متاثر ہو کر شاعری کی اور ایک حد تک کامیاب شاعری کی۔

اور ان سب کے بعد لیکن ان سب سے اہم مدرسہ عالیہ رامپور ہمارے پرانے نظام تعلیم کا وہ روشن چراغ ہے جس نے ایک اندھیاری دنیا میں، ایک ڈھلے ہوئے زمانہ میں علم و مہر کی کرنیں دوڑا دیں تھیں جس نے ہمارے ملک میں غناظ اور بغداد کی روایات زندہ کر دیں تھیں جس نے یونیورسٹی کے تصور کو حقیقتاً تعلیمی دنیا کے لئے اسلام کا خاص عطیہ ہے ایک روشن حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا۔ وہ تبدیلی علم جس کی تو پر انفاستان، خوارزم، بخارا اور ترکستان سے پروانے کھینچے پلے آتے تھے جو خواص اور عوام دونوں کے لئے سہمہ چشمہ ہدایت تھا۔ وہ ایسا خزانہ العلوم تھا جس کی سوتیلیاں آبشاروں کی طرح تھیں جو ملناؤں کے عہد میں ان کی حسن تدبیر سے ہر صحن اور ہر باغ میں باغ میں جاری و ساری تھیں، اس کے اساتذہ نہ صرف علمی دنیا میں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی ایک مخصوص حیثیت رکھتے تھے، آج بنگال میں انھیں ڈھونڈ سکتی ہیں تعلیمی دنیا میں ان کے منصب، ان کے رتبے کو تلاش کرتی ہیں لیکن نہیں پاتیں، مولوی عبدعلی فرنگی علی بحر العلوم، علم و فضل کا وہ درساؤں کا خزانہ جو اپنی زندگی کے

ایک دور میں دکن پہنچا تو رئیس نے ان کی پاکی کو کندھا دے کر سادات دارین جہل کی مولوسی علیٰ حق صاحب خیر آبادی خیر آباد اسکول کے طفیانہ روایات کو زندہ رکھنے والے بزرگ، ودنازک مزاج اور آزانہ دانش عالم جن کی وضعداریوں کو کچھ راسپور کی سرزمین ہی خوب بھاسکی۔

جن کے لئے والی ملک نے اپنے خزانے کا سناٹا کھول دیا تھا جن کی نفاست طبع اور حسن ذوق کے بار کو روکا۔  
کی قدر دانی اور فیاضی ہی اپنا سکی وہ جب روٹھے تو والی ملک کے بنانے سے منے اور جب منے تو ایک زمانہ کے چہرے پر تبسم کیلئے لگا۔

میرے دوستو! آپ کے شہر میں اس قسم کے زندہ ادارے تھے جن سے لہریں ابھر کر پورے ماحول کو متحرک کر رہی تھیں آپ نے بزرگان دین کی تعداد میں دیکھا ہو گا کہ ان کے چہرے کے گرد چاند کا ہالہ بنا ہوا ہے اس قسم کا غیر محسوس اور غیر مرئی دائرہ فیضان ہر عالم اور ہر ادارے کا ہوتا ہے۔ عوام کے دلوں پر غیر شعوری اور شعوری طور سے ان کی ضیاء منعکس ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے پرانے اداروں، ہمارے پرانے اساتذہ میں یہ خوبی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں اخلاقی اور کچرل لحاظ سے اس قسم کے مراکز نشر تھے جہاں سے علم و فضل کی لہریں اٹھتی تھیں اور پورے ملک کو شاداب و سرسبز کرتی تھیں۔

آپ کہیں گے کہ آخر ان اداروں کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ یہ وہ ادارے تھے جو اپنے محدود دائرے میں ہماری سماجی اور مذہبی زندگی کے فطری اور طبعی نتائج تھے۔ یہ ادارے فطری جوش و شہسواری سے ایک زرخیز مٹی سے اُگے اور اپنے برگ و بار سے ماد گیتی پر سایہ لگن ہوئے۔ ان کے اساتذہ کے درس بھی وہ سبق نہ تھے جو ایک شرمایا لایا سا استاد احساس خودی کی گھبراہٹ سے بے چین اور پریشان استاد ایک مدرسہ کی چار دیواری کے اندر محفوظ کر دینا چاہتا ہے یا ایک جہلانی ہونی شعل کی طرح جسے کوئی دو فوں ہاتھوں سے ڈھانپنے ہوئے ہو۔ ان اساتذہ کے درس فیضان قدرت کے کھلے خزانوں کی طرح جاری، چاندی و سونے کی طرح ضیا لگن، بادل کی طرح گوہر بار تھے ان کے اساتذہ بڑا ڈنڈا کے اساتذہ نہ تھے جس نے کہا ہے کہ جسے کچھ آتا ہے کرتا ہے اور جسے کچھ نہیں آتا پھرتا ہے۔ میرے دوستو! یہ اساتذہ صحیح معنوں میں اساتذہ تھے ملک و قوم کے اخلاقی اور علمی لیڈر تھے ہمارے پیشہ کو ان سے فخر تھا۔ انھیں ہمارے پیشہ سے افتخار حاصل نہ تھا۔



آپ اس داستان پارینہ کو سنتے سنتے اٹھا گئے ہوں گے لیکن نقش اس کے پس منظر کے ذریعہ سے ہی زیادہ روشن زیادہ معنی خیز ہو سکتا ہے اور ہر سماجی عمل اس کے تاریخی ماحول کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ ایک اعلیٰ برائے بکڑے پر سب سے کتنے نمایاں کتنے بدنام معلوم ہوتے ہیں لیکن صبح کے وقت پورب سے ابھی ہوئی روشنی میں افق کے درختوں کے برگ و بار کتنے صاف کتنے واضح ہوتے ہیں!

میرے دوستو! میں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ پچھلے زمانے میں استاد کے مدد و معاون کتنے وسائل کس قدر ذرا ملے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ تعلیم خود زندگی سے گہرے انداز میں مربوط تھی نصاب اور ذریعہ تعلیم ہمارے تمدن کا ہر ہون منت تھا۔ بچہ اگر مکتب سے محض نوشت و خراں دیکھ کر آتا تھا سماجی ماحول میں وہ زندگی بخش اثرات موجود تھے جو اسے حسن ذوق اور طبع سلیم اور جماعتی اور اخلاقی لحاظ سے ایک سنگتہ شخصیت عطا کر دیتے تھے پھر پرانے زمانے میں استاد یا گرو کا مرتبہ خود حقوق، وقار، اثر اور تہ کا ایک جاں گھیرے ہوئے تھے۔

اس پس منظر کے آئینہ میں نئے استاد کو دیکھو اس جی ٹھا دینے والے ماحول کو دیکھو جس میں وہ کام کر رہا ہے۔ سماج میں اس کی جگہ کو دیکھو جو مسند سے کہیں پیچھے اور جوتیوں سے ذرا آگے ہے۔ اس کے مالی معاونہ کو دیکھو جو چوکیدار سے کچھ زیادہ اور پٹواری کی آمدنی سے کہیں کم ہے اور اس کے بعد دل پر ہاتھ رکھ کے بتاؤ کیا دوبارہ تم وہی الفاظ اسی شان استغنا سے دہرا سکتے ہو کہ استاد کیا؟ اور اس کے مسائل کیا؟ استاد کے سامنے تعلیمی پس منظر کچھ بھیا کم سا ہوتا جا رہا ہے۔ قدیم روایات کے سارے ایک ایک کر کے افق کے پیچھے ڈوبتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نئی امیدیں ابھر نہیں رہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری تربیت گاہیں استاد کو ان نئے حالات میں ایک نئے تعلیمی جادے کے لئے کہاں تک تیار کر رہی ہیں؟

کسی نے کہا ہے بچہ کو باغ بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بچے کو بچہ بننا سکھائیں اور استاد کو استاد بننے سے پہلے ضروری ہے کہ اسے انسان بننا بتائیں۔ ہر پیشہ انسان کی عملی زندگی کے کسی ایک آئیڈیل کی نمائندگی کرتا ہے اور جب ہم ان اعلیٰ تصویری مقاصد کو اداروں میں متعارف کر دیتے ہیں تو محسوس کے سایے ان پر گہرے ہونے لگتے ہیں وہ داخلی روشنی جو ان میں جھللا رہی تھی آہستہ آہستہ مدہم پڑتی جاتی ہے اور بتدریج ہمارے ادارے ہمارے آئیڈیل کے مقبرے ہو جاتے ہیں

مجھے ڈر ہے ہمارے لک کے ٹرننگ کالوں پر بھی ایک حد تک یہی الزام مایہ ہو سکتا ہے۔ ان اداروں میں آزادی اظہار شخصیت اور نشاط عمل کی خوش آئند صدائیں اٹھتی ہیں اور ان کی چار دیواری سے ٹکرا کر جانتی ہیں۔ مجھے اپنا پرانا کالج یاد ہے جہاں ہمارے کمرے بائیں، ہمارے استاد، اساتذہ ممبر، ہماری ریاضت جہاں طرہی ڈرل کلاتی تھی۔ اتنا شکر ہے کہ انہوں نے ہمارے ورزش ماسٹر کو ڈرل سار جٹ اور ہمارے بورڈنگ سہنڈنٹ کو کمار ٹرا سٹر جنرل کا خطاب نہیں دیا تھا۔ یہ بھی شاید انگساری تھی کیونکہ ظاہر میں تو یہ دونوں استاد ان فوجی افسروں سے کم نہ تھے۔ حیرانی ہے کہ ایک ہاتھ سے ہم آزادی کا گمان بہا عطیہ بچہ پر ہی نہیں ہر بالغ شہری پر بھادور کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے وہی فطری حق استاد سے بھیین رہے ہیں۔

جس استاد سے ایک ذمہ دار انسان کی طرح سلوک نہیں کیا گیا ہے اپنے آؤ پر دوسرے کرنا نہیں سکایا گیا ہے ایک سخت ضبط کے فوادی خلکنجیں رکھا گیا ہے کہ یہی تخلیقی خود اظہاری اور سماجی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔ کیسے ایک نئی تعلیم کا طبردار ہو سکتا ہے۔ ایک نئی تعلیم نہیں ایک نئی زندگی کا دار و دروہ بچوں کو ایک نئی سماج، ایک نئے جمہوری نظام کیلئے کیسے تیار کر سکتا ہے۔

مگر میں ان پرانے فرسودہ اداروں میں ان کی سنگین دیواروں میں بھی زرخیز پڑتے دیکھ رہا ہوں کہیں کہیں درزوں اور شکافوں میں سے نئے امور کی روشنی پھوٹ نکلی ہے۔ آپ لوگ جو ایک نئی تربیت گاہ میں کام کر رہے ہیں خوش قسمت ہیں۔ آپ کے ادارے کی اٹھان نئی تعلیم کے دور میں ہوئی ہے پرانے ادارے قدم آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کی نگاہیں ماضی کی طرف لگی ہیں اور پرانے ضبط اور روایات کی باری بھر کر زنجیریں ان کے پاؤں میں ہیں۔

اسی طرح مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس روشن خیال تربیت گاہ سے باہر جا کر تم بھی کبھی کسی ایسے مرتد گاہ میں نہ پہنچ جاؤ جہاں کے مجاہد کوئی پرانا ہیڈ ماسٹر جہاں کا سجادہ نشین کوئی سال خود وہ سکرٹری ہو جس پر پرانے تجربہ بچی آتی تھیں جڑ بھکی ہوں کہ وہ خود بھی اسیوں کا ایک جٹا پھرنا بوت ہو۔ وہ ہیڈ ماسٹر آپ کو اسکوئی زندگی کے پہلے دن ہی ایک مربیانہ انداز میں ٹپک کے ایک گوشہ میں لے جائے اور تہا دی آنگھوں میں آنگھیں ڈال کر اس انداز سے کہے گویا تعلیمی زندگی کے معنوں کو ایک تو اس نے سمجھا ہے اور کچھ کچھ اس کی امداد سے تم سمجھنے کی کوشش

کہ ہے ہو۔ وہ یہ کہ گاویمو بیٹا اپنے ٹریننگ اسکول کی باتوں کو ذرا تہ کر کے رکھ دو تمہارے سامنے یہ عمل زندگی ہے زندگی، یہاں ٹریننگ کالج کی ہوائی باتوں سے قطعاً نہیں ہوتا بچوں کو پڑھانے کا بس ایک ہی طریق ہے میاں باقی جتنے طریقے تم نے سیکھے ہیں وہ ان ہی تعلیم والوں کے چوتھے میں جیسے ہمارا خدا ایک ہے اور رسول ایک ہے پڑھانے کا طریق بھی ایک ہے اور وہ ہے ضبط اور اس کے گرد وہ ہیں۔ ایک تو نوٹس کے کو جماعت میں کبھی تشریح نہ کرنے دو اور دوسرا دراز کاٹنا نہ کر دیکھنا یہ بہت اہم ہے اگر اسے نظر انداز کر دو گے تو دھوکا کھا جاؤ گے دوسرا یہ کہ کسی بچے کو جماعت میں کبھی سونے نہ دو اگر تم نے ان دونوں اصولوں کا امتیاز رکھا تو دیکھ لینا کہ چند روز میں بچوں کا ناک میں دم آجائے گا واللہ ناک میں دم اور وہ جماعت میں صرف وقت گزارنے کے مقصد سے اس بے جگری سے کام کریں گے گویا زخمی غلام میں یہ ہے تیس سال کے تجربے کا بخور۔ میرے دوستو! تم نے شاید پولیس کے تھوڑے ڈگری طریقے تو سنے ہوں گے یہ تعلیمی تھوڑے ڈگری ہے۔

اور اپنے نازل اسکول کے جوش و ولولہ کے بعد یہ برفانی غل۔ اس سرد آبی کے بعد جب اپنے ساتھیوں اپنے شرمکائے کار کو دیکھو گے تو نظرائے گاہک ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں زندگی کا شراہ بھڑکا کیا سکیا بھی نہ لیتا ہو گا بلکہ سائوں پہلے بن کر ٹھنڈی راگھ بن چکا ہو گا یہ لوگ کم تھوڑے کام کر رہے ہوں گے اور اس کی کام احساس ان کے چہروں پر نمایاں ہو گا نہ تو ان کے ماتھے پر عزم صبح، نہ ان کی نگاہوں میں جوش اور ولولہ نہ وہ چمک اور ذہنی جھلک جو نئی پود کے قاعدین اور ان کے راہنماؤں کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس آدمی کا پیشہ ان کے لئے کیا ہے ایک طوفان کی بجائے ہوئے کی آخری پناہ گاہ کی تلاش کا وہ طوفان جس کی تباہ کاری اپنے پیچھے نہ تو ذہن بیداری چھوڑتی ہے اور نہ علمی ذوق ہی!

ایک زمانہ دو بھی تھا کہ یہی لوگ اپنے مدرسوں میں طلباء کی برادری کے شاندار تارے تھے۔ ان کے دل بھی جوش اور ولولہ سے لبریز تھے انھوں نے بھی اعلیٰ امتیازات حاصل کئے تھے۔ ان کے سینوں میں بھی زندگی کا طوفان اپنی قوت سے غلام خیز تھا۔ ان میں بھی شوق مل تھا ذوق جو تھا اور اب کیا ہیں۔ اب مدرسے نے انھیں ایسے چوس لیا جیسے کسی ندیدہ بچہ نے سنگترے کی پھاٹک کو چوس لیا ہو۔ انھوں نے اسکولی زندگی کا تھکا دینے والا راستہ کٹ کر کٹے کر ہی لیا اور اس طویل طویل سفر کو پورا کرنے کے بعد ان کے سامنے کیا تھا ایک کم اینیشن یا پراڈیٹ فنڈ



اب توجہ میں لے شروع کیا ہے اس کو سن لو دیکھو بعد میں یہ نہ کہنا کہ تم سے کسی نے کہنا نہ تھا»

میرے دوستو! پہلے سائل ہمارے اصول تعلیم کے مسائل تھے یہ تمہاری عملی تعلیم کے مسائل ہوں گے۔ ان مسائل سے گہرا نہ جاننا سنا ہے کہ دریا کا بدترین تلامذہ ترقی کی سال کا پتہ دیتا ہے اور رات کا تاریک ترین حصہ صبح کے اچانکے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

قطعی دنیا میں ایک نیا ستارا۔ ایک نیا آسمان ابھرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ستارہ آزادی ہے کسی کی آزادی کا ستارا ہے کسی نے کہا ہے کہ انیسویں صدی انسانیت کی جمہوریت کی صدی ہے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ بیسویں صدی بچہ کی آزادی کی صدی ہے۔ اس ستارے کی کرنیں ابھی ابھی افق سے اُدھر روشن ہو رہی ہیں۔ انہوں نے اب تک ان اداروں کو جلا لیا ہے جو ہماری قطعی دنیا کی چوٹیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ ابھی اس کی گرم محبت مجھے بوسوں نے ان کے میناروں اور گنبدوں پر کندن جیسا رنگ ڈور دیا ہے۔ مگر دوستو! فطرت کے کوسا روں میں بھی ایورسٹ یا کینچن چنگا تو ایک دوہی ہوتی ہیں مانا کہ ان کی بلندیوں میں ایک روان ہے ان پر کاش کے دیوتا آنکھ بھولی کیلتے ہیں مگر اصل زندگی کسی شاواہیاں۔ اس کے گرد اترتے اس کی تنگیں دشواریاں اس کی جاندار پر شکوہ آتشا روں کی گونج وادیوں میں ہی ہوتی ہے میرے دوستو! ہمارے ملک کی قطعی وادی بھی وادی مرگ سے کم نہیں۔ اس نئی صبح کا دھندلکا ہوا تک اس کی بے پناہ گہرائیوں اس کی دھند اور اندھیا رے کو پار نہیں کر سکتا ہے ابھی تک تو صرف اتنی روشنی ہے کہ جس سے ہمارے اندھیرے کا اور بھی احساس اس ظلمات کا اور بھی جاری ہو کر کم بوجھ پڑ گیا ہے میرے دوستو! اسی احساس اسی بے چینی۔ اسی موجود قطعی حالات سے رُخ میں ایک نئی تعلیم بلکہ ایک نئی زندگی کا پیغام چھپا ہوا ہے۔

ابھی تک صبح کے دم سے وادیوں کے رہنے والوں پر کہیں لمبے لمبے گہرے گہرے سایے پڑ رہے ہیں جو آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے ہیں کہیں کہیں کسمپخت کیں کچھ بے چینی سی پیدا ہو رہی ہے۔ اس وادی کے ایسے گوشے ہیں جہاں رات کی تاریکی پہلی ہوتی ہے یہ رات نیند کے ماتوں کی رات نہیں ہے یہ ایک پریشان کن اندھیرے کی رات ہے نیند کے ماتوں سے تو یہ بھی امید ہے کہ صبح اٹھے ہی تازہ دم ہو کر منزل مقصود کی راہ لیگی یہ تاریکی جو ہمارے ادھ کچے، خام اور گنگا جمنی تعلیمی نظریے اور عمل کی تعبیر ہے اس اندھیرے میں نیک اور مخلص لوگ ٹانگ ٹوٹیاں مار رہے ہیں۔ اس اندھیرے میں ہر طلبا کو ایک سی ڈگر رانگنا مانتے ہیں۔ اس اندھیرے

میں ہیں اس آسانی کو کا پتہ نہیں چلتا جو نہی سی جان کے سینہ میں روشن ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ یہ اندھیرا  
 رٹائے ہوئے سبتوں، طوطے کی پڑھائی کا بے سمجھ اور سخت گیر ضبط کا، اندھا دہندش یا زبانی کام کا اندھیرا ہے۔  
 ان حالات میں استاد کا کام کیا ہے اس کا کام یہ ہے کہ اس اندھیرے میں بھی اپنی نگاہ ان ستاروں پر  
 لگائے رکھے جو دوسرے اسے منزل مقصود کا پتہ دے رہے ہیں لیکن میرے دوستو ستاروں پر ہی نظر جائے  
 رکھے گا ممکن ہے کہ کسی ٹوکرا کو گر جائے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری نگاہ ستاروں پر ہی ہونی چاہئے مگر دوستو ہماری زمین  
 بھی تو ایک ستارہ ہے اچھا استاد کا سیلاب استاد وہی ہے جو سامی ستاروں اور ارضی ستارے کے بیچوں بیچ وہ  
 راستہ ڈھونڈ لکھے جو کائنات کی طرح اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔

میرے دوستو اعلیٰ شاہراہ پر سب سے روشن اور سب سے شاندار روشنی کا مینار تعمیر حیات کا مینار جو  
 دوسرے انیس یا نہ انیس گرام سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ استاد کا پہلا اور سب سے اہم فرض تعمیر حیات ہے انسان کو  
 کو انسان بنانا ہے اس کا کام تعمیر حیات ہے اس کی مرمت نہیں ہے اس کی بچہ گیری یا ہنگامی لگانا نہیں ہے جسم  
 انسانی کی روگری یا کفش دوزی طبیبوں کے حصہ میں آئی ہے مگر استاد کا کام صحیح معنوں میں تعمیر حیات ہے۔

تعلیم کا عمل دودھاری تلوار ہے اور اس کے دو پہلو ہیں جہاں ایک طرف استاد بچہ کی تعمیر حیات میں  
 مشغول ہے، دوسری طرف بچہ ایک حد تک ایک چھوٹے پیالے پر لیکن شاید زیادہ موثر انداز میں تعمیر حیات کے  
 کام میں مصروف ہے۔ وہ تعمیر حیات کس کی ہوتا ہوگی؛ شاید اپنے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لوگ اس بارے میں  
 اختلاف کریں لیکن ایک ٹریننگ کالج کے استاد کی حیثیت سے ذاتی تجربہ کی بنا پر میں تو یہی کہوں گا کہ بچوں نے اپنی  
 ہمت سے ان نوڑسیکوں یعنی پیوٹن ٹیچر کو اکثر اتار دیا انسان تک بنا دیا ہے  
 مٹا شدن چہ آساں انسان شدن چہ مشکل؛

یہ تو آپس میں آدے کا بدلہ ہے آپ بچوں کو انسان بنانے کی کوشش کریں لیکن یہ اننا پڑے گا کہ وہ بھی آپ کو  
 ٹریننگ اسکول سے نکلنے سیکھتے انسان بنا کر چھوڑیں گے اور دوستو یہ انسان بنانے کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے  
 اس انسانی عمل کے قطرات میں نے (ہسپن کی شکل میں) اکثر نوڑسیکیوں کے منہ سے ٹپکتے دیکھے ہیں اور انہیں  
 اس مجاز سے صاف ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے جو اتفاقاً چاک کے سفید پوڈر سے بھرا ہوا استاد کے ہاتھ آ گیا تھا

میرے دوستو ایک استاد کی شخصیت کا اثر گہرا اور دیر پا ہوتا ہے۔ یہ اثرات کسی کماری جیل کی تہ میں ان شیریں چشموں کی طرح ہوتے ہیں جو ان دیکھے اپنا خوشگوار عمل دن رات جاری رکھتے ہیں کبھی کبھی تنہائی اور پاکیزگی کی اندھیری میں ایک بجلی سی چمک جاتی ہے۔ ہمدردی نگاہوں کے سامنے گزشتہ ایام کی کوئی تصویر ابھر کر ذہنی پردے کے سامنے جلوہ آرا ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر بسے کسی پرانے استاد کی جس نے روزمرہ کے تدریسی چکر سے ذرا اوپر اٹھ کر زندگی کے ستار کو اس جوش اور گہرائی سے چھیڑا کہ اس کی لرزش اب تک روح کے تاروں کو مرتعش کر رہی ہے مگر ہم ایسی یادوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان لمحوں میں ہمارے ذہن میں نصاب کا کوئی ایسا مضمون نہیں آتا جو اس استاد نے پڑھا یا تھا نصابی عنصر زیادہ دیر پا نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات تو ہم ایک حد تک لکھا پڑھا جملہ دنیا چاہتے ہیں اور نہیں سبلا سکتے تعلیمی یادوں کا دیر پا اور مستقل پہلو وہ گہرا اثر ہے جو ایک زوردار استاد کی شخصیت اپنے طالب علم پر چھوڑ جاتی ہے بقول ایک مصنف کے اس اثر کے تحت اس نوجوان میں ایک نئے انداز کی ہستی تخلیق ہو جاتی ہے لیکن کتنے استادوں کو پتہ ہے کہ وہ کتنے نوجوانوں کے دلوں میں کتنے انسانوں کی زندگیوں میں دوبارہ جنم سے رہے ہوتے ہیں اور ابدی زندگی پائے ہوتے ہیں مگر ہم اپنی زندگی کے دوسرے واقعات پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس قدر گہرے اثرات دوسرے واقعات کم چھوڑتے ہیں بہت کم اکثر ادب یا آرٹ کا کوئی شاہکار، بچپن میں چھوٹی ہوئی والدہ کی یاد یا کوئی نفسیاتی زلزلہ جس نے زندگی کی بنیادیں تک ہلا ڈالی ہوں۔

کسی استاد کا ایک طالب علم جب قوم کا محبوب قائد بن گیا تو اس کی شہرت سن کر استاد نے کما حقہ طور پر سنی پر خدا نے علم سے موسیٰ کی طرح ہم کلام تو میں ہوا تھا میرے شاگرد نے تو بارون کا کام کیلئے۔ اس نے دو پیغام قوم کو پہنچا دیا اور بس۔ میرے دوستو اگرچہ اس جملہ میں ایک قابل معافی خود پسندی کی جھلک ہے لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ضرور ہے۔

استاد کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے الفاظ یاد رہیں گے۔ مدتوں نہیں شاید صدیوں۔ میرے دوستو کوئی نیکی کا کام کوئی نیک نیت کام بیچہ بیک نہیں جاتا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان کسان نے کرچن کو لٹا ڈنارک کے کسان استاد سے کہا کہ آپ کی باتیں سننے میں لطف تو بہت آتا ہے لیکن بعد میں آپ کے الفاظ یاد نہیں رہتے بار بار کوشش کرتا ہوں مگر ملتے ہی نہیں۔ کو لٹا بولا۔ کوئی بات نہیں یہ الفاظ کہیں گم نہیں ہوئے کہیں نہ کہیں تم ہی موجود ہیں

اپنے وقت پر وہ خود بخود نہیں بھلیں گے اور تمہیں پتہ بھی نہ ہوگا کہ وہ کہاں ہیں جب تم کہیں بڑے ہو تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلنا کہ کبھی کبھی گئے مگر تاہم وہ اُگتے ضرور ہیں۔

اور پھر میرے دوستو! الفاظ بھی تو آخر کار ایک ظاہری لباس ایک اوپری سجاوہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ ظاہری چیز اینٹ اور گارے کا گھر زندا بن جائے جو اس میں مندر کی تبدیل کی کہیں اپنے ہی مسئلے یہ لباس بھی ان رنگین پردوں کا۔ ان رومانی لطیف نیتوں کا ہونا چاہئے جو حسن روح کی رنگینی کو دوا تشر کر دکھائے لیکن پھر بھی لباس آخر لباس ہے۔ جب تک لباس والا نہ ہو تو لباس کیا کام آئے گا۔ میرے دوستو! دیکھنا یہ ہے کہ ان الفاظ کی روح کیا ہو وہ روح جو اکثر اپنا لباس خود بنا لیتی ہے۔

روح اور الفاظ جذبہ اور پرورش طریق انمار یہ دو اصول ہیں جن کی امداد سے معلمین نے قوموں کو زندہ کیا ہے۔ یہ بیان غیر طریقہ یا لکچر تھو جو ہر ٹریننگ اسکول اور کالج کے لئے تختہ ستم ہے ان کے ہاتھ میں کامیاب ذریعہ گرنٹ وگ ڈنارک کا معلم جس نے اپنی قوم کو پچھلی صدی میں نئی زندگی بخشی انھیں دو اصولوں کے ذریعہ اپنی قوم کو بیدار کر رہا تھا ایک تو اس کے پیغام میں عوام کی روح پوشیدہ تھی اور دوسرے اس کے زندہ اور جاندار الفاظ زندہ الفاظ سے اس کی مراد اس ذاتی تعلق اور جذبہ سے تھی جو استاد کے سینے سے بچہ کے دل میں گھر کر آتا ہے اور اس کے من کے مندر میں، اس کی اس مقدس عبادت کا پیر زندہ شعلہ بھڑکا دیتا ہے۔

گرنٹ وگ کے نزدیک استاد ایک اونچی روحانی قوت کا ذریعہ انمار اور آواز کا تھا۔ اس کے ذریعہ سے روحانی دنیا کی تڑپا دینے والی قوت ہماری دنیا میں زندہ اور جاندار الفاظ کے دہارے میں بہہ کر آ رہی تھی اس کا طریق یہی ہے کہ سب سے پہلے استاد دل کو بیدار کر لے والے ترنم اور نغمے سے تعلیم شروع کرے۔ اسے انتہائی روشن اور زندہ تقریروں کے ذریعہ پڑھانا چاہئے۔ اس کے بچہ میں زندہ واقعات جگمگا رہتے ہوں اس طریق پر پڑھانے سے وہ محض فکر اور سمجھ کو اپیل نہ کرے بلکہ اس کا ہر لفظ روح کے بند درپوں پر ایک ٹوک ہو۔

اور جب استاد دیکھے کہ اس کی روح کی گمراہیوں میں زندہ الفاظ تڑپ رہے ہیں اور قوت انمار کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں تو وہ اطمینان رکھے کہ اس کے الفاظ اور سرزمین پر نہیں پڑیں گے ایک دھکتے



ہوئے انگارے کی طرح کہیں تو اقدار کی خس و خاشاک میں آگ لگا دیں گے۔ اسی خاک سے زمین پھر ایک دفعہ زندگی خیز اثرات سے مترنم ہو جائے گی اور اس میں تازہ پھول لہلہانے لگیں گے اور کہیں یہ شعلہ بجلی کے ان پوشیدہ مجمرات کی طرح ہو جائے گا جو بن دیکھے اپنی زندگی بخشی حرارت ہو بچا رہے ہوں۔ میرے دوستو! اگر ننگ ایک شاعر علم تھا اس نے شاعری کے انداز میں علمی کی ایک معلم کے انداز میں شاعری نہیں کی۔ وہ لکچریتھ کا شاعر تھا، شاعر یعنی اپنے وجدانی قوت سے روح کو اپنا لینے والا، میرے دوستو! اسی معنی میں ہم سب ایک حد تک شاعر ہو سکتے ہیں، ایک حد تک تخلیقی کارکن ہو سکتے ہیں جس حد تک میکا کی طریق عمل، روزمرہ کے چکر سے اپر اٹھتے جائیں گے ہم تدریس کی زمین پر ایک شاعر ہوں گے۔ دوستو! تم نے ڈانس پلان بھی پڑھا ہو گا۔ تم نے نامتوری میتھڈی یاد کیا ہو گا۔ یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں مگر وہ استاد کیا جو اپنا طریق اپنا ڈھنگ خود تخلیق نہ کر سکے فن تدریس ایک آرٹ ہے اور استاد ایک آرٹسٹ! تمہیں بھی طریق تعلیم کے محدود لیکن دلچسپ دائرہ میں اس تخلیقی عمل کو جاری رکھنا ہو گا۔

تمارا آرٹ اس قبیل کا آرٹ نہ ہو گا جیسے ادب، مصوری یا سنگتراشی میں ان میں آرٹسٹ کا مقصد اپنے روحانی تاثرات کا اظہار ہے۔ یہاں وہ اپنے مخصوص انداز میں، اپنے مخصوص ذریعہ اظہار میں اپنی روح کے اسرار کو مل کے رکھ دیتا ہے۔ وہ پتھر یا لٹا کو اپنی قوت تخیل کی امداد سے مجسم یا رنگین بنا دیتا ہے ایک سنگتراش پتھر کو اپنے تخیل کے مطابق عیاں دل چاہے تراش سکتا ہے۔ مگر استاد بچے کو اس کی فطرت کے خلاف کوئی رجحان نہیں دے سکتا۔ اس کے برعکس استاد تو ایک ایسی فوج کا جنرل ہے جو بچے کی روح کے میل میں اخلاقی اور میاری زندگی کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اس کے دست و بازو بچے کے رجحانات ہیں جو اس کے تعلیمی نتائج کے خیال کے حصول میں اس کے معاون ہیں اور اس کے دشمن دو میلانات ہیں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اس کا فرض ان دشمن عناصر کا مقابلہ کرنا ہے اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک جنرل کو صرف طریق جنگ کا ہی پتہ نہ ہونا چاہئے بلکہ اسے میدان جنگ کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہونا ضروری ہے اسے اپنے دوستوں کو تازہ دم اور بلند بہت رکھنا چاہئے انہیں محفوظ جگہوں اور مناسب کہیں گا ہوں میں رکھنا چاہئے۔ دشمن کی طاقت کا اسے اندازہ ہو اور وہ حملے کے لئے ہمیشہ اچھے موقعوں کی تلاش میں رہو کرشن ٹائمز

کی رائے میں تعلیم کا آرٹ یہ ہے۔

لیکن میرے دوستو! تعلیم کا آرٹ محض جنگ کا آرٹ نہیں حقیقی معنوں میں یہ اس کا آرٹ ہے۔ اگر ہم اس کے عملی پہلو سے گزر کر اس کے نتائج اور اس کی کامیابیوں پر غور کریں تو ہمارے لئے ایک اور تشبیہ شاید زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

میری رائے میں جس آرٹ سے تعلیمی کا پیشہ سب سے زیادہ ملتا جلتا ہے وہ باغبانی کا آرٹ ہے یہ تعلیمی کمائی کی وہ تاریخی تشبیہ ہے جس میں نئی تعلیم کی تحریک کے کئی ایک پہلوؤں نے جنم لیا ہے میری رائے میں تعلیمی کا اصل آرٹ اس ڈنارک کے آزاد مدرسوں کے اس استاد کا آرٹ تھا جو انسانوں کی تربیت ان پودوں کی طرح کرتا تھا جنہیں مدت سے نہ پانی ملا ہوتا زندگی اس کے اثر سے پھولوں میں یوں معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کے گہرے اور تاریک سایے ان پر اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی بہترین خصوصیات روشن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو چلی ہے اور ان کچھروں پر زندگی کی سرخی ڈھل چکی ہے۔

دوستو یہ ہے زندگی کا تخلیقی آرٹ:

عبد الغفور صاحب ایم۔ اے  
ٹریننگ کالج علی گڑھ

# اقبال اور کارل مارکس

فلسفہ کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف فلاسفوں نے قدرت اور اس کی زیر نگینی کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا اور جیسے جیسے علم ترقی کرتا گیا اور انسانی فکر میں گہرائی آتی گئی یہ زاویہ نگاہ بھی بدلتا گیا حقیقت یہ ہے کہ کسی شے پر غور کرنے کے بعد صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے یہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ زاویہ نگاہ کی اہمیت سمجھنے کیلئے چاند گرہن کی مثال لیجئے۔ چاند گرہن کے موقع پر سائنس دان مختلف مالک کے رصد خانوں سے چاند کو دیکھتے ہیں لیکن چونکہ مختلف مالک مختلف سمتوں میں واقع ہوتے ہیں اس لئے ہر سائنس دان چاند اور دوسرے ستاروں کو مختلف زاویہ سے دیکھتا ہے اور مختلف نتیجہ پر پہنچتا ہے ممکن ہے کہ ہندوستان کا دیکھنے والا ٹھیک زاویہ سے دیکھ رہا تھا اس لئے درست نتیجہ پر پہنچا اور جاپان والے کا زاویہ چونکہ درست نہ تھا وہ بہت سی ایسی الجھنوں میں پڑ گیا جو دراصل الجھنیں نہیں تھیں بلکہ غلط زاویہ نگاہ تھا۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کسی شے کو درست زاویہ سے دیکھنا درست نتیجہ پر پہنچنے کے لئے بہت اہم ہے۔

آج سے تقریباً دو سو سال قبل اس زمانہ کی معلومات کی کمی کے سبب سے فلسفہ دانوں کا زاویہ نگاہ موجودہ دور کے زاویہ سے بالکل جدا تھا۔ وہ قدرت کو بے حس و حرکت سمجھتے تھے ان کے نزدیک دنیا بے حس و حرکت اور ساکت اشیاء کے مجموعہ کا نام تھا اور ہر شے کی نوعیت دوامی تھی لیکن وقت گزرنے پر علم کی ترقی کے ساتھ یہ نظریہ بدلتا گیا اور آخر کار جدید فلسفہ داں جن میں مارکس بھی تھا اس نتیجہ پر پہنچے کہ قدرت اور اس کے کارخانہ میں عمل اور رد عمل کا قانون کام کرتا ہے۔ ہر شے اولیٰ بدلتی، ہستی بگڑتی، پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہے قدرت میں سکوت نہیں روانی ہے، قیام نہیں سفر ہے اور جو شے بھی ارتقا کر رہی ہے وہ ایک قانون کے مطابق کر رہی ہے۔

قدرت اور اس کے کارخانہ کو جدید زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مارکس کو اس دنیا میں ایک

نئی دنیا نظر آنے لگی اور اس نے اپنا ایک نظریہ پیش کیا جس میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہر وہ شے جو ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے ایک خاص اصول کے مطابق ترقی کر رہی ہے۔ ارتقا کے اس اصول کو مارکس نے جدلیات کا نام دیا۔ البتہ یہ دیکھنا ہے کہ جدلیات کا نظریہ کیا ہے اور علامہ اقبال کے کلام سے اس نظریہ کی تائید کہاں تک ہوتی ہے۔

جدلیات کا نظریہ انی زامہ کارل مارکس کے اس خیال سے تو سب کو اتفاق ہے کہ دنیا انفرادی اور بے تعلق اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ بہت سے عقلوں (Processes) کا مجموعہ ہے جس میں سے ہر ایک نہ صرف ذات خود ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے بلکہ ایک دوسرے پر عمل کر کے ایک دوسرے کو بدل رہا ہے یہاں یہ غور کرنا ہے کہ جو شے ترقی کرتی ہے اس میں ارتقائی حرکت کیسے پیدا ہوتی ہے کارل مارکس کہتا ہے کہ ہر شے جس میں ارتقا ہوتا ہے دو ٹکڑوں سے مرکب ہوتی ہے یہ تکراریں کسی شے میں آلاتی طریقہ پر مبنی ہوتی ہیں پانی باتیں کہ ان کو وقت ضرورت الگ الگ کر دیا جائے بلکہ جس طرح جزوالاتجزا (Atom) میں

میں انکاری قوت (Negative Energy) اور اقراری قوت (Positive Energy) کے ستون (Poles) ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہیں اور ان کو جدا کرنا ممکن نہیں اسی طرح یہ تکراریں بھی ایک دوسرے میں ضم ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسری مثال جبر المقابله سے دی جاسکتی ہے کہ جس طرح (۱) میں (۱) اور اس کی تکرار (۲) نماں ہوتی ہے اسی طرح کسی شے میں اس کی تکرار پوشیدہ ہوتی ہے اگر (۱) کو (۲) سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب (۱) آتا ہے اور اگر اس کی تکرار (۱) کو (۲) سے ضرب دیں تب بھی (۱) حاصل ضرب آتا ہے (۱) ایک ایسی وحدت ہے جس میں (۱) بھی پوشیدہ ہے اور اس کی تکرار (۱) بھی ایک روشن مثال زندگی اور موت کی ہے۔ زندگی میں اس کی تکرار موت پوشیدہ ہے۔ جدید تحقیقات کی بموجب انسانی جسم خلیات (Cells) کا مجموعہ ہے جس میں ہر لحظہ نئے خلیے پیدا ہو رہے ہیں اور پرانے مر رہے ہیں اور اگر انسانی جسم میں موت و زندگی کی یہ تکرار بند ہو جائے تو ارتقا ختم ہو جائے اور آدمی مر جائے۔

علامہ جدلیات کا نظریہ دراصل ہیکل کا نظریہ ہے اور مارکس نے اسے ہیکل ہی سے حاصل کیا۔ البتہ سماجی اقدار پر اس نظریہ کا طاق مارکس ہی نے کیا۔ (دعویٰ)

کامل مارکس کتا ہے کہ جس طرح انکاری قوت اور اقراری قوت آپس میں ایک دوسرے کی تکرار ہیں اور ان کی کش مکش روشنی پیدا کرتی ہے اسی طرح جو شے قوت ارتقا کے راستہ پر گامزن ہے اور اس میں دو تکراریں پیدا ہوتی ہیں جن کی آپس کی کش مکش اس شے کو ارتقائی حرکت دیتی ہے مثلاً مارکس کتا ہے کہ سرمایہ داری ایک وحدت ہے جس کی نوعیت تکراری ہے یعنی اس میں طریق پیداوار تو اجتماعی ہے لیکن ملکیت انفرادی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ بہت سے مزدور مل کر ایک شے پیدا کرتے ہیں جس کا واحد مالک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ مزدور اور سرمایہ داران دو تکراروں کے مانند ہیں اس لئے ان میں کش مکش ہوتی رہتی ہے جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا مشترکہ طریق پیداوار کی طرف بے جا رہی ہے۔ دوسری مثال لیجئے مزدور ایک وحدت ہے اس میں دو تکراریں پوشیدہ ہیں یعنی وہ جنس بھی پیدا کرتا ہے اور جنس بھی کرتا ہے کہ جب وہ کوئی جنس بناتا ہے تو وہ جنس کا رخا نہ دار کو سپرد کر سکتا ہے۔ یہ تکرار مزدور کو اپنے ارتقائی انقلاب پر مجبور کرتی ہے غلط فہمی مندرجہ بالا خیال کا نظماً اس طرح کرتے ہیں کہ وحدت کو ارتقائی حرکت دونی دیتی ہے یعنی وحدت میں اس کی تکرار کثرت پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ کثرت ہی ہے جو وحدت کو ارتقائی حرکت دیتی ہے زندگی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

مذاق دونی سے بنی زوج زوج      اٹھی دشت و کسار سے زوج زوج

لیکن جو تکراریں وحدت کو ارتقائی حرکت دیتی ہیں خود اس وحدت سے جدا نہیں کی جاسکتیں وہ تکراریں اسی قوت تک زندہ ہیں جب تک ان میں وحدت ہے۔ مثال کے طور پر مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے کی تکرار ہیں لیکن اسی وقت تک یہ دونوں جامعیتیں قائم ہیں جب تک کہ سرمایہ داری قائم ہے سرمایہ دارانہ نظام کئی جامعیتوں سے مرکب ہے اور سب جامعیتیں سرمایہ داری کے واحد مشتمل میں منسلک ہیں۔ اس نکتہ کو فلسفیانہ زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وحدت میں کثرت ہے اور کثرت میں وحدت۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تکرار سے کیا مراد ہے۔ وحدت میں کثرت ہونے اور کثرت میں وحدت ہونے کے کیا معنی ہیں اور تکراروں کی آپس میں کش مکش سے کس طرح ارتقائی حرکت پیدا ہوتی ہے اب ہم اگر کس کے جدلیات کے نظریہ کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال

جدلیات کے نظریہ سے کہاں تک متفق تھے

کارل مارکس کہتا ہے۔

۱۔ کائنات میں ارتقاء کا قانون کام کرتا ہے

۲۔ وحدت میں کثرت ہے

۳۔ کثرت میں وحدت ہے

۴۔ ارتقائی حرکت کمزوروں کی کٹکٹ سے ہوتی ہے۔

اب دیکھئے کہ اقبال کا ان چاروں باتوں کی بابت کیا خیال تھا۔

۱۔ کائنات میں ارتقاء کا قانون کام کرتا ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

غریب نظر ہے سکون و ثبات

تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود

کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی

نقطہ ذوق پر راز ہے زندگی

ان اشعار میں علامہ نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ دنیا کی اشیاء میں جموے کی طرح الاتی حرکت نہیں ہے بلکہ ارتقاء ہے جو کاروان وجود کو ہر لحظہ تازہ شان دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں اگر کوئی راز پوشیدہ ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں ذوق پر راز ہے یعنی وہ ارتقاء کی منازل طے کرنا چاہتی ہے اس خیال کو شاعر مشرق نے بار بار دہرایا ہے اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ کائنات کے سکون و ثبات کو غریب نظر سمجھتے تھے لیکن کائنات میں انسانی اور سماجی زندگی بھی شامل ہے۔ سماجی زندگی میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے جو سماج کو عبور کرتی ہے کہ وہ اپنے رسم و رواج بدلے لیکن چونکہ کسی قوم کے آئین و قوانین، رسم و رواج، تمدن و تخیل کا بہترین مظہر اس کا مذہب ہوتا ہے اس لئے سماجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی بدلنا پڑتا ہے یا یہ کہئے کہ مذہب میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مذہبی مسالما میں علامہ اقبال اجتہاد کے بڑی شد و مد سے قائل ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اجتہاد کا قائل ہونا اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ مذہب کو کھینچ جان کر کئی دور کے وقتی تقاضوں کے

مطابق کیا جا رہا ہے۔ ہر دور میں مذہب کی جوئی تفسیر کی جاتی ہے اس کی تہ میں بھی ہی امر پوشیدہ ہوتا ہے کہ ہر دور کا زاویہ نگاہ و فلسفہ بدلتا رہتا ہے اور اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے کہ مذہبی کتاب کی تفسیر اس طرح کی جائے کہ وہ موجودہ دور کے زاویہ نگاہ و فلسفہ ذہنی ارتقاء اور وقتی تقاضوں اور رجحانات کے مطابق ثابت ہو جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بنیادی شے کو کسی ٹھہری یا کسی دور کا فلسفہ و زاویہ نگاہ اور رجحان یا مذہب بظاہر ہے کہ اول الذکر بنیادی اشیاء ہیں کیونکہ ان کی مطابقت میں مذہب کو لایا جاتا ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو مذہب کی حیثیت بھی ارتقائی ہو جاتی ہے جو خود دنیا کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے

اب دوسرے مسئلہ کو لیجئے

۲۔ وحدت میں کثرت ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں:-

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر وہ ہیر گھر کہیں بے پگلوں بے نظیر

یہ عالم یہ بیت خانہ شش جات اسی نے تراشا ہے یہ سونات

یہ توان اشارے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کے نزدیک وحدت بھی اپنی تکرار کثرت میں اسیر رکھتی ہے اور یہ اسیری خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی ہے کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وحدت کثرت میں ایڑ لیکن واقعہ یہی ہوتا ہے کہ جس طرح حرکت کے وقت ایک شے اپنی جگہ بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی اسی طرح وحدت میں کثرت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی جب ہم قدرت کو اس کی اصل نوعیت میں دیکھتے ہیں تو ہم کو اس میں اتنی تکرار معلوم ہوتی ہے کہ ہماری پرانی منطق جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ الف الف ہی ہو سکتا ہے۔ ب نہیں ہو سکتا غلط معلوم ہونے لگتا ہے اور یہیں نئی منطق کی ضرورت ہوتی ہے جس کی رو سے یہ ثابت کرنا ممکن ہو کہ ایک شے ہے ہی اور نہیں بھی ہے قدرت کی زیر نگینی نے انسانوں کو مجبور کر دیا کہ ایسی منطق ایجاد کرے جس میں تکرار کی گنجائش ہو۔ اگر کس نے نئے منطق ایجاد کی جس کا نام جدلیات ہے۔ دوسرے شعر میں اقبال نے صاف کہہ دیا کہ وحدت نے جو کثرت میں اسیر ہے یہ بیت خانہ شش جات پیدا کیا یعنی دنیا کے ارتقاء کا انحصار تکرار پر ہے۔ ہر وقت میں تکرار میں ہوتی ہیں۔ جو ارتقاء کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہنچتی ہیں کہ ان میں سے

ایک نئی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس نئی وحدت کی ذمیت پرانی وحدت سے جدا ہوتی ہے اور اب نئی وحدت کی نئی نگہیں پیدا ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ بت خانہ مشش جہات ترقی کو تارہتا ہے۔  
اب تیسرے مسئلہ پر غور کیجئے۔

۳۔ کثرت میں وحدت ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ اقبال فرماتے ہیں:-

پسند اس کو تکرار کی خونیں کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں مگر عین محل میں خلوت لیش

علامہ فرماتے ہیں کہ وحدت کو تکرار کی خونیں وہ تو اس کے ارتقا کا اصول ہے من و تو یعنی تکرار سے  
تو وحدت کو صرت انجمن آفرینی یعنی ارتقا مقصود ہے لیکن اس تکرار میں بھی وحدت ہوتی ہے جس طرح میں  
مخل میں خلوت رہتی ہے اسی طرح من و تو یعنی کثرت میں بھی وحدت رہتی ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے  
کہ من تو، اور مخل و خلوت، ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ اس مسئلہ پر بھی علامہ اقبال کا دل اکرتس کے ہم خیال  
معلوم ہوتے ہیں۔

اب آخری بات کو لیجئے۔

۴۔ ارتقائی حرکت تکراروں کی لکھش سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

وادم رواں ہے یم زندگی ہر ایک شے سے پیدارم زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دوو

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی عناصر کے پھندوں سے ہزار بھی

گراں گرچہ ہے محبت آب و گل خوش آئی اسے محنت آب و گل

علامہ فرماتے ہیں کہ ہر شے کا ارتقا تکراروں کی کش کش سے ہوتا ہے۔ بدن کی نمود اسی وقت ہوتی ہے  
جبکہ دو تکراریں آپس میں ارتقائی کش کش کریں اور یہ تکراریں ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہوتی ہیں۔



جیسے شعلہ میں موج دو دو ارتقا اس اصول پر ہوتا ہے کہ ہر شے اپنی تکرار اپنے کنار میں لئے ہوئے ہوتی ہے ان دونوں کی آپس کی کش مکش سے ارتقائی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کو محبت آب و گل گراں بھی گزرتی ہو اور خوش بھی آتی ہے گرائی اور خوشی ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ اگلے شعر میں فراتے ہیں کہ زندگی ثابت بھی ہے اور سار بھی۔ ستار اور ثابت ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ کارل مارکس ایک جگہ اسی مسئلہ پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ کسی شے کے اچھے پہلو کو برے پہلو سے جدا کر کے دیکھنا جدلیات کے نظریہ کے منافی ہے۔ اچھے اور برے پہلو ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ حق کے لئے باطل کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ اقبال اس حقیقت کو نکال کر جبریل وائرس میں انیس کی زبان سے یوں بیان کرواتے ہیں۔

میری جرات ہے ہر شے خاک میں دوق نو      میرے فتنے جامع قتل و خود کا تار و پو  
دیکھتا ہوں تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر      کون طوفان کے طابچے کھار اپنے میں کہ تو؟  
گر کبھی خلوت میں ہوں تو پوچھتا ہوں اللہ سے      قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لبو؟  
میں لکھتا ہوں دل یزدان کا شے کیا ہے      تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اس مکالمہ میں علامہ اقبال نے اس نظریہ کو کہ ارتقا اسکے لئے تکرار ضروری ہے۔ صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ دنیا میں رزم خیر و شر جاری ہے۔ خیر و شر آپس میں ایک دوسرے کی تکرار ہیں اور اس تکرار سے شے خاک میں دوق نو ہے یعنی انسان کے اخلاقی ارتقا کی محرک ہی تکرار ہے اور پھر علامہ اقبال کارل مارکس کے اس نظریہ کی بھڑائی دیتے ہیں کہ خیر و شر ایک دوسرے کے دل میں گھسے ہوئے ہیں۔ دل یزدان میں انیس لکھتا ہوا ہے۔ خیر کے ارتقا کے لئے شر کا ہونا ضروری ہے۔ قصہ آدم کو رنگیں کرنے والا اور رزم خیر و شر سے پیدا ہوتا ہے۔

صرف ان چار سلوں میں اقبال اور مارکس ہم خیال معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایک اور اہم نکتہ پر بھی اقبال مارکس کی تائید کرتے معلوم ہوتے ہیں کارل مارکس کا خیال تھا کہ جس طرح ایک مرکب کے اجزاء کی صرف مقدار میں فرق کر دینے سے اس مرکب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اسی طرح سے کسی شے کی تکراروں میں مقدار ہی فرق ہو جانے سے ایک ایسی شے پیدا ہو جاتی ہے جو پہلی شے سے بالکل مختلف ہوتی ہے مثال کے

طور پر پانی لیجئے۔ اس کو آئخ دیکھئے کچھ دیر تک جیسے جیسے پانی کو آئخ لگے گی وہ گرم ہوتا چلا جائے گا فرض کیجئے کہ اس طرح پانی کی حرارت ۸۰ ڈگری ہو جاتی ہے۔ ایک ڈگری آئخ اور دی تب بھی دو پانی ہی رہا لیکن جست لگانے کے قریب ہو گیا۔ اب ایک ڈگری آئخ اور دی اور پانی نے جست لگا کر اپنی نوعیت بدل دی۔ پانی بھاپ بن گیا حالانکہ اس میں کوئی نیا جزو شامل نہیں کیا گیا۔ آئخ پہلے بھی دی جا رہی تھی اور اب بھی آئخ ہی ہے رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک جزو یعنی حرارت کی مقدار میں فرق کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی نوعیت بدل گئی۔ وہ ترقی شے سے بخارات میں تبدیل ہو گیا اگر پانی کو ٹھنڈا کریں تب بھی یہی ہوتا ہے۔ بہت دیر تک اس طرح ٹھنڈا کر بڑھتی رہتی ہے لیکن اس پر بھی پانی ترقی ہی رہتا ہے لیکن جب اس کی حرارت مندرجہ سے گرمی دے دیکھتے جا۔ اب وہ ترقی پانی منجمد ہو گیا۔ علی زبان میں اس کو کسیت و کیفیت کا نظریہ کہتے ہیں یعنی کسی مرکب شے کے کسی جزو کی کمی یا بیشی اس شے کی کیفیت بدل دیتی ہے اور چونکہ ہر شے دو یا زیادہ تکراروں سے مرکب ہوتی ہے اس لئے ہر شے کی تکراریں ارتقا کر کے کرتے ایک ایسی منزل پر پہنچتی ہیں جہاں ان میں کسی ایک کا کم یا زیادہ ہونا اس شے کی نوعیت بدل دیتا ہے۔ مارکس اس نظریہ کو سماجی زندگی پر بھی منطبق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب سرمایہ داری کی تکراریں بڑے بڑے ایک خاص مقدار پر پہنچیں گی تو جیسے پانی بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ داری سوشلزم میں تبدیل ہو جائے گی۔ صاف زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ سرمایہ داری ایک وحدت ہے اور سرمایہ دارانہ مزدور و بحکما ریں ہیں ان میں کش مکش جا رہی ہے اور مزدور طبقہ طاقت ور ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ سوشلزم ظہور میں آجائے اس لمحہ کو جب کہ ایک نوعیت دوسری نوعیت اختیار کرتی ہے۔ مارکس اس ارتقائی جست کے نام سے موسوم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ارتقا کا منشا اولین ہی جست ہوتا ہے کسی شے کا ارتقا اس جست کے لئے تیار ہی ہوتی ہے ارتقا کا حاصل یہ جست ہے ہر شے ارتقا کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہنچتی ہے جہاں اس شے کو ایک جست لگا کر دوسرا قالب اور روح اختیار کرنی پڑتی ہے لیکن وہ روح اور قالب کیں باہر سے داخل نہیں ہوتے بلکہ ان تکراروں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جیسے زرد اور نیلا رنگ ملانے سے ہر رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ان تکراروں سے تیسری نوعیت پیدا ہوتی ہے۔ اس ارتقائی جست کے نظریہ کو اس لئے بہت اہمیت حاصل ہے کہ انقلاب کا

پر قائم ہے کارل مارکس کے نزدیک انقلاب اس ارتقائی جست کا نام ہے جو ایک سماج اپنی تکراروں کے ارتقائی وجہ سے لگاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے سے بالکل جدا نوعیت کی سماج قائم ہو جاتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ارتقائی جست کی بابت جس کا دوسرا نام انقلاب ہے علامہ اقبال کا کیا خیال تھا علامہ فرماتے ہیں میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں کچھ کام نہیں چلتا بے جرات زبانا

کیا یہ جرات زندانہ ارتقائی جست لگانے کی ترغیب نہیں ہے؟

یہاں ہم علامہ اقبال کے کلام سے کچھ انتخاب پیش کر دیں جس سے ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے کہ علامہ کا انقلاب کی بابت (جس کو مارکس نے ارتقائی جست کا نام دیا ہے) کیا خیال تھا: علامہ فرماتے ہیں:-

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روح ام کی حیات کش کش انقلاب

کاخ امرا کے درو دیوار ہلا دو

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کنجشک فزایہ کو شاہیں سے لڑا دو

گرماد غلاموں کا لہو سوز رقیں سے

جو نقش کن تم کو نظر آئے منا دو

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ

زین میر و سلطان سے بیزار ہے

پرانی سیاست گری خوار ہے

تماشا دکھا کر مدارسی گلیا

گیا دوسرا یہ داری گلیا

اور زبورِ نجم میں تو علامہ نے خدا سے دعا ہی یہ مانگی ہے کہ یا اللہ

یا بکش در سینه من آرزو انقلاب یا اگر گوں کن نہا دین زباں وایں زبیں

یا چال کن یا چنیں

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ ارتقائی جست کے نظریہ میں

سیاسی زبان میں انقلاب کہتے ہیں انہی تھے وہ ارتقا کا مقصد جست کو سمجھتے تھے۔

م، م جوہر صاحب میرٹھی

# تعلیم اور تعلقات باہمی

ذیل کا مضمون ایک مختصر ۱۰۰ امریکی تعلیمی رسالہ سے اخذ و ترجمہ کے بعد پیش کیا جا رہا ہے تعلیمی ذریعہ سے قومی اتحاد اور تعلقات باہمی کو بچانے کے سلسلے میں اس مقالہ میں جو کچھ امریکہ کے متعلق لکھا گیا ہے اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان پر بھی صادق آتا ہے (مدراسی)

یوں تو ممالک متحدہ امریکہ کے باشندے امریکی کہلاتے ہیں لیکن یہ قوم مرکب ہے ان بہت سی جماعتوں سے جو مختلف تہذیب و تمدن کی حامل ہیں یہ اختلاف تہذیب یا قومی ہے یا نسلی یا مذہبی ہر تہذیب و مدنی جماعت پسند خاص ثقافت، رسم و رواج، عادات و اخلاق اور مخصوص نظریہ پر کاربند ہے لیکن ان تمام تہذیبی جماعتوں Cultural groups کا رشتہ قوم کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک فرد کا رشتہ اس کے خاندان سے۔

چند خیالات ایسے ہیں جو ہر ترقی پذیر تہذیبی جماعت میں پائے جاتے ہیں اور جن کو Cultural Behaviour یا عادات تہذیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ ہر ترقی پذیر تہذیبی جماعت یہ چاہتی ہے کہ اپنے نوجوانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکے ان میں اسکا کما جذبہ ایثار پیدا کرے اور ان کی بدولت خود زندہ رہے۔

ب۔ ہر تہذیب زندہ رہنا چاہتی ہے خود کو نشی کرنا نہیں چاہتی اس لئے جب وہ دیکھتی ہے کہ خطرات نے اسے گھیر لیا ہے تو وہ اپنی بقا کے لئے پوری جدوجہد کرتی ہے بے جا دبا و معقول اور نامعقول، جائز و ناجائز غرض ہر طریق کار کو عمل میں لاتی ہے۔

ج۔ آسودہ حال اور ترقی پذیر تہذیبی جماعت کا اقتضایہ ہوتا ہے کہ دوسری تہذیبی جماعتیں نہ صرف اس کی خود داری کو تسلیم کر لیں بلکہ اس کے ہر مطالبہ کو بلا چون و چرا کئے مان لیں۔

د۔ ہر جماعت نظرًا اپنے میں تبلیغی احساس پاتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی تہذیب و فکریات سے متاثر کرے اس لئے ان تمام مسائل کا حل چاہتی ہے جو اس کی ترقی کی راہ میں سد راہ بننے ہوں۔

امریکہ کی پوری تاریخ اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ مختلف تہذیبی و مدنی جماعتوں کے باہمی تصادم اور آپس کے منافشات نے ملک کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ زمانہ نوآبادیات سے جبکہ لوگوں پر ظلم شروع ہوا تھا تو کس کا اس واسطے واقعات تک مذہبی و نسلی اقلیتوں پر بے انتہا ظلم و ستم کئے گئے۔ تشدد و تحریک کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان کے لئے روا نہ رکھا گیا ہو مختصر یہ ہے کہ ظلم و جبر کے جوئے تلے جتنی آج تک چلے جا رہے ہیں۔ آج تین کروڑ نفوس امریکہ میں ایسے ہیں جو ماضی قریب میں آئے ہوئے مہاجر والدین کی اولاد ہیں لیکن ان کو زمانہ قدیم سے آباد شدہ طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کا ماحول غیر دلچسپ، ان کی اقتصادی حالت کمزور، ان کی سماجی حیثیت قابل رحم بنا دی گئی ہے۔ ان کو مختلف بڑے ناموں مثلاً، ووسپس، کولاسس وغیرہ سے پکارا جاتا ہے اور ان کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ ہر حالت، ہر بات غرض ہر حیثیت سے اس ماضی بعید سے آباد شدہ طبقہ سے کمتر ہیں۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان تین کروڑ نفوس کی زندگی کتنی اجیرن ہو گئی ہوگی ان میں اچھے جذبات پیدا ہوں تو کیسے؟ وہ اپنے مہاجرین والدین؟ ایک خاص تہذیب کے حامل تھے، ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے اسلاف کے کارناموں کو زندہ کریں تو کس طرح؟ اس حالت میں تو نہ وہ کسی تہذیب میں ضم ہو سکتے ہیں نہ کسی اور کو اپنی تہذیب سے متاثر کر سکتے ہیں ان کا امریکہ سے پس منظر جو امریکہ میں اور شہر کی گندہ و گنجان آبادی ہے، یہاں کئی اور محنت و مشقت کی زندگی ان کا معمول یہ منسلک الحال ستم رسیدہ اپنے والدین کی مہاجرانہ طاقت کا ماتم کرتے ہوئے امریکی واقعات و حادثات کے دھارے میں بے چلے جا رہے ہیں بالکل غیر شعوری طور پر۔

ان غریب ہستیوں کا مسئلہ تعمیری کمالات کے نظریہ سے غور طلب ہے۔ ان کی نئی پود و مزاج اور قابلیت میں دوسروں سے بہتر ہو سکتی ہے اگر ان کو اچھا پس منظر دیا جائے تو امریکہ کی قومی تہذیب میں چارچاند لگا سکتے ہیں۔ ان تین کروڑ نئے شہریوں کو ان کی گذشتہ تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اور دوسرے امریکیوں کے برابر درجہ دینا ہوگا۔

امریکہ کو چاہئے کہ وہ ایک خطرہ عظیم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے یعنی وہ یورپی احساس کمتری کو اپنے پیٹ داخل نہ ہونے دے۔ یورپ پر نازی و فاشی قومیت کا بھوت سوار ہے جو مختلف تہذیبی جماعتوں کو باہم دست و گریبان

لے اس قسم کے دالانہ جذبہ قومیت کو کہتے ہیں جو اپنی قوم کی برتری پر کئے لئے دوسروں پر اشد ظلم و جبر روا رکھے۔



دارالمحل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ان میں ہم کپڑی گردہوں کے اتحاد محل کے نقصان تیار کریں اور سماجی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں مثلاً امریکی اتحاد دلی کے لئے ان نعروں کا نشر کرنا کہ ہم سب امریکی ہیں اور مابہر بہت مفید ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایک قوم مختلف جماعتوں اور گردہوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے آپس کے میل جول کی وجہ سے قوم کا ہر فرد اپنی جماعت کے علاوہ دوسری جماعتوں کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی حالت میں تعلیم کا مقصد سماجی اصلاح کار کی حیثیت سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر گردہ پر یہ بات ظاہر کر دے کہ اس کا مستقبل پوری قوم کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ دیکھ لیں یہ بلکہ بڑا دیکھ لیں وہ قوم کے پیسہ کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے گردہوں کے ساتھ اتفاق و رواداری سے کام لینے ہی میں اس کی ترقی کا راز مضمر ہے تعلیمی نظام کار کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس سے وحدت ملی کے خوشگوار نتائج پیدا ہوں ہر اسکول اور کالج میں یہ قابلیت پیدا کرنی چاہئے کہ وہ اتحادین الملل کے تعلقات کے متعلق تجربات کرے گول میز کا نفرین مجلس اتحاد دیا اسی قسم کی کئی مجلس کسی نام سے بنائی جائے جس میں مختلف تہذیبی جماعتوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہوکر تہذیبی جمہوریت کا مطالعہ کریں۔ انسانی رشتوں کو استوار کرنے کے لئے جو بھی نصاب تعلیم تب کیا جائے اس میں ذہنی و جذباتی ہر طریقوں سے کام لینا ہوگا۔ اس لئے کہ مذہبی و نسلی تہذیبی جماعتوں کا ماحول جذباتی ہوتا ہے وہ ایک شخص واحد کو اپنا نجات دہندہ قرار دے کر مالمانہ اس کی پیروی کرتے ہیں اس لئے ہمارے ادارے تعلیم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اتحادین الملل کے لئے سازگار فضا پیدا کریں اسکولوں اور کالجوں میں جلسے کئے جائیں اور خاص طور پر ترتیب دادہ جلسوں کے موقع پر طلباء دوسری تہذیبی جماعتوں کے مدعو شدہ با اقتدار اور قابل قدر رہنماؤں سے شرف نیا حاصل کریں اور خود بھی دوسری تہذیبی جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہوں اپنی خوبیاں ان پر روشن کریں اور ان کی خوبیوں سے خود مستفید ہوں۔ آپس میں مل جل کر کام کرنا اور رواداری کا برتاؤ دیکھیں۔

ہیں اس اتحاد دلی کے مسئلہ کو حل جانے میں اقتصادی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اقتصادی کساد بازاری اور بڑھتی ہوئی بیکاری کے ساتھ ساتھ آپس کی کشیدگی بڑھ جاتی ہے اور جھگڑے فساد پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ والٹین اپنی کتاب میں جو ”مذہب سامیت“ پر لکھی گئی ہے ایک ایسے قبیلے کا ذکر کرتا ہے جو درخت بن بن کے پھلوں پر گزارہ کرتا تھا جب فصل اچھی ہوتی تھی تو یہ قبیلہ جشن مناتا اور دوسرے قبیلوں کو

بھی مدعو کرتا۔ مگر جب فصل خراب ہوتی تو یہ اپنے پاس دوسروں کو پھینکنے بھی نہ دیتا۔ اور جب قحط سالی ہوتی یہ دوسروں کو مار ڈالتا۔

ہمارے تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ جذبہ نفرت و حقارت، احساس کمتری و برتری کو جلد از جلد دور کرنے میں کوشاں ہوں اس لئے کہ کسی فرقہ، نسل، مذہب یا قوم کے خلاف جذبہ تحقیر کا ہونا اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے اور حالات کو بہتر بنانے میں سنگ راہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ ادارے آئندہ شہریوں کو اس قابل بنادیں کہ وہ اقتصادی مسائل کو سائنٹفک طریقوں سے سلجھائیں اور ان تمام اشخاص کے ساتھ رواداری برتیں جو صدق و دل سے مختلف اقتصادی نظریات کے حامل ہوں۔ زندگی ایک مجموعہ اعضا دہ ہے اور اس کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر فرد کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی منزل کی مختلف راہیں اور ایک ہی سوال کے ہزاروں حل ہوتے ہیں لیکن اچھی تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جو مختلف خیال و عمل رکھنے والے اشخاص کو ایک رشتہ میں منسلک کر سکتی ہے۔ ان کے دلوں سے احساس دوئی مٹا کر انہیں متحد کر سکتی ہے اور اقتصادیات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا کر دنیا کو قتل و خون، لوٹ کھسوٹ اور غارتگری سے نجات دلا سکتی ہے۔

محمد علی صاحب مدد اسی



# عرب کی معاشی حالت اور پیغمبر صلم

واقعہ یہ ہے کہ کسب اور حصول معاش کی جدوجہد کے متعلق رسول اکرم کا جو طرز عمل تھا مسلمان اگر اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا پر چلے گا اپنی سعادۂ قرار دیں تو شاید مشکل ہی سے کوئی مسلمان بیکار یا بے روزگار رہ سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے۔

انہی لا کرہ ان ادی الرجل فادعا  
فی عمل الدنيا والاخرہ

میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ کسی شخص کو دنیا یا آخرت کے کام سے بیکار روکیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ بھیک (گداگری) جہاں دنیا کے بعض مذاہب میں مذہب اور مذہبی فرض کے لوازم سے ہے اور دان پرین کا سب سے زیادہ استحقاق اسی کو ہے جو مذہب سے جتنا زیادہ تعلق رکھتا ہو جیسا کہ ہمارے ملک میں برہمنوں کا حال ہے نیز چین لوگوں نے مذہبی تعلیمات سے غلط طور پر متاثر ہو کر ترک دنیا کو اپنا مسلک بنایا۔ ان کے جانشینوں میں جو زریک اور نفیات انسانی کے عالم تھے انہوں نے تو بالبال ذرائع سے عوام کی کمائی کا اپنے آپ حصہ دار بنالیا۔ کمائے کوئی کھائے کوئی بیکن اسی گروہ میں جو بے چارے بیوقوف اور احمق تھے انہیں گداگری کو اپنا پیشہ بنانا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ ان کا خاندانی پیشہ ہو گیا، کس قدر نفوس کی بات ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ بات پائی جاتی تو اتنا تعجب نہ ہوتا لیکن اسلام جس میں آنحضرت نے بھیک کے لقمہ کو۔

رضعا یا کله فی جہنم (تومذی)

قرار دیا تھا ہم گداگری کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتے۔ آپ فرماتے تھے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لا تزال المساء لہ باحدکم حتی  
یلقی اللہ تعالیٰ ولیس فی وجہہ  
مزعۃ لحم

تم میں سے جو کوئی ہمیشہ بھیک اٹکتا ہے تو جب وہ خدا کے سامنے جائے تو اس کے چہرہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔

بکثرت آپ اعلان فرماتے تھے کہ

الصدقة تمیت القلب صدقہ آدمی کے فطری احساسات کو مردہ کر دیتا ہے اور تجر بہ شاہ ہے کہ صدقہ کھانے والے خود داری، عزت نفس، رحم وغیرہ کے جذبات سے غفل ہو جاتے ہیں حضور انور اکثر یہ فرماتے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لا ینخط احدکم حزمة علی ظہرہ خیر لہ ان یمال احدہ  
کسی کا اپنی ہڈی پر بوجھ لانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی سے سوال کرے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک انصاری نے حضور اکرم کے پاس سوال پیش کیا۔ رسول اکرم نے دریافت کیا کہ تمہارا پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہے؟ ”بولے کہ ہاں ایک ٹاٹ ہے جس کا کچھ حصہ پہنتا ہوں اور اس کے کچھ حصہ کو اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں“ آپ نے فرمایا ”اس کو لے آؤ“ وہ لے آئے حضور اکرم نے اپنے دست مبارک میں دونوں چیزوں کو لے کر تہ راج کرنا شروع کیا ایک صحابی نے ایک درہم دام لگا لیا آپ نے فرمایا ”اُس سے زیادہ بھی دینے والا کوئی ہے“ کسی صحابی نے دو درہم دام لگائے حضور انور نے ان ہی کے حوالے کر دیا اور دو درہم کے سوال کرنے والے انصاری کے حوالے کر دئے اور حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایک درہم کا غلے کو گھر والوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم سے ایک کھٹاڑی خرید کر لاؤ۔ کھٹاڑی آئی دہنا نے دیکھا کہ ”سمان و زمین کے سردار غانم الانبیاء نے بذات خود

شد خیه عوداً ابیدہ اس کھٹاڑی میں ایک کڑی ٹھونکی

اور انصاری کے حوالے کر کے فرمایا۔

اذھب فاحطب وبع ولا وینک جاف: اس سے جنگل جا کر کڑی کا ٹوڑا میں چاہتا

خمسۃ عشر یوما ہوں کہ پندرہ دن تک تمہیں نہ دیکھوں۔

انصاری نے یہی کیا اور پندرہویں دن حاضر خدمت ہوئے۔ پوچھا گیا کہ کیا ہے؟ بولے کہ اس عرصہ میں دس درہم آمدنی ہوئی جس میں سے چند درہم کے کپڑے خریدے اور چند درہم کے آماج۔ حضور اکرم نے فرمایا کہ ”یہ اس سے بہتر ہے کہ تم کسی سے ہیکل مانگو اور قیامت میں ذلت اٹھاؤ“

غور کرنے کی بات ہے کہ بجائے اس غریب کے ٹاٹ اور پیالہ کے یہ بھی ممکن تھا کہ خود حضور اکرم یا کسی

صحابی سے ان کو دودھم دلا سکتے تھے لیکن جو آپ کی غرض تھی یعنی حق اوسع ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے اور یہ مقصد بہترین طریقہ سے اس تدبیر سے حاصل ہو سکتا تھا کچھ اسی قسم کا ایک ماوراء قعر حضرت عمرؓ کا بھی ہے۔ مسجد میں ایک شخص کہتے ہوئے دھل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور ہاتھ پکڑ کر مجمع سے فرانے لگے

من یتاجرہ حتیٰ ھذا بعل ارضہ  
کسی انصاری نے کہا کہ میں لیتا ہوں حضرت عمرؓ نے فرمایا

بکمر تاجرہ کل شہیر  
انصاری نے تخواہ بتائی حضرت عمرؓ نے فرمایا

خدا مہ  
تم اس کو ذکر رکھو۔

بہر حال ذکر ہو کر وہ شخص چلا گیا چند مہینوں کے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا  
ما فعل اجیرنا  
انصاری نے عرض کیا۔

صالحؓ یا امیر المؤمنین  
حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ

اتخی بہ وبعاجتہ من الاجرة  
اس کی بیع شدہ پونجی کے ساتھ میرے پاس لے آؤ  
آدمی حاضر کیا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ حاضر ہوا اس شکل میں کہ ایک تھیلی بھی دوہوں سے بھری اس کے ساتھ تھی حضرت عمرؓ نے تب اس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

خذ ھذا فان شئت فالان اغز  
وان شئت فالجلسی (اکثر العمال)  
ویر تھیلی اپنے پاس رکھو اب جی چاہے تو جاکر  
جہاد کرو چاہے گھر بیٹھو۔

اس میں شک نہیں کہ غلبہ اور غریب عربوں کے متعلق تاریخی کتابوں میں عجیب و غریب افسانے درج ہیں۔ ابن قلدون ہی کا بیان ہے کہ عرب کے دیہاتی بے چارے

کانو یقتانون بلعہ الضب اولیٰ ۱۰  
 او العقارب او الخنافس واذلوا کلاً  
 العلمز وھود بولابل مھونۃ فی الحجارة  
 فالدم بطنخونہ وکان حال الفریقین بائناً  
 سوسا کا گشت اٹے گوبریلے اور بچھو کھاتے  
 تھے اور بھوک سے تیار ہوتے تو انٹ  
 کی لید میں خون کوٹ کر کھاتے تھے اور قریش  
 کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔  
 گورز کسریٰ کے سوال کرنے پر میسر نہ تھے۔

قال یغنی اناس من العرب کثافی شقاء  
 شدید و طول عظیم فص الجلد النونی  
 من الجوع و نلبس الوب و الشغل  
 بجماری کتاب الجھاد  
 لکنا کہ ہم عرب کے باشندے ہیں ہم پر سخت  
 تنگی گذرتی تھی اور آفتوں میں گرفتار تھے بھوک  
 میں چمڑا اور کھجور کی گٹھلیاں کھاتے تھے اور  
 بالوں کے کپڑے پہنتے تھے۔

پھر اسی عرب کو اسلام کے بعد پایا گیا جس حال میں پایا گیا یقیناً اس معاشی انقلاب میں سیاسی فتومات کو بھی دخل ہو  
 لیکن محض ہی ایک سبب نہیں ہے بلکہ سبب بات یہ ہے کہ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی رہنمائی رسول  
 اکرم کے ذریعہ سے قدرت نے کی تھی وہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بلا خوف تردید کا ساکا ہو  
 کہ ان کو بلکہ سارے جہاں کو ایک آخری معاشی پیغمبر بھی دیا گیا تھا۔ آخر غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں دنیا کے  
 اور پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کے لئے مغفرت و ہدایت کی دعائیں کی تھیں حضور ان دعاؤں کے ساتھ انہی  
 غریب عرب کے لئے یہی دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللھم! انھم حفاۃ فاحملھم۔ اللھم انھم  
 عراۃ فالبسھم اللھم انھم جیاع فاشبھم  
 پروردگار! یہ تنگے پیڑ ہیں انھیں سوار کر پور دگا  
 یہ تنگے ہیں انھیں کپڑے پہنا۔ پروردگار! یہ بھوکے  
 ہیں انھیں پیٹ بھر کھلا۔  
 (ابوداؤد)

”معاشی دعا کا اس سے بہتر نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے حضور انور کو اگر ایک طرف عربوں کی اعتقادی و اخلاقی  
 بربادیوں سے تکلیف ہوتی تھی اور اتنی تکلیف ہوئی کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ کو۔

فلعلک باخع النفسک الا یکونوا مؤمنین  
 شاید کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دیدیں گے

جیسی متعدد باتیں نازل کرنی پڑیں لیکن قریب قریب اسی قسم کی اذیت آپ کے رُوت و رحمِ مہربان کے اظہار کے بغیر نفاذ نہ ہوتی تھی صحیح مسلم میں ایک لمبی روایت ہے جو جریر بن عبد اللہ الجلی سے مروی ہے اس حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے حضرت جریر فرماتے ہیں۔

کنا فی صدر النہار عند رسول اللہ  
ہم نصف النہار کے وقت رسول اکرم کے  
صلی اللہ علیہ وسلم فجاہ قوم علیہ ا  
پاس تھے کہ کل پوش ننگے پاؤں تلوار لٹکائے  
مجتابی النمار او العمام مقلد السیوف  
ہوئے ایک قوم آئی ان میں اکثر بلکے کل کے  
عالمہم من مضرب بل کلہم من مضرب  
فتحہ وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
مبارک کا رنگ بدل گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر "تمغہ" کی یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی حضرت جریر خود ہی اس کے بعد وضاحت فرماتے ہیں۔

لما راى بهم من الفاقة  
جب آپ نے ان کے فاقہ کی حالت کو دیکھا۔

حضور انور کے لئے ان کی یہ حالت اتنی ناقابل برداشت ہوئی کہ پہلے آپ اندر زناہ میں تشریف لے گئے اور اسی پریشانی کی حالت میں باہر نکلے بظاہر مگر میں کو ایسا سامان نہ تھا جس سے ان کل پوش ننگے پاؤں والوں کی امداد فرما سکے ہوں اسی وقت بالائے گئے اذان دینے کا حکم ہوا۔ نماز ہوئی اور باد جو ویکہ جمعہ کا دن نہ تھا آپ منبر پر تشریف لے گئے اور آیت قرآنی

يا ايها الناس! اتقوا ربكم الذي خلقكم  
وگو! اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا

من نفس واحدة  
ایک ہی جان سے

تلاوت کرتے ہوئے بنی آدم اعضاء ایک دیگر اند کی طرف توجہ دلا کر آدمیت کے اس جسد کے ہر ہر عضو کو بے چین کر دیا پھر اڑھتین تلاوت فرمائیں فرمایا کہ کل لینے کے لئے آج اگر کوئی دنیا چاہے تو دے سکتا ہر عطیوں کی بارش شروع ہو گئی دُعا لگ گیا اور وہی چہرہ انور جو فاقہ کو دیکھ کر متمتع ہوا تھا حضرت جریر کے الفاظ میں۔

لہ تمغہ رنگ کا بدل جانا حالت کا متغیر ہونا۔

درایت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہل کائنات مذہبہ  
میں نے رسول اللہ کے ہر مبارک کو دکھا کر وہ  
چمک اٹھا، ایسا معلوم ہو کہ اس پر سونے کی قلعی چڑھا  
دی گئی ہے۔

ایک معاشی روح اور معاشی دل کے احساسات کیا اس سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ خواباں ہمہ دارندہ کا جو نہما نظر  
اتم تھا اس کی ان باتوں پر تعجب نہ کرنا چاہئے وہی جس کے قدم مبارک نمازوں میں قیام کی وجہ سے لوگ سوزم دیکھتے  
تھے یہی لوگ اس کا بھی تماشا کرتے تھے کہ آپ بازار میں جا رہے ہیں غلہ کا ایک ڈھیر سامنے نظر آتا ہے۔  
فادخل یدک فیہا فانک تصابعہ اپنے دست مبارک کو اس انبار میں ڈال دیتے  
بللاً ہیں آپ کی انگلیوں میں تیزی لگ جاتی ہے۔  
انبار کے مالک سے فرمایا جاتا ہے۔

ماہذا! یا صاحب الطعام غلہ دالے! یہ کیا ہے؟  
فقال! یا رسول اللہ! اصابتہ السماء اس نے کہا اے اللہ کے رسول اس پر بارش ہو گئی  
معاشی تعلقات کی تصحیح کے بغیر کب زبان مبارک سے آواز آتی ہے۔  
اعلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس پھر تم نے اس ترغلو کو ادھر کیوں نہ رکھا کہ لوگ  
من غشنا فلیس منا دیکھتے ہو فریب کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

محمّد یوسف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

## دلالت

۱۶۹۹ء کے خٹک ایام میں پیرس میں ایک بیارادر کنوڑی پیدا ہوا۔ اتنا کنوڑی کہ اس کے جینے میں بھی شبہ تھا۔ اس کی عمر ۸۲ سال کی ہوئی لیکن ساری عمر اس کی تندرستی کی ہی حالت رہی۔ یہ کہا جائے کہ اس نے مرتے مرتے اسی سال لے تو غلط نہ ہوگا جب وہ مرا تو وہ دنیا کا سب سے مشہور آدمی تھا۔

اس کے والدین نے اس کا نام اردویت رکھا تھا لیکن بڑے ہو کر اس نے خود اپنا نام بدل کر والٹیر رکھا اور دنیا میں اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ یہ اس کی خود رائی کا پہلا مظاہرہ تھا وہ خود رائی جس نے آگے جا کر اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اسے ایک معمولی مقبول شاعر سے مغربی آزادی کا پیاسہ برپا دیا۔

اس کا باپ ایک درباری تھا۔ اس کا مذہبی باپ (ایک لاد مذہب اور آزار افش قسم کا) اس کا ان تھا۔ اردویت ابھی تین سال ہی کا تھا کہ اس کے مذہبی باپ نے اسے ایک نظم یاد کرا دی جس میں دنیا کے تمام مذاہب پر لعنت بھیجی گئی تھی۔ اسے سچے تیرہ ہون کی تربیت نے اسے بچپن ہی سے تعصب اور تنگ نظری کا دشمن بنا دیا۔

دس سال کی عمر میں اسے ییتوبی کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ ییتوبی عیسائیوں میں سب سے زیادہ متعصب فرقہ ہے لیکن اس زمانہ میں ان کا نظام تعلیم نہایت مکمل اور اپنے قسم کا بہترین نظام تھا۔ خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ پورب میں تعلیمی تنظیم کی طرف سے عام بے توجہی اور لاپرواہی تھی ییتوبیوں کے مدرسے اپنی آپ مثال تھے۔ اردویت کو کیسلے سے کوئی کچھ ہی دہائی وہ پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے اندر بچپن سے ہر چیز کے متعلق تنقید کر کے کا مادہ تھا۔ استادوں کا اس کے سوالوں سے ناک میں دم تھا چوٹی چوٹی باتوں سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک میں اپنا داغ دوڑاتا۔ ییتوبی استادوں نے اس کو بڑے شوق سے پڑھایا بارہ برس کی عمر میں وہ بلا تکلف شعر کہنے لگا۔ طنز اور شوخی اس کو خطرت سے ملی تھیں چنانچہ اس کی جملہ بازی بچپن ہی سے مشہور ہو گئی۔

لے دال لے آ۔

جب وہ کالج سے نکلا تو قدیم کلاسیکل ادب اپنے زمانے کے مذہبی تنازعات اور سائنس کی جدید تحقیقات پر حامی ہو چکا تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ اب قانون کی تعلیم حاصل کرے کسی اچھے سرکاری عہدہ پر فائز ہو لیکن والٹیر کو ادب سے دیکھی تھی اس لئے اس نے ادبی زندگی کو ترجیح دی۔

اس کی نئی زندگی کے ابتدائی ایام بہت خوشی بلکہ عیش میں گزریے۔ بچے تیونون نے اسے پیرس کے بہترین حلقوں میں متعارف کرادیا اور خود والٹیر نے اپنی فنکٹنگی طبع اور شوخی کی بدولت اپنے لئے ان حلقوں میں جگہ بنائی اس کا بیشتر وقت پیرس کے شوقین رئیس نادوں میں گزرتا۔ وہاں کی فیشن پہل خانوؤں کے اشعار کی اصلاح کرتا سب لوگ اس کی تعریف کرتے، جو نہ کرتے وہ اس کی طنز کا شکار ہوتے۔

کچھ عرصہ بعد بچے تیونون، الینڈس سفیر مقرر ہو گیا چنانچہ والٹیر بھی اس کی معیت میں ہالینڈ گیا۔ وہاں اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اس کا نام اس نے پیار میں بیسی رکھا لیکن بیسی کی ماں کو یہ سلسلہ پسند نہ آیا اس نے بچے تیونون سے شکایت کی بچے تیونون نے والٹیر کی تنگداشت کرنا چاہی جس میں اسے ناکامی ہوئی تنگ آکر اس نے والٹیر کو پیرس واپس بھیج دیا۔ پیرس میں اس کے باپ نے بھی اس کا استقبال نظر بندی سے کرنا چاہا۔ والٹیر کو ایک اور جگہ پناہ پنی پڑی اور وہیں سے اس نے اپنی محبوبہ کے خواہ اور اپنے باپ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کی پہلے میں ناکام رہا دوسرے میں کامیاب۔

اس عرصہ میں فرانس کے بڑے بادشاہ کوئی چار دہم کا انتقال ہو گیا اس کے مرتے ہی اس کی تخت گیری کے غلات روعل ہوا۔ آزادی اور بے مضابطگی کی ایک عام ہول پڑی جس کے جو منہ میں آیا بلا خوف خطر کناٹھ کر لیا کسی نے مرے ہوئے بادشاہ کی ہڈیوں پر لنت بھیجی کسی نے ریجنٹ کے کردار پر حملہ کیا۔ والٹیر نے بھی طبع آزمائی کی نتیجہ یہ نکلا کہ چند ایسے اشعار کے لئے جو کسی اور کے گلے ہوئے تھے بشیل جانا پڑا بشیل فرانس کا وہ تاریخی جیل ہے جس پر انقلاب فرانس کی پہلی چوٹ پڑی۔

یہاں والٹیر تقریباً ڈیڑھ سال نظر بند رہا۔ یہ زمانہ اس نے بیکار نہیں گزارا بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا جب وہاں سے نکلا تو باہر بے اعتدالی اور آزادی کی ہوا کو اور بھی زور پر پایا۔ ادھر ڈیڑھ سال کے دے ہوئے جذبات لہرائی مدکن تھا اس لئے حکومت کی باگ ڈور ریجنٹ (دولت بادشاہ) کے ہاتھ میں تھی۔



اٹھار چاہتے تھے چنانچہ اس نے ایک ڈراما تیار کیا جس کے پردہ میں ریجنٹ کے کردار پر خوب چلے گئے۔ یہ ڈراما پیرس میں بہت مقبول ہوا۔ ریجنٹ خود اسے دیکھنے آیا۔ والیئر کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں پھر لیٹل نہ جانا پڑے اس لئے پیرس چھوڑ کر ایک اور جگہ پناہ کی غرض سے چلا گیا۔ یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی اور کردار کو نئے راستے پر ڈال دیا۔

والیئر شروع ہی سے بڑے لوگوں کی صحبت کا شوقین تھا۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے امیر زادوں کے حلقے میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ اس کا زیادہ تر وقت ان لوگوں کے ساتھ خوش مذاقی اور دلگلی میں گذرتا۔ اس خوش وقتی میں والیئر بالکل بھول گیا کہ اس میں اور ان امیر زادوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ وہ سب سے بالکل مساویانہ برتاؤ کرتا اور لاپرواہی سے مذاق کرتا۔ وہ یہ بھول گیا کہ پیرس میں آزادی، اخوت اور مساوات کا وہ دور ابھی نہیں آیا ہے جس میں کا وہ خود ایک ممتاز پیش رو ہونے والا تھا۔

اسی حلقے میں فرانس کے ایک نامی خاندان کا ایک نوجوان آیا کرتا تھا جسے والیئر کی یہ ہمسری خاص طور پر آگوار ہوتی۔ ایک دن اس نے حقارت آمیز انداز میں والیئر کے متعلق دریافت کیا کہ ”یہ کون شخص ہے جو میری باتوں کا اتنی زور سے جواب دیتا ہے؟“ جناب“ والیئر نے جواب دیا۔ ”یہ وہ شخص ہے جس کے نام کے ساتھ کوئی لمبا چوڑا خاندانی نام نہیں لگا ہوا ہے لیکن وہ اپنے نام کی عزت کرنا چاہتا ہے۔“

چند روز بعد اس نوجوان امیر زادے کے آدمیوں کے ہاتھوں والیئر کی سر بازار مرمت ہو گئی۔ والیئر نے انتقام لینے کے لئے اپنے دوسرے امیر دوستوں سے مدد مانگی۔ لیکن ان لوگوں نے ہنس کے ٹال دیا کہ چونکہ ان کے لئے یہ کوئی خلاف معمول واقعہ نہ تھا۔ والیئر نے شمشیر بازی سیکھنا شروع کر دی اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ وہ ضرور انتقام کے لئے کمر بستہ گا۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ والیئر کو لیٹل جانا پڑا لیکن صرف چند روز کے لئے بہت جلد اسے ملک چھوڑنے کی اجازت دیدی گئی۔

والیئر کی ابتدائی زندگی کا بلاشبہ یہ اہم ترین واقعہ ہے۔ اس واقعہ نے اسے ”نظام قدیم“ کے غیر منصفانہ پہلوؤں کے آسنے سٹننے لاکر کھڑا کر دیا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ جس ملک میں آزادی اور مساوات نہیں ہوتی وہاں کی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے۔ اس واقعہ نے اس کے خیالات کو ایک نئے راستہ پر ڈال دیا۔ پر شوق جوانی کی جگہ

فکر اور رنجیدگی نے لے لی۔ وہ موجودہ نظام کا دشمن ہو گیا۔ وہ امیر زادے سے انتقام نہ لے سکا مگر اس نے تہیہ کر لیا کہ پورے نظام سے انتقام لے گا۔

فرانس کے قید خانہ کو محل کروالٹیر انگلستان کی سرزمین میں پہنچا جسے آزادی اور رواداری کے اعتبار سے یورپ کے سب ممالک پر سبقت حاصل تھی یہاں نہ لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا گلہ گھونٹتے تھے اور نہ حکومت ہی ایسی جاہلانہ تھی کہ بات پردواں زبان کٹتی ہو، آزادی، رواداری، غایت اور اعتدال پسندی یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ انگلستان کا نشان امتیاز رہی ہیں۔ غرض کہ اس زمانہ میں کوئی دو ملک اتنے مختلف نہ تھے جتنے فرانس اور انگلستان۔

والٹیر کے قیام انگلستان کے متعلق کوئی تفصیل اور قابل اعتبار مواد موجود نہیں۔ فرانس کے ملک بدر والٹیر پر انگلستان کا کیا اثر پڑا ہوگا اس کا اندازہ بہر حال لگایا جاسکتا ہے۔

والٹیر نے انگلستان میں وہ تمام چیزیں پائیں جن کی غیر موجودگی نے اس کے لئے فرانس میں رہنا دوبھر کر دیا تھا۔ اس نے وہاں شخصی آزادی اور مذہبی رواداری دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں تجارت پیشہ لوگوں کی عزت کی جاتی ہے۔ فرانس میں ان لوگوں کو جو اپنی کوشش اور قابلیت سے روپیہ کماتے تھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور شریف صرف اسے سمجھا جاتا تھا جس نے شرافت اور دولت اپنے بزرگوں سے میراث میں پائی ہو۔ اس نے اسحاق بوٹن کا شاندار جنازہ دیکھا جس میں شاہی وزراء اور تمام اہل ان ملک شریک تھے۔ فرانس میں مرثا تو کیا اس کی بھی قدر ہوتی؛ والٹیر نے ضرور سوچا ہوگا۔ دوران قیام میں اس نے انگلستان کے فلسفے ادب اور سائنس سے بھی خاصی واقفیت پیدا کر لی۔

کچھ عرصہ بعد اسے فرانس واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ فرانس پہنچا تو وہاں کی وہی بے ڈہنگی چال پائی۔ پادریوں نے محض اختلاف رائے کے الزام پر تقریباً بیس ہزار آدمیوں کو جیل بچھڑایا تھا۔ ادبی حلقوں میں ایک نہایت مثنوی محافلے پر پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور تمام زور سخن اور زور قلم اس پر خرچ ہو رہا تھا۔ والٹیر نے آتے ہی ان اختلافات کی بے وقوفی پر ایک رسالہ لکھا اس کے بعد اس کے دو ڈرامے ایڈیج کئے گئے اور انہیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ساتھ ہی اس نے اپنی تصنیف مٹیایچ چارلس دو از دم شائع کی جو بہت مقبول ہوئی۔

والٹر ایچی اپنی کامیابیوں پر خوش ہی ہو رہا تھا کہ ہر ایک ایسا واقعہ ہوا جو اس کی بے پناہ قوت مخالفت کو عمل میں لے آیا۔ اس زمانے کے فرانس میں اور اس سے کچھ عرصے پہلے انگلستان میں اداکاروں (اکٹروں) اور اکٹریوں (اکٹریوں) کو ایسی ہی نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جیسے آج کل ہمارے ہندوستان میں۔ فرانس کی ایک مشہور اداکارہ جس کی فین کاری کا ڈائریکٹر دلدادہ تھا انتقال کر گئی۔ کلیانے اسے اپنے قبرستان میں جگہ دینے سے انکار کر دیا اور اسے ایک دیوانے میں وٹانا پڑا۔ ڈائریکٹر کے احساسات بھڑک اٹھے اور اس نے ایک زوردار احتجاجی نظم لکھی۔ اس کی اس حرکت کو بہت نازیبا تصور کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پیرس چھوڑ کر ایک گاؤں میں پناہ لینے پڑی ہیں سے وہ کتاب شائع ہوئی جسے فرانس کے ”نظام قدیم“ پر پہلی کاری ضرب سمجھا جاتے۔

مطلقاً نہ خطوط قیام انگلستان کے تاثرات تھے یہ پہلی کتاب تھی جس نے فرانس کو انگلستان کی مذہبی رواداری سیاسی خود مختاری شخصی آزادی، سائنس کی ترقی اور ادب کی رفعت سے آگاہ کیا۔ یہ کتاب کوئی معیاری کتاب نہ تھی اور نہ آج اس کی کوئی خاص وقعت ہے لیکن اس زمانے میں جبکہ فرانسیسیوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس چھوٹی سن رو بار کے پار کس قسم کی دنیا آباد ہے اور وہاں شکستہ کے نام کا بھی کوئی شاعر گزرا ہے۔ اس زمانے میں اس کتاب کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ڈائریکٹر کے انداز تحریر نے اس کے اثر کو اور بھی دو بالا کر دیا۔ ڈائریکٹر کا مخصوص طرز اور پیرایہ کی شگفتگی دونوں اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اس کتاب کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شائع ہوتے ہی ”خلافت قانون قرار دیدی گئی“ ناشر کو بنیل پیسہ یاد گیا اور پارلیمنٹ کے حکم کے بموجب جلاوطن کتاب کو چمک میں جلا دیا۔ ڈائریکٹر کو پناہ لینے کے لئے بھجنا پڑا۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے فرانس میں ڈے کمارٹ کے نظریوں کو روایاتی احترام حاصل تھا اس ظلم کو ڈائریکٹر کے ان مضامین نے توڑا جو اس نے یونٹن کی تحقیقات پر گہرے مطالعہ کے بعد لکھے تھے۔ اس کے بعد فرانس میں بہت سی نئی تحقیقاتیں سر ہوئیں لیکن نیاراستہ دکھانے کا سہرا بلاشبہ ڈائریکٹر کے سر ہے۔

اسے کسی تحریر کے خلاف سخت ترین قانونی اقدام یہ ہوتا تھا کہ اسے کسی کھلی جگہ میں چمک کی موجودگی میں نہ آتش کر دیا جائے۔ یہ کارروائی سرکاری جلاوطن کے ہاتھوں عمل میں آتی یہ گویا کتاب کے لئے سزا سے موت ہوتی تھی لیکن بیشتر کتابیں جنہیں یہ سزا موت لی آج بھی زندہ ہیں۔

والیئر کی زندگی کی نمایاں خصوصیتوں میں ایک اس کی خوش قسمتی بھی ہے۔ اس کی زندگی کے بیشتر خنکوار یا ناخوشگوار واقعات کسی دیکھی طرح اس کی اس شخصیت کی تعبیر میں مدجوبے جو اپنے نقطہ عروج پر پہنچ کر پورے یورپ پر چھا گئی۔ اس کی جانی کمزوری جس نے اس کے دماغی جس کو تیز کر دیا، اس کی زد و کوب جس نے اسے سنجیدہ بنا دیا، اس کی جلا وطنی جس نے اسے ایک نئی دنیا دیکھنے کا موقع دیا، ان سب اور آگے آنے والے واقعات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان ہی واقعات میں سے خاتون چے تولت سے ملاقات ہے۔

خاتون چے تولت ایک عجیب عورت تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایک مخصوص دلکشی کی مالک تھی۔ وہ ایک نہایت تیز فہم تیز مزاج اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی۔ ادب، لطیبات اور ریاضی سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اپنے خاوند مارکوس چے تولت کے بعض اوصاف (یا عدم اوصاف) کی بنا پر شاکی ہونا نہ ہونا سب برابر تھا۔ والیئر سے جب اس کی ملاقات ہوئی تو اس کی عمر ۲۷ سال کی تھی۔

والیئر حکومت کی مسلسل ایذا رسانی سے تنگ آ چکا تھا۔ اسے ایک مقام امن کی ضرورت تھی۔ یہ مقام امن اب اسے خاتون کے مکان میں مل گیا۔ خاتون کا مکان فراش کی سرحد پر واقع تھا۔ اس لئے اگر حکومت والیئر کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہتی تو وہ بڑی آسانی سے سرحد پار کر کے دوسرے ملک میں پناہ لے سکتا تھا۔ اس خاتون کے ساتھ والیئر نے اپنی زندگی کے اگلے چودہ سال گزارے۔

اس عرصے میں والیئر کو پڑھنے لکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ خاتون نے اپنے یہاں ایک تجربہ خانہ کھول رکھا تھا جس میں دونوں مل کر سائنس کے تجربے کیا کرتے تھے۔ شام کو دونوں بیٹھ کر ممانوں کے ساتھ دجا کٹر آتے رہتے تھے، ادب اور فلسفہ پر گفتگو کرتے۔ دونوں تیز مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے اکثر ان بن ہو جاتی لیکن پھر ایک دوسرے کو منا لیتے۔

اس چودہ سال کے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں والیئر کی علیت کی دھاک بیٹھ گئی اس کی باتوں کو اب ایک خاص وقعت حاصل ہو گئی گویا اس کو کھڑے ہونے کے لئے ایک مضبوط بنیاد مل گئی۔ اس کے اعتراضات اب غیر عام سمجھ کر نہیں مانے جاسکتے تھے۔ یورپ اب اس کی بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے مجبور تھا۔ اب تک

اسے صرف ایک شاعر اور ایک کامیاب ٹھیکر سمجھا جاتا تھا۔ اب اسے عالم ادب و فنی اور اس کے قول کو سند مانا جانے لگا۔

ایک بار پھر ڈالٹیر کی خوش قسمتی نے زور مارا اور خاتون کا نہایت صحیح وقت پر انتقال ہو گیا۔ موت کا سبب ایک کچی کی بیدارش تھا جو نہ مارکوس جے تولٹ کی تھی اور نہ ڈالٹیر کی اس خاتون کی دوستی سے ڈالٹیر کو جو فائدہ پہونچا وہ ابھی بتایا جا چکا ہے لیکن اگر یہ قلعن جاری رہتا تو پھر ڈالٹیر کی شخصیت کے لئے مضر ثابت ہوتا۔ خاتون ڈالٹیر کے اوپر بہت حاوی تھی اور وہ اسے اپنے پاس سے کہیں نہ جانے دیتی تھی۔ ڈالٹیر خود اس سے اتنا وابستہ ہو چکا تھا کہ وہ خود اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ غرض ڈالٹیر کی زندگی بند کر رہ گئی تھی اگر خاتون بروقت نہ مر جاتی تو ڈالٹیر کی شخصیت کا ارتقارک جاتا۔

خاتون کے انتقال کا ڈالٹیر کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ ٹھیکر کی دلچسپیوں اور فریڈرک شاہ پروشیا کی فوازشوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

فریڈرک اپنے زمانہ ولی عہدی سے ہی ڈالٹیر کا معتقد تھا۔ اٹھارویں صدی کے درمیانی دور میں فرانس کی شاعری اور زبان وہاں کی تہذیب اور طرزِ رہائش کو یورپ میں میاری درجہ حاصل تھا۔ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ فرانسیسی زبان تھی۔ درباروں میں فرانسیسی مالموں کو بڑا رتبہ دیا جاتا تھا۔ فریڈرک کی تعلیم بھی حسبِ معمول فرانسیسی زبان میں ہوئی تھی۔ اسے فرانسیسی زبان سے عشق تھا۔ فرانسیسی زبان کا مصنف اور شاعر بننے کا شوق اسے دیوانگی کی حد تک تھا۔ اس منزل تک پہونچنے کے لئے ڈالٹیر سے بڑھ کر اور کون راہبر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ولی عہدی کے زمانے سے ہی اُس نے ڈالٹیر سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اس نے ایک خط میں لکھا تھا: ”میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک خدا اور صرف ایک ڈالٹیر ہے۔“

فریڈرک دلی عہدی کے زمانے میں بہت آزادانہ اور ترقی پسندانہ خیالات رکھتا تھا۔ اس نے سولہویں صدی کے مشوراء اخلاقی مصنف میکاؤلی کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔ ڈالٹیر اور یورپ کے تمام علمی حلقوں کو اس سے بہت خوش آئند امیدیں تھیں۔ ایک فلسفی اور لبرل بادشاہ یورپ کے لئے ایک نئی بات تھی۔ آزادی اور ترقی کو دودھ رکھنے والے تمام اشخاص اس دن کے منظر تھے جب فریڈرک تخت نشین ہوگا۔

سنت اے میں فریڈرک بادشاہ ہو گیا شاہی لباس پہنتے ہی فریڈرک بالکل بدل گیا۔ وہ بالکل نرالا بادشاہ ہو گیا اس تبدیلی کا اثر دالتیر اور فریڈرک کے تعلقات پر بھی پڑا۔ رفتہ رفتہ دونوں کو ایک دوسرے کے اصل کردار کا اندازہ ہو گیا۔ دالتیر کے خواب۔ فلسفی بادشاہ کی تعمیر چھوٹی نکلی۔ فریڈرک ایک فاتح جفاکش اور بے رحم بادشاہ نکلا جس نے اپنے باپ کی تیار کردہ فوجی طاقت کے ذریعہ پروشیا کو یورپ کی اہم ترین دول کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ اسی کا زمانہ کی بنا پر وہ فریڈرک اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ادھر فریڈرک کی تیز نگاہوں نے بجانب لیا کہ دالتیر جتنا فرانسیسی شاعری کا استاد ہے اتنا ہی چالاکی میں استاد ہے۔ باہمی اعتبار اور غلوں رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا لیکن دونوں میں سے کوئی بھی تعلقات ختم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ فریڈرک کا فرانسیسی شاعری سے عشق ویسا ہی زور پر تھا۔ ادھر دالتیر کی حریفیں نکلیں دربار پر ویشیا کے اعزاز و انعام پر لگی ہوئی تھیں۔ روپیہ کی محبت دالتیر کو ابتدائی زندگی سے تھی۔ علاوہ ازیں باوجودیکہ دالتیر کا اپنے ملک میں کافی اعزاز و احترام ہوتا تھا لیکن فرانس کے بادشاہ نے کبھی اسے اس وقت کی نظر سے نہیں دیکھا جس کا وہ تھی تھا۔ دالتیر کو یہ بات بہت شاق گذرتی تھی۔ شاید محض اسی غصہ کی بنا پر وہ پروشیا کے دربار میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ بہر کیف باہمی بے اعتمادی کے باوجود دالتیر اور فریڈرک ایک دوسرے کے مشتاق تھے۔

تین چار غمخوار قاتلوں کے بعد ایک مرتبہ دالتیر کو فریڈرک کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں فرانس کے انگلستان اور آسٹریا سے تعلقات اچھے نہ تھے فرانس کی حکومت اس بارے میں فریڈرک کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اگر فرانس کی ان دول سے لڑائی ہوئی تو وہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں۔ فرانسیسی حکومت کی نظر میں اس کام کے لئے سب سے موزوں آدمی دالتیر تھا۔ دالتیر نے بھی سوچا کہ شاید اس طرح وہ یورپ کی سیاست کا ریا میں اپنے لئے کوئی اہم جگہ پیدا کر سکے اور اسی لئے برلن جانے پر راضی ہو گیا۔ لیکن فریڈرک کی نظروں نے مضمون بجانب لیا اور دالتیر کو کوئی کام کی بات معلوم نہ کر سکا۔ ادھر فریڈرک خنہیہ طور سے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دالتیر کا فرانس واپس جانا محال ہو جائے۔ دالتیر کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ ادھر بھی بدل ہو گیا اور اپنی ناکامیوں کی تلخی دور کرنے کے لئے خاتون چے تولت کے پاس چلا آیا۔ ابھی اس واقعہ کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ خاتون کا انتقال ہو گیا جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

فریڈرک نے پھر والٹیر کو بلانے کے لئے خط لکھا۔ اس مرتبہ خاتون ہے تولت کی محبت اس کے راستہ میں حائل نہ تھی۔ اس لئے وہ فوراً تیار ہو گیا۔ فریڈرک نے خوب آؤ بگلت کی ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ شاہی چیمبرلین کا عمدہ ملا۔ ایک کامیاب فرانسیسی شاعر بننے کے لئے فریڈرک سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ والٹیر پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا لیکن اسے خود اپنے اوپر بہت اعتبار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چال، نرمی اور سختی سے والٹیر کو اپنے قابو میں رکھ سکے گا لیکن ابھی تک وہ صرف والٹیر کے کردار کی کمزوریوں سے واقف تھا اس کی قوت سے آگاہ نہ تھا۔

قیام برلن کے ابتدائی ایام بہت اچھی طرح گزرے لیکن دو خود پرست شخصیتیں کب تک بغیر ٹکرائے رہیں اور اصرارِ دربار کے حقد نے غلط فہمیاں پیدا ہونے میں مدد دی۔ والٹیر کو کسی نے آکر بتلایا کہ بادشاہ نے اس کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "سنترہ چوسنے کے بعد اس کا بھل پھینک دیا جاتا ہے" یعنی جب والٹیر سے کام نکل جائے گا تو اسے بحال دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی نے فریڈرک سے کہا کہ اس نے والٹیر کو اصلاح کلام شاہی کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا "کیا میں ہمیشہ اس (فریڈرک) کے گندے کپڑے دھوتا رہوں گا" ویسے بھی اب فریڈرک اور والٹیر کا تعلق آقا اور ملازم کا تھا اور والٹیر اس سے کچھ زیادہ عرصے تک مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔

پہلی ٹکرائی ذمہ دار اس کی طبع زریعی۔ اس نے ایک یہودی سے ساز باز کر کے غیر قانونی ذرائع سے خوب روپیہ کمایا۔ کچھ دنوں بعد دونوں چوروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ والٹیر اور یہودی میں مقدمہ بازی ہوئی۔ یہودی ہار گیا۔ لیکن والٹیر کا کردار ابھی بے داغ ثابت نہ ہو سکا۔ سب جانتے تھے کہ اس نے اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کے لئے جعلی کارروائی کی تھی۔

فریڈرک بہت غصہ ہوا۔ "اگر تمہیں سازشوں کا شوق ہے تو سہر ہو گا اگر تم تمہیں اور چلے جاؤ" وہ چلایا فریڈرک اسے علیحدہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک بار پھر فرانسیسی شاعری درمیان میں آگئی کچھ ہنسنے گزرنے پر دہی نوازش خسروانہ ہونے لگی۔

لیکن والٹیر کا راستہ ابھی صاف نہ تھا۔ فریڈرک کے دربار میں کئی اور فرانسیسی تھے جو اس کے آنے سے خوش نہ تھے۔ ان سب میں سہروراوردہ ایک سائنس دان مابرتوسی تھا جسے فریڈرک نے اپنی برلن اکادمی کا

مقرر بنایا تھا۔ اس کی شہرت کی بنیاد چند تجربوں پر مبنی تھی جو اس نے سفر لیب لینڈ کے دوران میں کئے تھے۔ ان تجربوں کے ذریعہ اس نے نیوٹن کے نظریہ (کہ قطبین پر زمین چھٹی ہے) کی تائید کرتی تھی۔ اس کے علاوہ باپروٹوی فن مجلس سے واقف تھا۔ اس کی گفتگو خاصاً دلچسپ اور نظریات پر مبنی تھی غرض کہ باپروٹوی اپنی جگہ ایک کامیاب سائنسدان اور کامیاب درباری تھا۔

فریڈرک کے دسترخوان پر دونوں کی آنکھیں ملیں۔ باپروٹوی نے جان لیا کہ دربار میں ایک ایسا آدمی آگیا ہے جو اس کے امتیازی مقام کو چھین لے تو کچھ تعجب نہیں۔ ادھر والٹیر نے دیکھا کہ اس سے کم درجہ کا ایک آدمی اس سے قائل رتبے پر غلٹن ہے۔ دونوں کامیابی، شہرت اور رتبے کے حریف تھے۔ ایک دوسرے کو کیسے برداشت کرتے مگر ہونا لازمی تھی۔

پہلا اقدام باپروٹوی کی طرف سے ہوا۔ والٹیر کے آنے سے باپروٹوی شاہی حلقہ کا مرکز تھا وہ باتیں کیا کرتا تھا اور سب سنا کرتے تھے اور ہنستے تھے لیکن والٹیر جس کا شمار انسانی تاریخ کے بہترین باتیں کرنے والوں میں ہوتا ہے اس کے سامنے باپروٹوی کی بات کون سنتا۔ باپروٹوی کو اپنے پیروں تلے کی زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے اظہارِ عداوت کے لئے ایک ایسے شخص کو اپنی پناہ مانگ لیا جو والٹیر کا دشمن تھا یہ گویا اعلان جنگ تھا۔

والٹیر کو بھی بہت جلد حکم کرنے کا موقع مل گیا۔

باپروٹوی کا دعویٰ تھا کہ اس نے ریاضی کا ایک اہم اصول، اصولِ عملِ نقل، معلوم کیا ہے۔ ایک سوسیس سائنسدان نے جو کہ برلن اکادمی کا رکن تھا اس دعویٰ کا ارتداد کیا اور بتلایا کہ یہ اصول بہت پہلے معلوم کیا جا چکا ہے۔ باپروٹوی نے بجائے اس کے کہ اعتراض کا مناسب جواب دے ایک نہایت قابلِ اعتراض رویہ اختیار کیا اس نے اکادمی کا اجلاس طلب کیا اور ممبروں پر دباؤ ڈال کر سوسیس سائنسدان کے خلاف ایک قرارداد پاس کرادی اور اسے اکادمی کی کنیت سے طعنے دے کر دیا۔

والٹیر کے لئے حکم کرنے کو اس سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا تھا۔ دشمن کے عہد کا سب سے کمزور

لے برلن اکادمی فرانس کی مشہور جیس اکادمی کی نقل اور جواب میں فریڈرک نے برلن اکادمی قائم کی تھی۔ برلن اکادمی پر اسے بہت ناز تھا اور اسے اپنے کارناموں میں شمار کیا کرتا تھا۔



مقام اس نے پایا تھا۔ کچھ دنوں بعد اخباروں میں سٹیس سائنس دان کی تائید میں ایک گننام زوردار مضمون نکلا جو اتنا زوردار تھا کہ والیٹر کے علاوہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ باپریٹوی کی تمام شہرت اس مضمون نے خاک میں ملا دی۔ باپریٹوی کی پشت پر فریڈرک تھا۔ اس پر حملہ گویا فریڈرک پر حملہ تھا۔ باپریٹوی کو فریڈرک نے سب سے بڑا علمی اعزاز بخشا تھا یعنی ایچی اکاؤمی کا صدر بنایا تھا۔ اس کی علمییت کی مہمی اڑانی گئی تھی اس کی مہمی اڑانا گویا فریڈرک کی مہمی اڑانا تھی فریڈرک نے خود باپریٹوی کی طرف سے ایک رسالہ لکھا جس میں اس کی حد سے زیادہ تعریف کی گئی۔ لیکن جب والیٹر مقابلہ پر آتا تھا تو پیچھے ہٹتا نہیں جانتا تھا، بادشاہ کی شرکت نے اس کی ضد کو اور بڑھا دیا۔ شامت اعمال کہ باپریٹوی نے اس دوران میں ایک اور کتاب لکھ ماری والیٹر نے اس پر ایک مفصل تنقید لکھی جو طنز اور جھوٹا شکا ہے۔ اس تنقید نے گویا باپریٹوی کی حالتوں کو کافی بنا دیا۔ لطف یہ کہ والیٹر اس کتاب کا مسودہ فریڈرک کو دکھا چکا تھا۔ فریڈرک نے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے بعد اس کی اشاعت کو منع کر دیا تھا۔ والیٹر نے فریڈرک کے صریح احکام کے خلاف اس کو شائع کر دیا۔ والیٹر لکھا ہمت کی داد دے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ فریڈرک اعظم پر دیشا کا خود پرست، خورائے سخت گیر بادشاہ جس کی مخالفت مول لینے سے یورپ کی پرانی حکومتیں بھی گھبراتی تھیں، والیٹر نے خاص اسی کے احاطہ مملکت میں اس کی نافرمانی کی۔ والیٹر کے پاس سوائے قلم اور داغ کے کچھ بھی نہ تھا یہ تھی کردار کی وہ قوت جسے فریڈرک اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔

کتاب کے سب نئے فریڈرک کے حکم سے خالق کردئے گئے۔ لیکن ہالینڈ کے چھاپہ خانوں سے اس کے ایڈیشن پراڈیشن نکل رہے تھے جو غصہ عرصے سے جرمنی میں کثرت فروخت ہو رہے تھے۔ پورا یورپ آگاہ ہو چکا تھا کہ برلن اکادمی کے صدر کی علمی حیثیت کیا ہے۔ خود صدر اکادمی کو اس کا اتنا حدمہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ فریڈرک نے اظہار غصہ کے لئے کتاب کے سب نئے جمع کر کے پبلک میں سپرد آتش کر اڈے والیٹر نے جواب میں شاہی خلعت واپس کر دی جو استغفار دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے لئے فریڈرک تیار نہ تھا۔ اس نے مختلف طریقوں سے والیٹر کو روکنا چاہا۔ اسی رد و کد میں تین ماہ گزر گئے۔ لیکن والیٹر کو اندازہ ہو چکا تھا کہ فریڈرک سے اس کا نباہ مشکل ہے۔ مارچ ۱۸۵۲ء میں وہ برلن سے آخری بار رخصت ہو گیا۔

پرویشا سے نکل کر والیئر نے سوئٹزرلینڈ کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ سوئٹزرلینڈ میں مستقل قیام کا تھا چنانچہ اس نے وہاں پہنچتے ہی اپنے غلوں پر سوئستانی والیئر لکھنا شروع کر دیا وہ سمجھتا تھا کہ یہاں اس کو وہ آزادی میسر ہوگی جس سے وہ ہر جگہ محروم رہا ہے لیکن اس کی خوش آئند امیدیں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ اس کا ایک ڈراما ایٹج کیا گیا جسے پادریوں نے بہت ناپسند کیا۔ اس کے بعد والیئر سے اور دو ایک ایسی فروگزاشتیں ہوئیں کہ اس کی نفرت برابر بڑھتی رہی۔

والیئر کی زندگی اب تک انھیں پریشانیوں میں گذری تھی۔ فرانس میں بونی پانزدہم ہمیشہ اس کے درپے رہتا تھا۔ پرویشا میں وہ فریڈرک سے بگاڑ کر چکا تھا۔ اب سوئٹزرلینڈ میں آیا تو وہاں کے پادری اس سے ناخوش ہوئے اس سلسل کشاکش سے بچنے کے لئے اس نے ایک ترکیب سوچی جو واقعی کارگر ثابت ہوئی۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر دو مکان فروخت ہو رہے تھے اس نے دونوں خرید لئے اور دو میں مستقل سکونت اختیار کر لی اب ذرا سے خطرہ پر وہ فرانس سے سوئٹزرلینڈ اور سوئٹزرلینڈ سے فرانس میں پناہ لے سکتا تھا۔

فرنی والیئر کے آلے سے پہلے ایک غیر آباد مقام تھا۔ اس کے آنے کے توڑے عرصہ بعد ہی وہ ایک آباد پر رونق شہر میں بدل گیا۔ والیئر کی عمر اب ساٹھ سال کی تھی۔ اس کی تندرستی ویسی ہی تھی جیسی کہ پیدائش کے وقت تھی یعنی یہ کہ عنقریب مرنے والا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ غیر معمولی قوت عمل جو قدرت نے اسے بخشی تھی عمر کے ساتھ زیادہ ہوتی گئی۔ فرنی کو اس کی کوششوں نے بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے مکان کے قریب ایک گر جاؤ ایک تعمیر تیار کرایا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی عمارتیں تیار کرائیں۔ اس نے پاس کے علاقہ کو کاشت سے سبز بنا دیا۔ اس نے قلعہ اسے بہت سے گھڑی ساز بلوا کر فرنی میں گھڑی کی صنعت کو فروغ دیا۔ جب وہ کسی دوست کو خط لکھتا تو آخر میں یہ بھی لکھ دیتا کہ میاں گھڑیاں بہت اچھی بنی ہیں ایک بار آزما دیکھو۔ فرنی کا نیا جسم والیئر کی غیر معمولی قوت عمل اور صلاحیت منظم کا جیتا جاگتا شاہکار تھا۔

فرنی میں والیئر نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال گزارے تاریخی حیثیت سے یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے۔ ہمیں بیٹہ کہ اس نے ذہنی آزادی کی اس تحریک کو چلایا جس کے ساتھ اس کا نام ہمیشہ وابستہ رہے گا۔ ہمیں اس نے وہ تصانیف کیں جن پر آج اس کی ادبی شہرت غیر متزلزل کھڑی ہے۔ والیئر

جب فرنی آیا تھا تو وہ محض اپنے زمانے کا مشہور ترین شخص تھا۔ جب وہ وہاں سے آخری بار رخصت ہوا تو اسے خلعت دوام مل چکی تھی۔

فرنی میں والیئر نے اپنا مشہور ڈراما "کینڈرڈے" لکھا۔ یہ بلاشبہ اس کی ستراج تصنیف ہے۔ ٹیکسیر کی تمغیلوں کی طرح یہ انسانی فطرت کے ایک پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اسی لئے یہ انسانی فطرت کی طرح لافانی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

فرنی میں والیئر نے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی تصانیف سرانجام دیں جن میں اس کی کمائیوں کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ متعل تصانیف کے علاوہ بہت سے پمفلٹ، بہت سے مضامین اور بے شمار خطوط اس زمانے کی یادگار باقی ہیں۔ والیئر کا شمار دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے کامیاب صحافت نگاروں میں ہے۔ اس کو فرانس کی رائے عامہ پر غیر معمولی اثر حاصل تھا۔ اسی سبب سے کوئی پانزدہم نے اسے کبھی پیرس نہ آنے دیا۔ شاید یہ اس کے لئے اچھا ہی ہوا۔ والیئر اگر کہیں پیرس پہنچ جاتا تو وہاں کی حسین سوسائٹی اور دھچپہ جعبوں میں پسین کر رہ جاتا۔ وہاں کی گرمی محض کا شکار ہو جاتا اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں اس کی زبان بند ہو جاتی۔ اس کی خوش قسمتی نے پیرس کا دور وازہ اس پر بند کر دیا۔ فرنی کے مسلسل قیام نے اس کے نام کو لافانی بنا دیا۔

والیئر کو فرانس میں جو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اس میں اس کی تصانیف سے زیادہ چند واقعات کا حصہ ہے۔ ان واقعات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اولاً تو ان سے اس دور کے فرانس کی حالت کا صحیح اندازہ ہو گا۔ ثانیاً ان سے والیئر کے کردار کا ایک اہم پہلو آ جا کر ہوتا ہے یعنی اس کی حق پرستی۔

شہر توڑ کے ایک پرنٹسٹنٹ باجرژان کیلے کے لڑکے مارک انتائن نے خود کشی کر لی کسی نے افواہ اڑا دی کہ مارک کیتھولک ہونا چاہتا تھا اور اس کے باپ نے تعصب میں اسے مارڈالا۔ واقعات عدالت تک پہنچے۔ کوئل منتفا گئی تو قیث ثبوت مہیا نہ کر سکے لیکن جج صاحبان کیتھولک تھے اور ملزم پرنٹسٹنٹ۔ اٹارویں صدی کے فرانس میں ایسے ملزم کے خلاف کسی ثبوت کی کیا ضرورت تھی۔ ملزم کے لئے سزائے موت کا حکم ہو گیا۔ ملزم کو پیلے دوسہمے کی سلاخوں سے اور مار کر بولہاں کیا گیا اس کے بعد تعذیبی پختے کے ذریعہ اسے آہستہ آہستہ مار ڈالا گیا۔

والیئر کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ طیش میں آ گیا۔ اس کے بعد مسلسل چار سال تک وہ ججوں کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے

کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے تمام یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ حکومت کے سامنے جموں کے دتار کا سوال تھا لیکن والیئر کی کوششیں رائیگاں نہ گئیں۔ مرحوم کیلے کی بے گناہی تسلیم کر لی گئی۔ کیلے کے لئے تو یہ اب بیکار تھا لیکن اس واقعہ نے یورپ میں انصاف پرستی کا نیا جذبہ پیدا کر دیا۔

اس قسم کے کئی اور واقعات ہوئے۔ والیئر نے ہر مرتبہ حکومت اور جموں کے فیصلہ کے خلاف آواز بلند کی اور ہر بار آخری اپیل میں اس کی آواز سنی گئی۔

آخر عمر میں یورپ کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ میں والیئر کے رتبہ کو مان لیا گیا تھا۔ وہ گویا یورپ کا ذہنی باپ بن گیا تھا۔ فریڈرک نے پانچ سال کی عمر میں ہی والیئر کے بعد پھر خط و کتابت شروع کر دی تھی اور دونوں میں پھر وہی پہلے سے مراسم ہو گئے تھے۔ روس کی نام آور ملکہ کیتھیرن کو بھی اس سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی اور ان دونوں کے تعلقات آخر تک اچھے رہے۔ والیئر کی عمر ۳۹ سال کی تھی کہ وہ دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر فراتی سے پیرس کو روانہ ہوا۔ اس کا سفر بنگالہ خیزر استقبالوں کا ایک سلسلہ تھا۔ لوگ اسے دیکھنے آتے اور غرض ہوتے تو جوان اس کی خدمت کرنا فرما دیتے۔ پیرس میں نہایت شاندار استقبال ہوا۔ پورا شہر اسے خوش آمدید کہنے میں شریک تھا جہاں بھی جاتا لوگ اسے دیکھ کر چلا تے۔ والیئر! والیئر! زندہ باد! والیئر نے پیرس پہنچ کر اپنا ایک نیا ڈراما منیج کر لیا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

لیکن پیرس آتے ہی والیئر کی صحت خراب ہو چلی تھی۔ شاید سفر اور قیام پیرس کے ہنگاموں نے اس کی صحت کو نقصان پہنچا یا ہو۔ پیرس آئے ہوئے اسے چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ وہ بیمار میں مبتلا ہو گیا اور چند روز بعد انتقال کر گیا۔ نئے یورپ کی تعمیر میں والیئر کا بہت اہم حصہ ہے۔ روایاتی مذہب اور نظام قدیم پر کڑی مڑیں لگا کر اس نے انقلاب فرانس کا راستہ صاف کر دیا۔ انقلاب فرانس کا سب سے قومی محرک وہاں کی زبوں حالی نہ تھی بلکہ احساس زبانی تھا اور اسی احساس کو اجاگر کرنے میں والیئر کا بڑا حصہ ہے۔

والیئر روایاتی میسائیت کا سخت ترین دشمن تھا۔ کلیسا کو شاید ہی کبھی اتنے سخت و مقابل کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ پادری اس کا نام سن کر ایسے گھبراتے تھے جیسے بچے ہوا کے نام سے ڈرتے ہیں۔ وہ اسے انسانی شیطان تصور کرتے تھے۔ والیئر نے اپنی طنز و ہجویہ کی تمام قوتیں اس محاذ پر لا کر جمع کر دی تھیں۔ کبھی وہ تورات کی ایک روایت کو دوسری روایت سے ٹکرا کر ان کا بطل ثابت کرنا کبھی کلیسا کے پوش و کونوں کو اپنی طنز کی تیز روشنی سے پہلک کے سامنے آجا کر کرتا۔ انقلاب عظیم کے دوران میں کلیسا کے خلاف جس نفرت اور غصہ کا اظہار ہوا تھا وہ ایک بڑی حد تک والیئر کا ہی بیج تھا۔ اسی

بنا پر اسے "لائبریریٹ کانفی" کا مشن دلقب ملا ہے گو اس کی کلیڈا شنس کو لائبریریٹ کے نام سے یاد کرنا سراسر سہولت ہے چنانچہ پیرس کے آخری قیام میں ایک نو زائیدہ بچہ کو والیئر کے پاس دے رکھے گئے تھے لایا گیا تو اس نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "خدا اور آزادی"۔

والیئر کو بجا طور سے دور جدید کی ذہنی آزادی کے سب سے بڑے پیش روؤں میں شمار کیا جاتا ہے اس نے فرانس میں ایک نئی سائنٹفک تحریک کا راستہ تیار کیا اس نے ان تمام اداروں کی نہایت سخت کتبہ چینی کی جو آزادی راے کی راہ میں مائل تھے اس معاملے میں اس کا جذبہ تعصب کی حد تک پہنچ گیا تھوڑے ہی خیالات کے لئے آزادی اور رواداری مانگتا تھا لیکن پرانے خیالات کے لئے وہ ذرا سی رواداری کا بھی حامی نہ تھا خود ان پر بڑی بڑی بیرونی سختی سے تنقید کرتا تھا اس کی ذمہ داری کسی قدر والیئر کی ذاتی سختی طبع تھی لیکن دراصل اس قسم کی کمزوریاں ہر اصلاحی دور کے ابتدائی مراحل میں پائی جاتی ہیں پہلا دراصل ہمیشہ سخت ہوتا ہے

ادب میں والیئر کی ایک دو تصانیف ایسی ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی اور ان کے علاوہ چند ایسی تصانیف ہیں جو بعض حلقوں میں اب بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں لیکن وہ بہت سے ڈرامے جن میں پیرس سٹیج پر دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا تھا اب انہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ دراصل والیئر کی تمام تحریرات صحافتی رنگ لئے ہوئے ہیں اور صحافت اور شہرت دو اہم کی ہمیشہ سے ان بن رہی ہے صحافت اس شعبے کی طرح ہے جس کی روشنی قریب قریب تو خوب تیز ہو لیکن دور پہونچ کر دھندلی پڑ جاتی ہو یہی سبب ہے کہ والیئر کی بے شمار تصانیف میں سے اب صرف گنی جنی کتابیں باقی ہیں باقی سب بھلا دی گئیں۔

والیئر کو کسی بڑے مفکر کا رتبہ نہیں دیا جاسکتا اس کا علم وسیع تھا لیکن گہرا نہ تھا اس نے روسو کی طرح کوئی بنیادی سوال نہیں اٹھایا اس نے جو کچھ کہا وہ اسی عصر کے لئے محدود تھا نہ اس نے دوسروں کی طرح انسانی علم کی بنیاد کو ٹوٹنے کی کوشش کی جو دراصل نہ کوئی غیر معمولی فطانت کا مالک تھا اور نہ گہری نظر کا اسی لئے آج اس کے خیالات اور تصانیف کا کوئی اثر باقی نہیں اب اس کی اہمیت زیادہ تو تاریخی ہے اس کا نام اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ اس نے انٹارویں صدی میں ذہنی لیبل کی دیواریں سار کر کے ایک نئے دور کی آمد کیلئے راستہ ہموار کر دیا تھا اسی لئے ذہنی آزادی اس کے نام سے ہمیشہ کے لئے منسوب ہو گئی ہے آج اس کے نام کیا تھو کوئی سیاسی نظریہ یا اصول فلسفہ یا سائنٹفک انکشان وابستہ نہیں اور اس کا نام صرف ایک نشان ہو کر رہ گیا ہے۔ آزادی کا نشان! لیکن یہ کیا کوئی معمولی کا نام ہے؟

ریاض الاسلام صاحب بی۔ اے

## جان ڈیوی کا نظریہ جمہوریت

جمہوریت کا سب سے پہلا علمبردار افلاطون تھا جس نے نظام حکومت کا ایک ذہنی خاکہ اپنی معرکہ آرا تصنیف "ریاست" میں پیش کیا۔ وہ حکومت کو افراد کی بہبود و فلاح کا حاسن ٹھہراتا ہے اور تعلیم کو حکومت کے اہم ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقی جمیعت مانتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افلاطون کی "ریاست" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"افلاطون سے پہلے ہی عام طور سے یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمیعت مانا جاتا تھا یعنی ایسی جمیعت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو۔ اس لئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعہ دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترک سے مراد وہ کلمے اور بے کلمے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضابطہ سمجھا جاتا تھا۔ افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمیعت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انہیں جم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے۔" (صفحہ ۱۸)

افلاطون کی سرکردگی و قیادت میں یورپ کے بڑے بڑے فلاسفہ و مفکرین نے قدم اٹھایا جس میں روسو، پٹاگویری، فروبل اور ڈیوی وغیرہ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ڈیوی بیسویں صدی میں جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس کے نشہ سے سرشار رہے کہ افراد کو وہی حالت میں جماعت سے جدا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے جدید مضمون تخلیقی جمہوریت (Creative Democracy) میں جو حال میں ہی جمیونٹی (Unity) میں شائع ہوا ہے لکھتا ہے۔

جمہوریت ذاتی زندگی کا طریق عمل ہے جو نہ صرف تمام انسانی فطرت کے عقیدہ کا آئینہ ہے بلکہ اس کا انحصار اس یقین پر ہے کہ اگر صحیح حالات و ماحول فراہم کر دئے جائیں تو انسانی قوت مناسب و معیار اور عمل کر سکے گی مجبوراً یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ مجھ کو فطانت اور ارتباط تعلیم و فطانت میں کمی تھی لیکن اس عقیدہ و ایمان کے ایجا دکا سر امیر سے سر نہیں ہے میں نے تو اس کو اس ماحول و گرد و پیش سے حاصل کیا ہے جس میں جمہوریت ایک بیکہ مجسم اور حقیقی جاگتی تصویر ہے عقیدہ جمہوریت کیا ہے؟ اور کس شے کا نام ہے؟ وہ ذہانت کی اس قوت میں مضمر ہے جس سے ایک معمولی انسان اپنی معمولی عقل اور سوچ بچار سے واقعات و خیالات مروجہ کا جواب دینے پر اعتماد کامل رکھتا ہو۔ اور یہ آزاد و حقیقی تفتیش آزاد آئینہ مجلس اور آزاد آمد و رفت ہی سے حاصل ہو سکتا

آج جب ہم بیرونی ممالک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں کو خیر اور جاسوس کا خوف ہر وقت دستگیر رہتا ہے اور جہاں دوستوں سے گفت و شنید بھی باعث خطر ہے اور جہاں اجتماعی حیثیت سے اٹھنا ہونا بھی جرم و قصیر ہے تو ہم کو اس عقیدہ میں اور زیادہ استحکام اور یکتائی ہو جاتی ہے کہ جمہوریت ہی میں آزاد طور پر امیر و غریب، شہری و دیہاتی، جاہل و عالم سب لوگ مکان کے اندر اور باہر گفتگو اور بات چیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جمہوریت اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتی کہ اس میں تعصب و رنگینی ہتک عزت یا ذاتی بدنامی جس سے مذہبی، سیاسی، معاشی اختلاف برپا ہو یا جس سے رنگ نسل، دولت اور تمدن کا افتراق ہو سراپا جائے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بغاوت و سرکشی کے مترادف تصور کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شے جو آزادی آمد و رفت اور آزادی گفت و شنید کی ترقی میں مانع ہوتی ہے، بنی نوع انسان کو تفرقوں، ٹولیسوں، فرقوں اور قبیلوں میں تقسیم کرتی ہے اور متضاد جماعتوں میں تصادم پیدا کرتی ہے۔ زندگی کے جمہوری طور و طریقہ کی عمارت کو متزلزل کرتی ہے شہری و رگی آزادی مثلاً آزاد خیالی آزادی رائے آزادی اجتماع صرف قانونی ضمانت و کفالت سے سود مند نہ ہوگی اگر روزمرہ زندگی یعنی آزادی آمد و رفت، آزادی خط و کتابت، آزادی لین دین، آزادی عمل و تجارت میں باہمی بدگمانی و شبہ، سخت کلامی، خوف اور بغض و عناد سد راہ ہو جائیں یہ تمام چیزیں جمہوری طرز معاشرہ کی اہمیت کو برباد کرتی ہیں اور ان کی بربادی و تباہی ظاہری جبر و استبداد سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہیں اس کا

بین ثبوت اور علی مثال موجودہ امری اور استبدادی حکومتوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب افراد کے دماغ میں عناد و بدگمانی اور تعصب گھر کر جاتی ہے تو وہ بہت بے خطر ہو جاتے ہیں۔

جمہوریت بحیثیت زندگی کی راہ و روش و طریق عمل کے ذاتی عقیدہ کی تاباں ہے اور روزمرہ کے اشتراک عمل پر مبنی ہے جمہوریت وہ عقیدہ ہے جہاں ہر فرد کے لئے ضروریات اور نتائج و فرائض جدا جدا ہوتے ہیں اور برادرانہ تعاون اور اشتراک کی عادت خود ہی زندگی کے لئے ایک گرانمایہ اضافہ کرتے ہیں جیسا کہ کلیل کو دیں لاگ ڈاٹ اور مقابلہ کا درجہ ہوتا ہے۔ ہر اُس فساد اور جھگڑے کو جو پیدا ہوتے ہیں اور جن کا پیدا ہونا لازمی ہے جہاں کارنگ دیدیا جائے وہاں ذہانت کا مظاہرہ مواد و اخوت و برادری جذبہ کار فرما ہو حقیقی جمہوری امن و دشمنی کیا ہے؟ کیا وہ ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ پر بالجبر دباؤ ڈالنے کا نام ہے؟ کیا وہ دباؤ یا انسداد کوئی نہ کسی صورت میں متشدد نہ نہ ہے چاہے وہ بجائے ظاہری قید و بند کے نفسیاتی طور پر یعنی استنزاف مذاق سخت کلامی اور دہنگی سے ہو؟ نہیں! اس ایمان و یقین پر مبنی ہے کہ جس کی رو سے جھگڑے فسادات اور اختلافات کا رد عمل میل جول و بھائی چارہ اور اشتراک عمل سے کیا جائے اور جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو خیالات کے ظاہر کرنے اور عمل کو پیش کرنے کا موقع دے سکیں۔ اختلاف رائے کو اس لئے باہمی اور متحدہ طور پر موقع دینا کہ اظہار رائے اور اظہار اختلاف نہ صرف وہ سروں کا حق ہے بلکہ شخصی تجربات زندگی کو وسیع کرنے کا ایک کامیاب ذریعہ و وسیلہ بھی ہے۔ یہی روح جمہوری زندگی کے طریق عمل میں کار فرما ہے اور اس کی جہلت و فطرت ہے۔ وہ اخلاقی نصب العین ہے اور اس کا حصول روزمرہ کی زندگی ہے

جمہوریت ایک عقیدہ ہے انسانی تجربہ کی لیاقت و صلاحیت کا جو مقاصد و ذرائع کی افراٹس کرتا ہے۔ اور جس سے جدید تجربے منظم طور پر ترقی کرتے ہیں۔ ہر اخلاقی و معاشرتی عقیدہ کی تشکیل تنظیم اس خیال پر مبنی ہے کہ تجربہ کو کسی نہ کسی موقع پر ادراکی نہ کسی صورتی ظاہری چیز کا یا کسی حاکم کا جو احاطہ تجربہ سے باہر ہو متعلق ہونا چاہئے۔ جمہوریت وہ ایمان ہے جس کی رو سے تجربہ کا عمل بہ نسبت کسی نتیجہ کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تاکہ مخصوص نتائج جو حاصل ہوتے ہیں اعلیٰ اقدار کے ہوں اور ان سے متحرک عمل کی تشکیل تعمیر ہو۔ چونکہ یہ عمل تعلیمی ہے اس لئے جمہوریت میں عقیدہ رکھنا تجربہ اور تعلیم کے عقائد کے مترادف ہے۔ تمام نتائج و اقدار جو بکثرت و ترقی کر رہے



دائے ہنر محکمہ پائدار ہو جاتے ہیں اور حاصل شدہ چیزیں استحکام پیدا کرنے کی جہد جہد کرتے ہیں اور نئے اور بہتر تجربات ان کی رہبری کرتے ہیں اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں دریافت کرے کہ تجربہ کیا ہے تو میں یہ جواب دوں گا کہ انسانی افراد اور گروپس کے حالات کے تعامل کا نام ہے۔ ماحول انسانی ہونا چاہئے جو ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے اور اطمینان و تسکین بخشنے اور جو ہماری معلومات میں اضافہ کرے۔ مروجہ حالات کا علم آمد و رفت اور اشتراک عمل کی بنا ہے۔ علاوہ ازیں آمد و رفت سے مراد چند لوگوں کا دوسروں کی ذاتی رے کی غلامی اور پیروی ہے۔ احتیاج ضرورت اور خواہش ہمت و قوت کی افزائش کرتی ہے یہ دائرہ ہمتی سے ارفع و بلند تر ہے اور اسی وجہ سے علم و سائنس کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔

جمہوریت کا اگر زندگی کے دیگر طریق عمل سے مقابلہ کیا جائے تو وہ حیثیت و ذلیت کا داعی و حلیہ ہے جو تجربہ کے عمل پر کامل یقین رکھتا ہے اور وہ خود ہی راہ خود ہی منزل آپ ہی ابتدا سے اور آپ ہی انتہا پر اور جس کی افزائش و ترقی کے قابل و لائق ہے اور جس کا حقیقی انحصار مزید تجربہ کی رہنمائی کرنے پر ہے اور جو جذبات، حاجات و خواہشات کو آزاد کرتا ہے اور ایسی چیزیں مہیا کرتا ہے جس کا فنی میں رجوع تک نہیں ہوتا کیونکہ زندگی کی ہر راہ جو جمہوریت کے معیار تک نہیں آتی اتصال مبادلہ، آمد و رفت اور تعامل کو جن سے استقلال، استحکام و پائدار رہتی ہے محدود کرتی ہے۔ آزادی و تو نگری کا کام ایسا ہے جس کا روزانہ انجام دینا لازمی ہے چونکہ وہ لامتناہی ہے اور اس کا منتہائے مقصد تجربہ کی اکملیت و انتہا ہے، اس لئے جمہوریت کا ہمیشہ یہ فرض ہو کہ وہ زیادہ آزاد اور بہتر انسانی تجربہ کی تخلیق کرے جس میں ہر شخص کو باہم حصہ ملے اور ہر شخص معین و شریک ہو۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی

# بھید

(ترجمہ کینڈا، مصنفہ برنارڈشا)

کینڈا، برنارڈشا کے مشہور ترین ڈراموں میں سے ہے۔ اس کا نام بھید اس لئے ترجمہ کیا گیا ہے کہ اگر کینڈا کا کوئی دوسرا نام ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈرامہ برنارڈشا کے اشتراکِ عقائد کے زمانے کی چیز ہے۔ اس میں ازدواجی زندگی پر اشتراکِ نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ نمنا یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مذہبی پادری بھی اشتراکِ خیالات کو کس طرح اور کس حد تک قبول کرسکتے ہیں، (مستحکم)

## افراد ڈرامہ

جیمس میور اریل	ایک پادری	غفلت نام ج
یو جین پانچ بیکس	ایک لڑکا	می م
کینڈا	پادری کی بیوی	ک
برگس	پادری کا خسر	ب
مس گایڈ پرائز پائن	ٹائپسٹ	پ
ایکریڈ لیکس مل	پادری کا معین	ل

## پہلا ایکٹ

لندن کا شمالی مشرقی حصہ، اکتوبر ۱۹۱۱ء کی ایک صبح۔ ایک نہایت وسیع محلہ۔ اوسط طبقہ کے لوگوں کی آبادی۔  
 سڑکیں خوب کثرت، آبادی خوب گنجان۔ جگہ جگہ وہی پرانے پیشاب خانے۔ جا بجا کلاب۔ سڑکوں پر ڈرامے کے  
 زرد زرد ڈبے۔ برا بروڈ وڑتے پھرتے ہوئے سڑکوں کے کنارے مکانات، ان کے آگے چھوٹے  
 چھوٹے باغچے اور ان میں سبز نہایت تر و تازہ اور صاف۔ بیچ میں ایکس گڈنڈی جو لوگوں کی آمد و رفت  
 کی وجہ سے گھر کی چوکھٹ سے لے کر پھاٹک تک بن ہی جاتی ہے۔ سڑکوں پر ایک ہی طرز کے سینکڑوں

کائنات، بعد سے بعد سے سنگین اور ان کے سامنے سیاہ چار دیواریاں ہر جگہ وہی پتھر پر مبنی، سلینٹ کی جھتیں۔ لوگ نہایت اچھی خاصی طرح دیا نہایت بری طرح اتراب لباسوں میں ملبوس نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ چپے پیسے سے واقف، انتہائی خورد کنکر میں ڈوبی ہوئی ٹھکیں لیکن اپنے متعلق کم دوسروں کے متعلق زیادہ بظاہر معلوم ہوتا ہے گویا کسی خاص کاروباری پسسل پر محنت نظر ہے کبھی کبھی پولیس کی دروہا یا کلیسیائی پارکوں کی ٹھکیں بھی نظر آتی ہیں۔ آج سورج خوب چمک رہا ہے کہ وہ بھی نہیں ہے اور وہ دھوپ بھی جو کسی کو چمکنے نہیں دیتا، خواہ چونے گارے کا کام جو یا کسی کا صاف چہرہ، آج اس قدر تکلیف دہ نہیں لیکن یہ غیر دلچسپ کیڑنگ ریگستان اپنے میں ایک ٹھکان بھی چھپائے ہوئے ہے، یہ کیڑنگی دوڑی جانے لگا، ۲۱ ایکڑ کا ایک کٹہہ میدان ہے جس کے چاروں طرف ستھنے لگے ہوئے ہیں۔ اہے کے نہیں بلکہ کلو می کے، اندر گھاس کی کھرت ہے۔ درخت بھی بہت ہیں۔ نہانے والوں کے لئے ایک جیل بھی بنادی گئی ہے جن کی آرائش لندن کے بہترین مالیوں کے ہاتھ میں ہے بچوں کے کھیلنے کے لئے ریت کا ایک تودہ بھی ایک جگہ سمندر کے کنارے سے لایا گیا ہے لیکن اب شعلوں حملوں کا کوڑا خانہ ہو جانے کی بدولت ستھنی کر دیا گیا ہے۔ ایک چوتھو تیرہ بیڈ باجہ والوں کے لئے، ایک سیدھا سا دایلیٹ فارم مذہبی یا لاد مذہبی یا سیاسی مقررین کی مشق فصاحت کے لئے کرکٹ کھیلنے والوں کی بھی ایک طرف چوٹی سی زمین ہے، کسرت اور جمناسٹک کرنے والوں کا گوشہ الگ ہے۔ پتھر کی ایک پرانے قسم کی چوٹی سی بارہ دومی بھی بنی ہوئی ہے، غرض کہ یہ سب چیزیں اس پارک کی خاص زیبا نشوں میں سے ہیں۔ جہاں کہیں دزخوں کا سایہ زیادہ ہے گھاس خوب پھیلی ہوئی ہے۔ وہ نہایت دلچسپ مقامات ہیں بر خلاف اس کے جہاں کہیں زمین پھیل چلی گئی ہے یا کانی خوردہ ہے یا جہاں چھتیاں اور دھواں ہے وہاں سناٹا ہے اور ویرانی۔

لیکن دکتوریہ پارک کا بہترین منظر سینٹ ڈومنی کے گھر کی کھڑکی سے ہے کیونکہ وہاں سے چھتیاں یا سکانات وغیرہ نظر نہیں آتے۔ بس پارک ہی پارک اور اس کی دلفریبیاں صرف دکھائی پڑتی ہیں۔ پارک کا یہ مکان پارک سے بس ذرا سے فاصلہ پر بنا ہے۔ سامنے ایک غلام گردش ہے اور اس کے

مگے ایک بانچہ۔ ملاقاتی اور کاروباری لوگ نیز گھر کے افراد اس دروازہ پر ہو کر جاتے ہیں جو ناشتہ کے کمرے سے (لیکن جاں سب ہی کھانے کھاتے جاتے ہیں، ملا ہو اسے۔ بادری خانہ پشت پر ہے۔ زینہ پڑھ کر یعنی نیچے کے ہال کی چھت پر ڈرائنگ روم ہے۔ سامنے ایک بڑی سی کھڑکی ہے جس میں سے پارک بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس کمرے میں جو لوگوں بچوں کی چپقلش یا کھاؤں کے رکھ رکھاؤ سے بچا ہوا ہے بادری جیسے سیواریل اپنا کام کیا کرتا جو کھڑکی کے سامنے ایک بہت بڑی اور لمبی میز کے اختتام پر ایک بہت بڑی گھرنے والی کرسی پر بادری بیٹھا ہوا ہے۔ بائیں طرف سے پارک کا منظر بالکل صاف نظر آتا ہے۔ میز کے دوسرے کنارے پر اور اسی سے بالکل ٹی ہوئی اس سے تقریباً نصف لمبی چوڑی ایک اور میز بھی ہوئی ہے جس پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا ہے۔ ٹائپسٹ اپنی کرسی پر بھی ہوئی بیٹھی ہے۔ کھڑکی کی طرف چپے کئے ہوئے بڑی میز پر مختلف قسم کے رسالے، اخبار اور خطوط بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک آفس ڈائری بھی دھری ہوئی ہے اور خطوط تولنے کی مشین وغیرہ وغیرہ بیچ میں ایک کرسی ان لوگوں کے لئے پڑی ہوئی ہے جو بادری کے پاس کسی ضرورت سے ملنے آئیں۔ بادری کے دائیں جانب اوٹس کی دسترس پر ایک چھوٹا سا اسٹیشنری کیس رکھا ہوا ہے اور ایک فریم کی ہوئی تصویر چھپے دیوار میں الماریاں لگی ہوئی ہیں جن میں کتابیں باقاعدہ جبی ہوئی ہیں۔ بادری کے مذاق کا پتہ اس کے کتابوں کے انتخاب سے چل سکتا ہے۔ ایک طرف تو ایسا کے معنائیں ہیں مذہبی، دوسری طرف براؤٹنگ کی نظمیں کا مکمل سٹ۔ مذاق سیاسی کے اندازہ کے لئے زورنگ کی "ترقی و انحطاط" کی ایک جلد، مضامین فرقہ فغیبانی "خواب جان بال" اور کارل مارکس کی "سرمایہ" نامی کتابیں ہیں۔ کمرے کے دوسری جانب بالکل سامنے ٹائپ رائٹر کے قریب دروازہ ہے۔ آتش دان کے پاس ایک کونے پر ایک کتاب دان رکھا ہوا ہے۔ قریب ہی ایک صوفی بچا ہے۔ آتش دان میں آگ نہایت فیاضی سے جل رہی ہے اور اس کے ایک طرف تو ایک آرام کرسی پڑی ہوئی ہے اور ایک سیاہ کونکر دان جس پر جا بانی پھول بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کے لئے ایک چھوٹی کرسی پڑی ہے۔ آتش دان کی کانٹا دائرہ شدہ لکڑی کی ہے جس میں بہت خوبصورت چھوٹے چھوٹے چوکھنے بنے ہیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ ایک سفری گھڑی بھی چڑے کے

کس میں رکھی ہوئی ہے۔ دیوار پر..... اوپر ایک بڑی تصویر مشورہ مصطفیٰ کی بنائی ہوئی۔ تصویر پریم ہے۔ نہایت جاذب نظر ہے غرضکہ تمام کمرے کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کمرہ کسی سلیقہ مند نگراں کے تحت میں ہے۔ حالانکہ جہاں تک تعلق ہے وہاں تو کسی غیر موزوں شخصیت سے ٹکست کھا گیا ہو ورنہ باقی باتوں میں کمرہ تامراً مینہ ہے۔ فرنیچر اور اسکی آرائش کا جہاں تک تعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قریب ہی کے سموئی فرنیچر کو خرید لیا گیا ہے لیکن کمرے میں کوئی چیز بیکار یا دکھاوے کے طور پر نہیں ہے۔ کیونکہ پادریوں کے گھر میں ان دنوں صنادھ بھی مشرقی حصہ شہر کے باشندوں کے پاس اتار دیا گیا ہے کہ اسے ناشی تکلف میں صرف کیا جائے۔

جیس میو مارٹل ایک اشتراکی عیانی ہے جو کلیہ اے انگلستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور انجمن سینٹ میٹھو کا ایک نہایت سرگرم رکن اور ساتھ ہی ساتھ اشتراکی یونین کا ایک سرگرم ممبر بھی ہے۔ چالیس سال کی عمر مضبوط، نہایت توانا، وجہ چست، خوش مزاج، پر تکلف، نہایت صاف دل، صاف باطن، نہایت مستحکم و مضبوط جسم، پاک و صاف لہجہ جس کے ذریعہ وہ جلسوں میں نہایت پر اثر انداز ہو کر زور و طریقہ پر اثر ڈالتا ہے۔ قوت اظہار اور وسعت افکار، پر قابو۔ غرضکہ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا پادری ہے۔ جو کچھ وہ کنا چاہتا ہے اور جس کسی سے کنا چاہتا ہے نہایت آسانی سے کہہ لیتا اور سمجھا لیتا ہے غلطیوں پر سید کر ڈک دیتا ہے اور کبھی کوئی ناراض نہیں ہوتا۔ اور اکثر دوسروں کے معاملات میں جا بجا ہوتا ہے لیکن کوئی برا نہیں مانتا۔ اس کا جوش اور جذبہ ہمدردی کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اس عمر میں بھی وہ خوب کمانے کھاتا ہے اور بڑے اطمینان سے سوتا ہے تاکہ دوسرے دن کے لئے جتنی کسل ہو گئی ہے مٹ جائے اور وہ اپنے دن بھر کے کام کو ختم کرنے کے لئے پھر تیار ہو جائے۔ پھر بھی وہ ایک ہنگامہ کو تنہا بچہ کما جاسکتا ہے جو لائق معافی طور پر اپنے کمالات پر بنازاں ہے اور نادانستہ طور پر اپنے سے خوش ہے۔ چہ نہایت بنائش کشادہ پیشانی، بھوس کچھ چھوٹی، آنکلیں روشن اور شائق، بھدی سی ناک اور منہ مستحکم لیکن اسکی کات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ اور خوب پیوے ہوئے تھنہ۔ جو ایک ڈرامائی خطیب کے لئے کافی ہوزوں میں لیکن جن کو اس کے جسم پر کسی طور پر سبک نہیں کہا جاسکتا۔

ہاؤسٹس پر ازراہ بینک گارنٹ ایک نہایت تیز و موثر خدمت کی عورت ہے مگر تقریباً تیس سال معمولی ادھ دوجہ کی ہے لباس معمولی لیکن صاف سیاہ مرینے کی قمیص اور بلاؤز نہایت منہ چڑھی زبان کی تیز، اخلاقاً زیادہ فطرت نہیں لیکن نہایت حساس اور بہت خیر خواہ۔ وہ اپنی مشین پر نہایت اطمینان سے بیٹھی کھٹ پٹ کر رہی ہے سوئیل اپنی صبح کی ڈاک کا بنڈل کھولتا ہے اور ان کے مضامین کا مفہوم سمجھ کر ایک نہایت مایوسانہ سانس بھرتا ہے لیکن اس انداز سے کہ دیکھ کو بھی آجائے

پر ازراہ پائن۔ کیوں کیا کوئی اور لیکچر؟

ماریل۔ باکسٹن فرقہ آزادی والے چاہتے ہیں کہ اتوار کی صبح کو ان کے ہاں لیکچر دوں (لفظ اتوار کو خاص طور پر زور دے کر کہتا ہے کیونکہ یہ شرط ڈرائیو ہے)

پ۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ اشتہالی نراجی ہوں گے۔

م۔ بالکل نراجی کہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اتوار کو بھلا ایک پادری کیسے آسکتا ہے۔ ان کو لکھ دو کہ اگر وہ میرا وعظ ہی سننا چاہتے ہیں تو بہتر ہے میرے گرجے میں آجائیں یہی ان کے لئے مناسب بھی ہوگا۔ ان کو لکھ دو کہ میں محض دو شنبہ اور جمعرات ہی کو آسکتا ہوں۔ کیا تمہارے پاس وہاں ڈائری ہے؟

پ۔ جی ہاں (ڈائری کو اٹھاتے ہوئے)

م۔ ذرا دیکھنا مجھے آئندہ دو شنبہ کو کہیں لیکچر دینے جاتا تو نہیں ہے؟

پ۔ ڈائری دیکھتے ہوئے، ہاں تاؤرہیلٹس ریڈیکل کلب میں۔

م۔ اچھا جمعرات کو؟

پ۔ انگلش لینڈرسٹویشن لیگ۔

م۔ اس کے بعد اور؟

پ۔ انجن سینٹ میتھو دو شنبہ کو، آزاد مزدور پارٹی، گریونوچ شاخ جمعرات کو، سماجی دیموکریٹ فیڈریشن

ایسٹل اینڈ شاخ دو شنبہ کو، پہلا کفریشن کلاس جمعرات کو (تنگ آکر) میرے خیال میں بہتر یہی ہے میں اب لکھ دوں کہ آپ تشریف نہیں لاسکتے۔ ایک آدھے درجن تو آدمی ہیں۔ جاہل معروضہ پچھتے پانچ ٹکے تو ان کے

پاس بٹکیں گے نہیں۔

م۔ ارے ایسا نہ کہو وہ سب ہمارے نہایت عزیز رشتہ دار ہیں۔

پ۔ اصرت سے منہ بٹکتے ہوئے، آپ کے رشتہ دار؟

م۔ ہاں ہم سب کا باپ وہی ایک ہے آسمانوں والا۔

پ۔ (مطمئن ہو کر) بس یہی رشتہ داری ہے نا؟

م۔ (ذرا اداسی کے ساتھ، لیکن جواب دہانہ ہے) ایک ایسے شخص کے لئے جو اس کو نہایت خوبصورتی سے (اداکر سکتا ہے)

افسوس تم اسے یقین نہیں دیتے، ہر ایک یہی کہتا ہے کوئی اس میں یقین نہیں کرتا۔ کوئی بھی نہیں (تیزی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے) اچھا، غیر مس پروازر پائین جلد ان لوگوں کے لئے کوئی تیار مقرر کر دو پچیس کیسی رہے گی؟ پرسوں تو خالی تھی۔

پ۔ (ڈائری دیکھتے ہوئے) نالی نہیں ہے۔ فیلیان سوسائٹی۔

م۔ ہٹاؤ بھی فیلیان سوسائٹی! اٹاکیوس؟

پ۔ شہر میں ڈنکو جانا ہے۔ فائونڈرس کمپنی نے مدعو کیا ہے۔

م۔ ٹھیک ہے بس، اس کے بجائے میں ہاکسٹن فرقہ آزادی کو جاؤں گا وہ خاموشی سے اس تاریخ کو صبح

کر لیتی ہے لیکن چہرہ سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ ہاکسٹن نراجیوں کو ذلیل سمجھ رہی ہے۔ آریل ایک رسالہ اصلاح

کلیا۔ نامی کو جوابی ڈاک سے آیا ہے اٹاکیوس اور مشر اسٹارٹ میڈلام کے اڈیوٹرل اور انجمن سینٹ میتھی کی

خبروں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اتنے میں اس کے اٹت ایگزیکٹوٹرل کی صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ خشک مشغولیت

بازرہ ہو جاتی ہے۔ بل ایک فوجان آدمی ہے جس کو آریل نے دہلی لندن یونیورسٹی سے حاصل کر لیا ہے وہ آکسفورڈ

کا باشندہ ہے اور مشرقی لندن کو اپنی تعلیمات سے فائدہ پہنچانے؟ یا تھا کہ آریل نے اس کی خدمات حاصل کر لیں نہایت

باہمیں لیکن نیک اور پرورش حالاکہ اپنے کام میں ہنوز نا پختہ۔ بولتا ذرا ہنوزوں کو دبا کے ہے بعض اس لئے کہ الفاظ

ذرا خامس یونیورسٹی کے پیکرہ لہوں میں بٹکیں ایک قسم کی شان کے ساتھ جس کو وہ صفائی کتاب ہے اور بھجتا ہے کہ اس

طرح لندن کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا مذاق پاک و صاف ہو جائے گا۔ آریل (جس کو اس نے سگ نا و فاداری مثبت

سے خوب رام کر لیا ہے! اصلاح کلیا سے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہایت تلفت سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے،

م۔ کمولیکسی آج پھر دیو!

ل۔ غالباً کیا کروں، چاہتا تو بہت ہوں لیکن سویرے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔

م۔ (اپنی سرخیزی پر نازاں ہو کر) خوب: خوب! (اُدُن میں) شب بیداری کیا کرو، نمازیں پڑھا کر، لکھی نازیں پڑھا کر

ل۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے (ایک مناسب جواب سوچ کر) لیکن میں کیسے شب بیداری کر سکتا ہوں یا نمازیں پڑھ سکتا

ہوں جبکہ میں سوتا ہی رہتا ہوں۔ کیوں مس پرازی؟ (آتش دان کی طرف جاتا ہے،

پ۔ مہربانی سے مجھے مس گارنٹ کیا کیجئے۔

ل۔ معاف کیجئے گا مس گارنٹ۔

پ۔ آج آپ کو تمام دن کام کرنا ہوگا۔

ل۔ (آتش دان کے پاس سے) کیوں؟

پ۔ کیوں دیوں جانے دیجئے کھا نا کھانے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ کھا نا کھا یا جائے میا کہ میں کرتی ہوں

آئیے کاہلی نہ فرمائیے آپ کو اپنے گشتی کام پر جانے میں آدھ گھنٹہ کی دیر ہو چکی ہے۔

ل۔ (پریشان ہو کر) کیا یہ صبح کہ رہی ہے سٹارٹل؟

م۔ (خود کو نہایت ارفع محسوس کرتے ہوئے) آنکھیں جگتی ہوئیں! ہاں اس لئے کہ آج میں کاہلی کرنے جا رہا ہوں۔

ل۔ آپ لیکن آپ تو یہ جانتے ہی نہ تھے۔

م۔ (اٹھتے ہوئے) اُ! اُ! خوب امیں جانتا ہی نہیں! آج اس صبح کو میں اپنی صبح بنا اُ! چاہتا ہوں یعنی میری

بیوی آج داہیں آ رہی ہے۔ وہ یہاں ٹھیک پڑ۔ نے بارہ بجے پہنچ جائے گی۔

ل۔ (تعجب ہو کر) داہیں آ رہی ہیں! بچوں سمیت! میرا خیال تھا کہ وہ سب کم از کم ایک مہینہ بعد آئیں گے۔

م۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ اکیلی صرف دو دن کے لئے آ رہی ہے جیسی کے لئے کچھ فلائین کی جہیز پیش

ہیں اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم لوگ اس کے بغیر کمر کا کام کس طرح چلا رہے ہیں۔

ل۔ (پیشانی سے) لیکن مٹارٹل جیسی اور قلنی کو تو سرخ بخار آیا تھا میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے کہ۔



م۔ سرخ بخارا ہش، محض خسرو تھا بلکہ وہ تو میں خود پانی گرفت اسکول سے لایا تھا یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایک پادری ایک ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے وہ متعدد امراض کا مقابلہ اسی طرح کرتا ہے جس طرح ایک سپاہی گولیوں کا (لیکسی کی بیٹھ نہایت پیراۓ شفقت کے ساتھ تھپتپاتا ہے) اگر تم میں کچھ جہمت ہے تو ذرا خسرو کہیں سے لگا لاؤ میری پوری تمہاری تیار داری کر لے گی۔ اور یہ موقع تمہارے لئے کیا آیا اب ہوگا! کیوں نا؟

ل۔ دبے چین سکرا ہٹ کے ساتھ اسٹریٹ کے متعلق آپ کی باتیں کچھ مجھ میں نہیں آتیں۔

م۔ میرے بچے شادی کر شادی (محبت سے) پہلے ایک کسی نیک عورت سے شادی کر لو تب تمہاری سمجھ میں آجائے گا وہ آسانی حکومت جو ہم زمین پر قائم کرنا چاہتے ہیں اسی شادی اس جنت (رضی کا تمہیں قبل از وقت لطف بخش دے گی) اور تمہاری کاہلی بھی اس سے قطعی دور ہو جائے گی۔ ہر سمجھ دار آدمی جو خود سے مطمئن اور اپنی حالت سے خوش ہے اس کو ہر گھنٹہ کی زکوٰۃ ایسا کام کر کے دینا چاہئے جس سے دوسرے خوش ہو سکیں ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اس کا مصرت تو کریں لیکن اسے پیدا نہ کریں۔ بالکل اسی طرح کہ ہم روپیہ خرچ تو کریں لیکن کمائیں نہیں۔ ایک بیوی تلاش کر دو بالکل میری کینڈ ڈاکی سی، اور تم خوشیوں کی زکوٰۃ کبھی پوری خدا کا بواؤ گے (لیکسی کو نہایت محبت سے تھپتپاتا ہے) اور باہر جانے کا ارادہ کرتا ہے)

ل۔ ذرا ٹھہریے، میں بالکل بھول گیا (ماریل رکتا ہے) اور دروازہ کا دستہ پڑتے ہوئے اس کی طرف مڑتا ہے) آپ کے قبلہ خسرو صاحب آپ سے ملنے تشریف لا رہے ہیں۔ (ماریل تعجب ہوتا ہے اور کچھ خوشی کا اظہار نہ کرتے ہوئے دروازہ کو پھر بند کر دیتا ہے) اور مجھ میں ذرا تبدیلی آ جاتی ہے)

م۔ مسٹر بگین؟

ل۔ جی ہاں مجھے وہ پارک میں ملے تھے کسی سے مباحثہ میں مصروف تھے۔ مجھ سے کہدیا کہ میں آپ سے ان کی آمد کے متعلق عرض کر دوں۔

م۔ (نیم اعتبار سے) لیکن وہ تو ہاں تین سال سے نہیں آئے لیکن کیا تمہیں بالکل یقین ہے۔ مذاق تو نہیں کر رہے ہو لیکسی؟

ل۔ (نہایت صاف دلی سے) نہیں صاحب۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔



ل۔ اس کی کم ظرفی سے رغبت ہو کر مجھے اس امر سے قطعی ناواقفیت تھی کہ آپ کو مسٹر ماریل سے کوئی خاص شکایت

پ۔ (خفا ہو کر) مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے، وہ نہایت ہی عمدہ عورت ہے۔ نہایت نیک۔ نہایت

شریف مجھے اس سے بے حد محبت ہے بلکہ میں اس کی جتنی قدر کر سکتی ہوں اور کرتی ہوں اتنی کوئی مرد نہیں کر سکتا (وہ اپنا منہ فروغی سے ہلاتا ہے وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے پاس نہایت لطافت ہوتی آتی ہے)

تم میری بات کا یقین نہیں کرتے؛ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں حاسد ہوں؟ مسٹر لیکسی تم تو انسانی فطرت کے

بڑے ماہر معلوم ہوتے ہو، تم کو جیسے عورت کی کمزوریاں خوب معلوم ہی تو ہیں؛ مرد ہونا بھی کس قدر

دھچپ ہوتا ہو گا کہ ایسی دور رس عین نگاہیں رکھے، نہ کہ ہم لوگوں کی طرح جو محض جذبات ہیں اور پھر

کس قدر آسانی سے فرض کر لیتے ہو کہ چونکہ ہم تم لوگوں کی طرح روحانی مناسطے میں نہیں پہنچتے اس کا سبب

محض حسد ہو گا (اسے چوڑا گردن ہلاتی ہوئی آفتان کے پاس جا کر اپنے گئی ہے گویا کہ ہلا مار لیا)

ل۔ مس پرازی اگر اسی قدر علم تم کو مرد کی طاقت کا ہوتا جیسا کہ اس کی کمزوریوں کا ہے تو پھر مسئلہ نسواں بھٹتا

پ۔ (اتھ بیٹھتے ہوئے گردن ہکا کر) تم نے ماریل کا یہ کتنا کہاں سے سنا؟ یہ خود تمہارا جملہ ہرگز نہیں ہے تم اتنے

بھمدار نہیں ہو کہ ایسا جملہ سوچ سکو۔

ن۔ ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے اور مجھے قطعی اعتراض ہے کہ اکثر حقائق مجھے اس سے حاصل ہوئے ہیں۔

ہاں اس نے یہ جملہ آواز دوسواں فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر کہا تھا۔ ایک بات کہنے لگا اور

بتا دوں، وہ یہ کہ اس جملہ کو وہاں کسی نے پسند نہ کیا تھا سوائے ایک مرد کے یعنی میں نے (کتا ہوں کے کہیں کی

طرح پر مرد ہوتا ہے یہ خیال کر کے کہیں اب اس نے اس کو بھل ہی ڈالا۔ ایسی شکست دیدی ہے کہ اب کیا نہ کھ لے گی)

پ۔ (منشیل پر جو آئینہ رکھا تھا اس میں اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے) خیر لیکن جب کبھی آپ مجھ سے باتیں کیجئے تو بہتر

یہ ہے کہ اپنے ہی خیالات کا انہار کیا کیجئے جیسے کچھ ہوں نہ کہ دوسروں کے جب تم ماریل کی نقل پر

آجاتے ہو تو تم پر زور بھی نہیں کھینچتا۔

ل۔ (چوکر، میں اس کے نقش قدم پر غور درچلنے کی کوشش کر دوں گا حالانکہ اس کی نقل بالکل نہیں کرتا۔

(پھر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں) تم نقل ضرور کرتے ہو، تم اپنی جہت کیوں ان کی طرح اپنی باتیں بدل میں دے دیتے ہو اور جس طرح اور لوگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں کیوں اسی طرح نہیں لپچاؤ تم اپنی ٹھوڑی اٹھا کر کیوں چلتے ہو اور آنکھوں میں وہی ترجمہ کی نظریں کیوں ظاہر کرتے ہو، تم جو کہ کسی سویرے ساڑھے نو بجے سے پہلے اٹھتے ہی نہیں؛ جب گر جا جاتے ہو تو وہاں علم کو بہت گہری آواز سے کیوں کہتے ہو، سیدھی سادی طرح کیوں نہیں کہتے جیسے یہاں آپس میں بولتے ہو، جانے بھی آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے معلوم ہی نہیں، طالب دانش کے پاس چلی جاتی ہے (آئیے اب اپنے کام پر بیٹھئے، ہم لوگوں نے کافی وقت خواب کر ڈالا ہے۔ یہ لیجئے آج کی ڈائری کا کام ہے) (وہ ایک یادداشت حملے کرتی ہے)

(نہایت ہی چوکلی لاسیے، شکریہ؛) (وہ اسے لے لیتا ہے اور اس کی طرف پیٹھ کے ہونے میز کے پاس کھڑا ہو کر پڑھنے لگتا ہے، پرازی شارٹ ہینڈ کوٹ اپ کے لئے لگتی ہے اور اس کے احساسات کی بھلیک کا بالکل خیال کرنا نہیں چاہتی)

(دروازہ کھلتا ہے اور مسٹر برگس غیر اطلاع کے اندر تشریف لے آتے ہیں۔ کوئی ساڑھے کی عمر ہوگی معمولی کاروبار میں بڑے ضروری خود غرضی نے اس شخص کو نہایت اتر اور اچھی طبیعت کا بنا دیا ہے۔ اور پھر پورے ادھار کا رو باڑا کامیابی نے مونا پا کا بلی اور امانیت پیدا کر دی ہے۔ ایک نہایت ہی جاہل، اوجھا اور طاعت آدمی ہے ان لوگوں سے تو نہایت حقارت اور تکبر سے ملتا ہے جن کی آمدنی کم ہو لیکن جن کے پاس روپیہ ہو یا جو کسی مرتبہ کے آدمی ہوں ان کی تو ہمہ وقت نہایت ہی ادنیٰ خدمت کو تیار رہتا ہے لیکن دراصل نہ ان کا ہے نہ ان کا دنیا یا قسمت نے اسے اور کوئی کام نہیں دیا سو اسے اس کے کہ وہ ایک کارخانہ کا نہایت ظالم مالک ہو جائے اور چنانچہ وہ خاصا زندہ ہو گیا ہے لیکن خود اس کو اس بات کا علم نہیں، اور نہایت بچے دل سے سمجھتا ہے کہ اس کا رد باری فروغ و کامیابی محض صلاحیت، باقت، دیانتداری، محنت، تجربہ اور دو دینی کا لازمی نتیجہ ہے ایک ایسے انسان کا اپنی بھلی زندگی میں نہایت خوش باش، نیک، بہادر ہے اور غرض ملے تو اس قدر ہے کہ ضرورت سے زیادہ جہانی حالت آپ کی یہ ہے کہ نہایت چوڑے موٹے سے آدمی ہیں، اک کی تصویریں ایک مریچہ چہرے پر نہایت لمبی چلی گئی ہے، سمجھتی ڈاؤمی جس میں ٹھوڑی کے نیچے سفید بالوں کا دائرہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، مٹی نیلی جس سے لمبا جٹ آٹھ لڑا ہے اور جس کو وہ اپنی آواز میں منتقل کر لیتا ہے کیونکہ اپنے بچے نہایت شان سے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے)

نور الحسن باشی

# بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس

ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی کی جتنی جیتی جاگتی تصویریں شاعر یا ادیب کا قلم بنا سکتا ہے، اتنی مصلوٰہ کی رنگ آمیزیوں یا چنگ و رباب کے دلکش نغموں میں بھی ممکن نہیں، زندگی کی مصوری کی قلمرو میں شاعر اور ادیب کی حکمرانی میں کوئی اس کا برابر کا شریک نہیں، لیکن اس بیسویں صدی نے جہاں صد مادہ بنے بنائے اصولوں کو تہ و بالا کر دیا وہاں شاعر اور ادیب کی یہ مسئلہ حکمرانی بھی کسی اور کو سونپ دی۔ اب یہ کہنا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، اتنا صحیح نہیں جتنا یہ کہنا کہ تعلیم زندگی کا آئینہ ہے۔ بلکہ اب تو ہم شاید زیادہ آسانی سے یہ تک کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمی دنیا ہی ہماری دنیا ہے، دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کا اثر زندگی میں اور کہیں اتنا نظر نہیں آتا، جتنا تعلیمی نظام میں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ جس انقلاب آفریں زمانہ کی کرڈ میں، خطرات کو بھی بہت پیچھے چھوڑ کر، زندگی کو خدا جانے کہاں سے کہاں لئے جا رہی ہیں، اس میں بیچارے شاعر یا ادیب کا کہاں گزر، اس کا قلم اس تیز روی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آج کے بنائے ہوئے نقوش کل اتنے پھیکے نظر آنے لگتے ہیں کہ زندگی کی تصویر دھندلی ہوتے ہوئے تاریک ہو جاتی ہے۔

لیکن بیسویں صدی کی تعلیم چاہتی ہے کہ زندگی اس میں سما جائے اور وہ زندگی میں۔ تعلیم و زندگی میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ امریکہ، جرمنی، روس، آسٹریا، انگلستان اور جاپان ہر جگہ پچھلے ۲۵ - ۳۰ برسوں سے زندگی اور تعلیم کو ایک دوسرے سے اتنا قریب لانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مدرسے دنیا کی رنگین اور متنوع زندگی کا ایک چھوٹا موٹا نمونہ بن جائیں۔ ان میں سے بڑھ کر کھینچنے والے بچے زندگی کا صحیح مفہوم سمجھنے کے قابل ہوں۔ وہ زندگی کو اپنا سمجھ سکیں زندگی ان کا اپنا بنا سکے، ان کی بنائی ہوئی دنیا اور زمانے کی پیدا کی ہوئی دنیا میں بیر نہ رہے زندگی ان کے آگے بڑھانے اور وہ زندگی کو ”زندگی“ سے ان کی زندگی رنگین ہو اور ان سے

”زندگی زیادہ رنگین بنے۔ یہ ہے ”نئی تعلیم“ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ”تعلیم زندگی کا آئینہ ہے۔“  
تعلیم اور زندگی دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

ہندوستانی اپنی غلامی کے ہاتھوں جہاں زندگی کی دوسری دوڑوں میں ساری دنیا سے پیچھے ہے، وہاں تعلیم کی راہوں میں بھی وہ سب سے پچھڑا ہوا ہے۔ اس کا احساس کچھ آزاد  
دماغوں نے وقتاً فوقتاً کیا تو لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستان میں بھی تعلیم اور زندگی  
کو ایک بنایا جائے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ تعلیم میں زندگی کا رنگ بھرا جائے اس خیال نے  
علی جامہ اس وقت سے پہنچا جب اب سے کوئی تین سال پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں  
میں ”بنیادی تعلیم“ کا تجربہ شروع ہوا۔ ایک سال کے تجربے کے بعد ۱۹۳۷ء کے آخر میں پونا میں  
”بنیادی تعلیم کی پہلی کانفرنس ہوئی۔ اس تجربے کو چلانے والے جگہ جگہ سے آکر یہاں جمع ہوئے۔ اپنے  
تجربوں سے دوسروں کو سکھایا اور دوسروں کے تجربے سے خود سیکھا۔ کامیابیوں پر خوش ہوئے،  
نا کامیوں کو دور کرنے کی ترکیبیں سوچیں اور پھر ملک کے مختلف حصوں میں پھیل کر اپنے کام کو  
نئے تجربوں کی نئی روشنی میں چلانا اور آگے بڑھانا شروع کیا۔ پہلی کانفرنس نے بتایا تھا کہ تعلیم سچ  
پئے اب زندگی سے قریب آرہی ہے۔ اس کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ کوئی سو سال گزر گیا  
نئی تعلیم کا تجربہ کرنے والے پھر اپنے تجربے کی شمیں لے کر جمع ہوئے۔ کچھ سیکھا، کچھ سکھایا اور  
یہ بتا کر کہ تعلیم نے زندگی کی طرف ایک قدم اور بڑھایا ہے، سب پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے  
یہ بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس تھی۔

بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس ۱۱ اپریل سے ۱۴ اپریل ۱۹۳۷ء جامعہ انگریز ہوئی۔  
گجرات، بنگال، مالاکا متوسط، بہار اڑیسہ، مالاکا متحدہ، جنوبی ہند، کشمیر، حیدرآباد، اندورا  
اور راجپوتانہ سے تقریباً سو سرکاری اور غیر سرکاری معلم کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنے تجربے  
کو ایک قدم اور آگے بڑھانے آئے تھے۔ کانفرنس کا افتتاح ۱۱ اپریل کو شام کے ۵ بجے بابو راجندر  
پرشاد نے کیا۔ بابو راجندر پرشاد کے خطبے سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مہانوں کا استقبال

کرتے ہوئے پہلی اور دوسری کانفرنس کا فرق بتایا اور کہا کہ پہلی کانفرنس ایک صوبے کی امیر حکومت نے بلائی تھی اور آج کی کانفرنس ایک غریب قومی ادارے کی دعوت پر ہو رہی ہے۔ اس فرق کو دیکھ کر ہی ہمارا دھیان اس طرف جاتا ہے کہ بنیادی تعلیم کے کام کو سنبھالنا آزاد اداروں کے بس کی بات نہیں، یہ کام تو حکومت ہی کو سنبھالنا ہو گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسی حکومت ہمیں خود ہی پیدا کرنی ہے۔ ہم اپنی کوششوں سے ایک آزاد حکومت بنائیں گے، وہ اس کام کو سنبھالے گی۔ ہم اپنے اپنے آزاد تجربوں سے حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ حکومت کو یہ کام سونپ کر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمارا کام تو حکومت کے کام کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اس سلسلے میں ذکر صاحب نے کہا کہ

”میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے۔ یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں، لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا ایک گروہ کی حکومت کا نام ہے تو یہ ایسی چلتی پھرتی جھاؤں ہے کہ تعلیم اس کے ہاتھ میں کبھی زیادہ دیر تک ٹھیک راستے پر نہیں چل سکے گی، اں، ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنیاد انصاف پر ہے۔ جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کر کے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہے اور دن بدن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقے کیا ہر آدمی کی شخصیت کی ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہو جاتا ہے تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے اس لئے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اس کام سے ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی ریاست کامل بے عیب ریاست نہیں ہو سکتی مگر بعض ریاستوں کی بنیاد اخلاق اور نیکی پر ہوتی ہے، بعض کی نہیں ہوتی۔ بعض اخلاقی بہتری کی طرف چلتی ہیں بعض نہیں چلتیں، بعض عدل کے قریب ہونا چاہتی ہیں، بعض نہیں ہونا چاہتیں۔ بعض میں سب کے لئے ترقی کی راہیں کھلی ہوتی ہیں، بعض میں کچھ کے لئے کھلتی جاتی ہیں اور کچھ کے لئے اور

بند ہوتی جاتی ہیں۔ بنیادی تعلیم کا کام پہلی قسم کی ریاست کا کام ہے۔ دوسری قسم کی ریاست کے ہاتھ میں یہ نہ پہنچے تو اچھا۔ ہمارے ملک میں ابھی اس اخلاقی ریاست کا بننا باقی ہے۔ پھر جب تک وہ نہیں بنتی کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ نہیں جس طرح آزاد اور اچھے آدمیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی سماجی زندگی کی بنیاد ایسی اخلاقی ریاست پر رکھیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، اسی طرح ہر سچے تعلیمی کام کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ ایسی ریاست کے بننے میں اپنے کام کو پوری مدد دے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا کام اس ریاست میں بہت مشکل ہوگا۔ لیکن اس وجہ سے اُسے چھوڑا تو نہیں جاسکتا۔ ہاں یہ ضرور جانا چاہئے کہ کھودنا بہت ہوگا اور پانی بہت کم نکلتے گا۔ مگر کیا عجب ہے کہ اس محنت ہی سے لوگوں کا دھیان کچھ چلے، اور ہمارے ملک میں وہ ریاست وجود میں آجائے جو ہمارے کام کو ایک ہی ہلے میں کہیں سے کہیں پہنچا دے۔“

اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے راجندر بابو سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ ان کی طرف سے ملک کے سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں یہ التجا پیش کر دیں کہ

خدا کے لئے اس ملک کی ریاست کو سدھارنے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی بنیاد ڈالنے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزور کو زور اور کاڈرنہ ہو۔ غریب امیر کی کھڑک سے بچا رہے۔ جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو چل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اُجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے، اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ



سمجھا کر کچھ مان کر، کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی بنیاد رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں؟ کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کا دم گھٹ گھٹ کر سکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈرسے کانپتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حاکم اور سیاسی ضد متا دگی، تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈھیں؟ کیا اس سماج میں جس میں بھائی، بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر معلوم نہیں ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تیوہڑ نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر چرائیں، کوئی غم نہیں جسے سب بنائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے اور جلد کیجئے اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے، اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

اور آگے چل کر ذکرِ صاحب نے بنیادی تعلیم کے اصولوں کا مختصر ذکر کیا اور اس سلسلے میں ”تعلیمی کام“ کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام تعلیمی کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ اُس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو وہ کام مردہ مشین بھی کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ کام سے پہلے کام کا نقشہ، کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے۔ یعنی اس نقشے کو پورا کرنے کے ذریعے سوچنا۔ تیسرا قدم ہوتا ہے ان میں سے کسی کو لینا، کسی کو چھوڑ دینا اور جو تھا قدم ہے کئے ہوئے کو برکھنا۔ کہ جو نقشہ بنایا تھا، جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا، اسی طرح کیا یا نہیں۔ اور نتیجہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں نہ ہوں تو تعلیمی کام ہو ہی نہیں سکے گا لیکن اگر یہ چاروں ہوں بھی۔ تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے کام سے کچھ

ہنرمندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، چاہے ہاتھ کی ہنرمندی ہو، چاہے ذہن کی  
 چاہے زبان کی۔ لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر  
 ہمارے سامنے آتی ہے اس میں خالی ہنرمندی کا رنگ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ تعلیمی  
 کام وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت میں کیا جائے جو خود غرضی  
 سے پرے ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ پر اپنا خطبہ ختم کیا۔

خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے کو کام سے اُس کا اچھا چاکر بنا سکیں، اُس  
 سے دُعا ہے۔ ہمیں سیدھی راہ دکھائے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر اس نے انعام  
 کیا اور ان کی راہ سے بچائے جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور جن سے  
 وہ ناخوش ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد باور اجندر پرشاد کا نفرنس کا افتتاح کرنے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ  
 بنیادی تعلیم کی ابتداء ملک کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اب سے بہت پہلے ۱۹۲۱ء میں  
 گاندھی جی نے کی تھی۔ یہ تجربہ ان دنوں تو کچھ کامیابی نہ حاصل کر سکا، لیکن سچے میں برس کے  
 اندر سیاسی بیداری اور سماجی ضرورتوں سے لوگوں کے دل میں تعلیم کی از سر نو تعلیم کی ضرورت  
 کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور اس نے جب ۱۹۳۳ء میں بنیادی تعلیم کو قومی بنانے کا  
 سوال ملک کے سامنے آیا تو بہت سے لوگوں نے اسے پسند کیا، کچھ اب بھی شبہ اور بدگمانی  
 میں مبتلا رہے، کچھ نے اس کی مخالفت بھی کی۔ لیکن تین سال کے تجربے نے مخالفتوں میں بھی کمی  
 کر دی ہے۔ شبہ اور بدگمانی کی بددلیاں بھی اب ویسی گھٹ گھور نہیں رہیں، اور لوگوں کے دل کا  
 یقین اور بھر دسا بھی اب پہلے سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ لیکن کامیابی کی خوشی میں خاموش  
 بیٹھ رہنا دانائی نہیں ہے۔ ہمیں اسکیم کو اور زیادہ تجربے کی روشنی میں پرکھنا ہے۔ اپنی  
 محنت اور توجہ وہی سے اسے آگے سے اور آگے بڑھانا ہے۔ مخالفتوں کو کم اور شہوں کو

دور کر رہا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔

۱۲ اپریل کی صبح کو سکرپٹری نے اپنی رپوٹ پڑھی، مختلف صوبوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے صوبے کی بنیادی تعلیم کی ترقی کا حال بیان کیا، اسی دن شام کو مسٹر جرجی وائسر چانسلر اگرہ یونیورسٹی نے بنیادی تعلیم کی نمائش کا افتتاح کیا۔ دوسرے دن صبح کو پھر مختلف جگہوں کی بنیادی تعلیم کی ترقی کی رپورٹیں پیش کی گئیں

اس تین سال کے تجربے کی روشنی میں ہمیں جو خاص خاص باتیں معلوم ہوئیں ان کا اندازہ کچھ اس طرح کا ہے۔

جب مختلف مقامات پر بنیادی تعلیم کا تجربہ شروع کیا گیا تو مختلف گروہ کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ دیہاتی اسے ایک بالکل انوکھی سی چیز سمجھ کر اس سے دور بھاگے، انھیں اس اسکیم میں کسی چھپے ہوئے خطرے کا احساس ہوتا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم ان کی کئی کئی نسلوں کی بنی بنائی رسموں کو مٹانے آئی ہے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ تعلیم بچوں کو ان کی گھریلو زندگی سے دور ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں سادے گی، جہاں کھیل کود اور باتوں کے سوا کام کاج کا گزر بھی نہیں، انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ یہ تعلیم ان کی سکھ جین کی زندگی میں بے چینی اور کھل بلی پیدا کر دے گی۔ سیدھے سادے دیہاتی جو اپنے دل کی باتوں کو چھپانا نہیں جانتے جو سوچتے ہیں، وہ کہہ دیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس لئے جو چیز انھیں پسند نہ آئی، جس میں انھیں ڈر لگا، اُسے دیا ہی کہہ دیا۔ لیکن سب کے دل تو آئینہ کی طرح نہیں ہوتے، خصوصاً حکومت اور سیاست دانوں کے آئینوں پر رنگ لگا دیتی ہے اس آئینہ میں ہر شکل بدلی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ دل کچھ چاہتا ہے زبان کچھ کہتی ہے، یہاں دھوکا اور بناوٹ ہی سب کچھ ہے، نہ کچھ کر کے بھی دوسروں کو یہ جانا کہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں دشمن ہو کر بھی دوست دکھائی دینا، حکومت اور سیاست کا پہلا سبق ہے۔ اس لئے حکومت نے لے لے لے لے دھاتوں کی ایک آدھ صولے کو جھوڑ کر تو کہیں بھی نہیں کہا

کہ ہیں یہ اسکیم پسند نہیں ہم اسے نہیں چلانا چاہتے۔ لیکن چلا کر بھی اسے اس طرح چلایا کہ یہ چلانا نہ چلانے کے برابر ہے، ایک حکومت بہت دن تک اپنے دل کی بات دلوں میں نہ رکھ سکی اور کچھ جینے کے تجربے کے بعد اسے بند کر دیا۔

لیکن اب تین سال کے تجربے نے بہت فرق پیدا کر دیا ہے۔ دیہاتی اس اسکیم کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اس کے چلانے میں ہر طرح کی مدد دے رہے ہیں، اس کے بند ہونے پر انھیں بہت رنج ہوتا ہے۔ اس میں انھیں بہت سی چیزیں ایسی نظر آنے لگی ہیں جن میں ان کے اور ان کے بچوں کے لئے بھلائی ہے۔ استادان کے دوست اور بھلا چاہنے والے ہیں، وہ ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ زندگی کو دن بدن اچھے سے اور اچھا بنا رہے ہیں۔ عام مخالفت کرنے والوں نے بھی اسکیم میں کچھ اچھائیاں دیکھی ہیں اور جہاں دلوں میں تعصب اور ہٹ دھرمی نہیں، وہاں مخالفت کی آواز دھیمی دھیمی ہوتے ہوئے، بالکل بند ہو گئی ہے۔

حکومتوں نے بھی کہیں کہیں اسے بالکل اپنا لیا ہے، اور اسے آگے بڑھانے میں ہر طرح کی مدد دے رہی ہیں۔ یہ تو ہوا بڑوں کا حال۔ بچوں کی حالت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، ہر جگہ کے بچے ہر لحاظ سے اب پہلے کے بچوں سے کہیں زیادہ اچھے نظر آتے ہیں۔ ان کے دل خوش ہیں اور ان کے چہرے دل پر چمک رہے، ان کے دماغ روشن ہیں اور زبانیں پہلے سے زیادہ تیز و سوتیل بھی ہو سکتے ہیں اور جو کچھ سوچتے ہیں اسے کہہ بھی سکتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں بھرتی پاؤں میں تیزی اور بدن میں جیتی ہے۔ وہ اب صحیح معنوں میں زندہ ہیں، وہ زندگی میں لطف لینے لگے ہیں، انھیں قدرت میں دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ زندگی کیسے آگے بڑھتی ہے اور وہ اسے آگے بڑھانے میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں۔ وہ پڑھنے میں کھیلتے ہیں اور کھیلنے میں زندگی کا سبق سیکھ کر، اسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھیں اپنے دیس اور اس کی چیزوں سے محبت ہے۔ انھیں اس کی آزادی پیاری ہے، انھیں اپنی آزادی پیاری ہے، اور وہ اپنی آزادی سے اپنے دیس کی آزادی کو زیادہ قریب لانے

میں بڑوں کے ساتھ ساتھ ان کے برابر کے حصے دار بن کر رہے ہیں۔

۱۳ اپریل کی شام کو مربوط پڑھائی کے متعلق تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ بنیادی تعلیم کے تجربے کے سلسلے میں جو مختلف دقتیں پیش آئی ہیں ان میں ربط کے طریقے کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھانے والوں کو اس سلسلے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی بناء پر وہ اس بحث میں بڑی شد و مد سے حصہ لیتے ہیں۔ بغیر کسی جھجک کے اپنے شبہوں کو دور کر کے تعلیم کی راہ کو رکاوٹوں سے پاک کرتے ہیں۔ مربوط پڑھائی پر جو گفتگو ہوئی اس میں خواہ غلام السیدین صاحب کے خیالات خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ مربوط پڑھائی کی بحث کو شروع کرتے وقت سیدین صاحب نے فرمایا کہ بنیادی تعلیم کا نصاب بنانے والوں کے سامنے دو باتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ بچے کا تعلق اس کے آس پاس کی زندگی سے بہت گہرا ہوتا ہے اور اسکول کا مضمون ایک کھڑکی ہے جس میں سے ہو کر وہ اس زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں داخل ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ کچھ مکمل حقیقت ہے اور اس لئے اس کے نصاب کو بھی مکمل ہونا چاہئے، چونکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرح اسکول کے مضمون بھی کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس لئے انہیں آپس میں ملا جلا کر پڑھانا چاہئے۔ انہیں الگ الگ کر کے پڑھانا، زندگی کی ہم آہنگی اور ترقی میں فرق ڈالنا ہے۔ آگے چل کر پروفیسر سیدین نے فرمایا کہ زندگی میں وسعت اور تنوع ہے۔ تعلیم نے اس سے پہلے کبھی اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ نئی تعلیم زندگی کی آئینہ دار ہے، اس لئے ہماری اسکیم کا نصاب جان بوجھ کر پھیلا ہوا اور بڑا رکھا گیا ہے۔ پہلا نصاب بہت گھرا ہوا تھا اور اس سے زندگی کی مختلف راہوں کی کھڑکیاں بچے کے سامنے پوری طرح نہیں کھلتی تھیں۔ لیکن اس بڑے نصاب کو دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہو جانا چاہئے۔ اس لئے ربط کا اصول اس بظاہر بہت پیچھے ہوئے اور قابو میں نہ آنے والے نصاب کو ہمارے لئے بہت آسان بنا دیتا ہے۔ ہم اگر ربط صرف بنیادی دستکاری ہی سے پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ بچے کی ضرورتوں، اس کی خواہشوں اور اس کے

اُس پاس کی چیزوں سے بھی ربط میں مددیں تو ہمیں یہ بظاہر بے قابو سی چیز بہت آسان معلوم ہونے لگے۔

اسی رات کو آٹھ بجے پروفیسر سٹین نے بنیادی تعلیم کے بعض اہم پہلوؤں پر ایک بصیرت افروز تقریر کی اور فرمایا کہ ہمارا زمانہ جنگ اور خون ریزی کا زمانہ ہے، ہر طرف جنگ اور تباہیوں، بربادیوں کی حکومت ہے اور یہی زمانہ ہے جب تعلیم کی ذمہ داریاں، عام دنوں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ تعلیم کا کام ہے تہذیب اور تمدن کو زندہ رکھنا اور اسے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانا۔ امن کے زمانہ میں یہ کام آسانی سے ہوتا رہتا ہے۔ جنگ کے بادل امن کی راہوں کو تنگ و تاریک بنا دیتے ہیں اور اس زمانہ میں صرف تعلیم کی روشنی اس تنگی میں وسعت اور تاریکی میں نور پیدا کرتی ہے، اس زمانہ میں انسانیت کی قسمت کا فیصلہ گویا تعلیم ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

پہلے زمانہ میں بچوں کو تعلیم اس طرح دی جاتی تھی کہ وہ زندگی کے کاموں میں شریک رہ کر ایسے بن سکیں کہ آئندہ زندگی میں سماج کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب سب کچھ کتابوں ہی سے پڑھایا جانے لگا۔ کھیتی، باڑی، دستکاری، سائنس ہر چیز گویا صرف کتابیں ہی پڑھ کر سیکھی جاسکتی ہے۔ کتابوں کے راج میں تعلیم اور زندگی ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ جوں جوں یہ راج پھیلا زندگی اور تعلیم کی دوری بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ تعلیم میں زندگی کی ملکی سی جھلک بھی باقی نہ رہی اور اب ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ تعلیم کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ زندگی اور بچے کی تعلیم کے بیچ میں کتاب کو ایک روک بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ بچے کچھ کر کے، کاموں میں شریک ہو کے ہی کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کی اپنی کوشش اور اپنا تجربہ ہی سچی تعلیم ہے۔

یہی اصول بنیادی تعلیم کی بنیاد ہے۔ صرف یہی نہیں۔ تعلیم کو عام، مفت اور لازمی ہونا چاہیے۔ تعلیم کم سے کم سات سال تک دی جائے، مادری زبان میں دی جائے اور کئی متکداری

کے ذریعہ سے دی جائے تاکہ جو کچھ سیکھا جائے وہ کر کے، دیکھو کے اور زندگی میں حصہ لے کے سیکھا جائے۔ بچے کی شخصیت کی صحیح نشوونما اسی طرح ہو سکتی ہے۔ یورپ میں بھی تعلیم کسی ہاتھ کے کام کے ذریعہ دی جاتی ہے، لیکن ہمارے اور ان کے طریقے میں ذرا فرق ہے۔ ہم اپنے ہاتھ کے کام سے کچھ آمدنی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ آخر میں سیدین صاحب نے فرمایا کہ لوگوں کا یہ خوف یہ تعلیم مدرسوں کو کا رہا ہے بنا دے گی، قطعی بے بنیاد ہے۔ ہمارے تین سال کے تجربے نے ہمیں بتایا کہ نئی تعلیم نے بچوں کو ہر حیثیت سے پہلے سے کتنا اچھا بنا دیا ہے۔ ہمیں تو ہر فطرے کے خیال سے نڈر ہو کر میل جول، یقین اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے۔ ۴ مارچ کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ صبح کے اجلاس میں پھر مرید پڑھائی پر تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ شام کے اجلاس میں استادوں کی ٹریننگ کے متعلق کئی مضمون پڑھے گئے اور ان پر دسچسپ بحث ہوئی۔ چونکہ اسی کام باقی تھا اس لئے رات کے وقت بھی ایک اجلاس ہوا۔ پہلے ڈاکٹر عبدالرحمن خاں صاحب نے بنیادی تعلیم میں آرٹ کی اہمیت پر ایک سید دسچسپ اور مفید تقریر کی اور اس سلسلے میں بتایا کہ جب تک ہم تعلیم میں آرٹ کا نقطہ نظر نہیں پیدا کریں گے اس وقت تک بنیادی تعلیم کے صحیح نصب العین کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔ اس کے بعد کانفرنس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کانفرنس کے سامنے وہ نتیجے پڑھ کر سنائے جو مختلف اجلاسوں میں بحث مباحثوں کے بعد مرتب کئے گئے تھے۔

کانفرنس کے نمائندے دورے اور پاس سے، نئی امیدیں اور نئی آرزوئیں لے کر کچھ سیکھنے، کچھ سکھانے کے لئے ایک مجمع ہوئے تھے۔ چار دن کی لگاتار محنت کے بعد، کچھ سیکھا، کچھ سکھایا، اور پھر نئی امیدیں لے کر اپنے کام کو ایک قدم اور آگے بڑھانے چلے گئے۔ آزاد و فضا میں رہ کر کامیابیوں اور ناکامیوں کے جو سبق سیکھے جاتے ہیں، ان میں امیدوں کا سہارا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ "تین سال کے تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے اور زیادہ تجربہ ہمارے کام کے لئے اور بڑا سہارا بنے گا۔" یہ ہمیں یاد رکھنا ہے۔







